تعمیرِ ملّت

خواجہ عبدالحکیم انصاریؒ

نقشبندی، مجدّدی، توحیدی

سلسلۂ عالیہ توحیدیہ

تعمیرِ ملّت

مُصنّفہ

خواجہ عبدالحکیم انصاریؒ

بانی

سلسلۂ عالیہ توحیدیہ

مرکز تعمیرِ ملّت، جی ٹی روڈ، گوجرانوالہ

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

کتاب	......	تعمیرِ ملّت
مصنف	......	خواجہ عبدالحکیم انصاریؒ
اشاعت اوّل		1957ء
اشاعت دوم		1963ء
اشاعت سوم		1971ء
اشاعت چہارم		1974ء
اشاعت پنجم		1979ء
اشاعت ششم		1985ء
اشاعت ہفتم		1993ء
اشاعت ہشتم		2000ء
اشاعت نہم		2007ء
اشاعت دہم		2014ء
اشاعت یازدہم		2021ء
تعداد	......	ایک ہزار
ناشر	......	محمد یعقوب توحیدی، شیخ سلسلہ عالیہ توحیدیہ وحید کالونی، نزد کوٹ شاہاں، گوجرانوالہ
قیمت	......	500روپے
مطبع	......	ماریہ پرنٹرز، اسلام آباد

0300-8500331, 0301-8644440
Email: sales@maryahprinters.com

www.tauheediyah.com
0344-9000042, 0303-0466321

O

جستجو قوم کو ہے ایسے مسلمانوں کی
جن کو ملتا ہو سکوں گود میں طوفانوں کی

(مصنّف)

فہرست مضامین

عنوان	صفحہ نمبر

عنوان	صفحہ نمبر

عنوان	صفحہ نمبر

عنوان	صفحہ نمبر

عنوان	صفحہ نمبر

عنوان	صفحہ نمبر

عنوان	صفحہ نمبر

عنوان | **صفحہ نمبر**

عرضِ ناشر

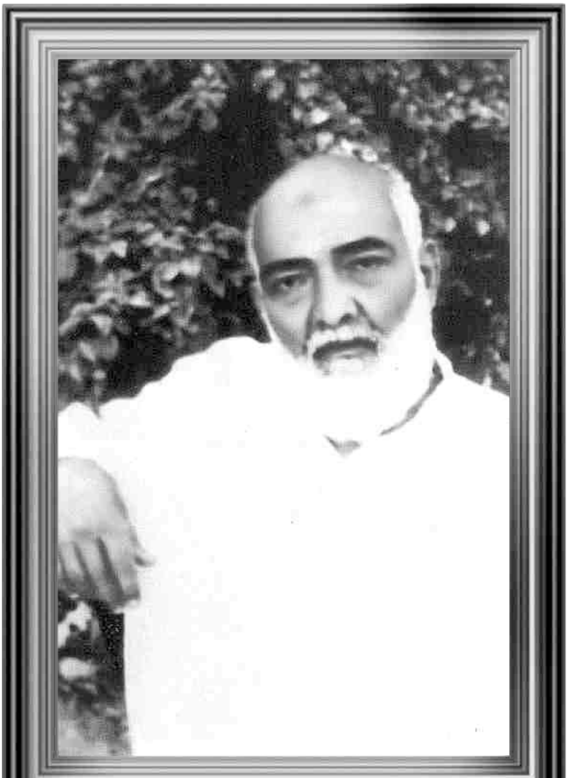
''تعمیرِ ملّت'' کی زیرِ نظر گیارہویں اشاعت اس اعتبار سے نمایاں اہمیت کی حامل ہے کہ اس کی طباعت بانیٔ سلسلہؒ کے دستِ اقدس سے تصحیح شدہ ایک نادر و نایاب نسخہ (اشاعت دوم، 1963ء) کے مطابق کی گئی ہے۔ کتابت کی اغلاط کی دُرستی، الفاظ پر اعراب اور فہرست کی ترتیب کے بعد بجا طور پر کہا جاسکتا ہے کہ موجودہ اشاعت مِنّ وعَن مصنّف کے مُرتّب کردہ اصل نسخے کے مطابق ہے۔ اس اشاعت کی ایک اور خوبی، اس میں فرہنگ کا اضافہ ہے جو یقیناً موجودہ دور کے قارئین کی سہولت کا باعث ہوگا۔ اس ضمن میں راولپنڈی سے بھائی طارق محمود کی شبانہ روز محنت قابلِ تحسین ہے۔ محمد شریف چیمہ صاحب اور اُن کے صاحبزادگان موجودہ اشاعت میں تعاون کے لیے خصوصی طور پر شکریہ کے مستحق ہیں۔ اللہ رحیم و کریم سے استدعا ہے کہ وہ ہماری اس عاجزانہ کاوِش کو قبول فرمائے اور سلسلۂ توحیدیہ کو تعمیرِ ملّت کے مقدّس مِشن میں کامیابی و کامرانی عطاء فرمائے۔ آمین

محمد یعقوب توحیدی

شیخِ سلسلۂ عالیہ توحیدیہ

مرکز تعمیرِ ملّت، وحید کالونی، گوجرانوالہ

مارچ ۲۰۲۱ء



خواجہ عبدالحکیم انصاریؒ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

دیباچہ

ایک درد مند، صاحبِ دل اور اہلِ حُسن و محبت انسان تقریباً نصف صدی سے اِس فکر و عمل میں مشغول ہے کہ ملّتِ اسلامیہ کی تعمیرِ نو کا سلسلہ محکم بُنیادوں پر اُستوار کیا جا سکے۔ اِن کا عقیدہ ہے کہ یہ دُشوار کام توحید اور محبت ہی کے ذریعے پایۂ تکمیل کو پہنچ سکتا ہے۔ اِن کا نامِ گرامی عبدالحکیم انصاریؒ ہے اور تحریک سلسلۂ توحیدیہ کے بانی ہیں۔ اِن کا مقصودِ نظر اپنے ''اِلٰہ'' کی دید ہے جو محض حُسن و رحمت ہے۔ محبت میں جب اِحسان شامل ہو جاتا ہے تو اِسے رحمت سے تعبیر کرتے ہیں۔ اِسی طرح اِن کی زندگی کا مقصد اپنے ''اِلٰہ'' (معبود و محبوب اور مطلوب و مقصود) اور ربّ العالمین (یعنی جو تمام جہانوں کی مخلوقات کی نشو و نما کرنے والا آقا) کے بندوں کے دِلوں کا تزکیہ کرنا ہے، تاکہ وہ رنگِ الٰہی سے مزیّن ہو کر اہلِ حُسن و محبت بن جائیں۔ اِن کے نزدیک محبت ہی سے دِلوں میں عدل و انصاف اور ایثار و قربانی کے سوتے پھوٹتے اور مزرعِ حیاتِ اِنسانی کو سرسبز و شاداب کرتے ہیں۔

خواجہ صاحب کو اِسی لیے میں ''اہلِ حُسن و محبت'' کہتا ہوں اور اِن کے مسلک اور مشن دونوں کو قابلِ قدر اور قابلِ تقلید سمجھتا ہوں۔ اِس قحط الرّجال کے زمانے میں اہلِ علم اور صاحبِ دل انسان کہاں ملتے ہیں؟ کہاں ہیں وہ لوگ جو محض ''رضائے دوست'' کی خاطر اِس کے بندوں کو اِس کے رنگ میں رنگنے کے لیے اپنی زندگی وقف کر دیں؟ ایک مدت سے میری آرزو تھی کہ میں ''انسان'' کو دیکھوں، ایسے ''انسان کو جس کا دل حسن، محبت اور سرور سے معمور و منوّر ہو۔'' بقول علامہ اقبالؒ:

عمر ہا در کعبہ و بت خانہ می نالد حیات
تا زِ بزمِ عشق یک دانائے راز آید بروں

مجھے بھی ایسے ہی ''انسان'' کی طلب و جستجو تھی جس کی تلاش دانائے رازمولائے رومؒ کو تھی اور جس کی آرزوئے دید کا اظہار انہوں نے اِس طرح کیا ہے:۔

دی شیخ با چراغ ہمی گشت گردِ شہر
کہ زِ دیو و دد ملولم و انسانم آرزو ست
گفتند یافت می نشود جستہ ایم ما
گفت آنکہ یافت می نشود آنم آرزوست

آخر وہ دن بھی آیا کہ میں نے وہ ''انسان'' خواجہ انصاری صاحبؒ کی صورت میں دیکھ لیا۔ ایسے ''صاحبِ سرور'' انسان کی تصنیف ''تعمیرِ ملت'' پر کچھ لکھنا میرے نزدیک بہت بڑی سعادت ہے اور میری یہ خوش قسمتی ہے کہ خواجہ صاحبؒ نے مجھے اِس سعادت کے لیے منتخب فرمایا ہے۔

''تعمیرِ ملت'' خواجہ صاحبؒ نے عام مسلمانوں کے لیے لکھی ہے۔ انہوں نے اِس لیے زبان سہل اور اسلوبِ بیان صاف و سادہ اختیار کیا ہے۔ چونکہ اِن کی باتیں دل سے نکلتی ہیں اور:

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے

لہٰذا اِن کی باتیں بہت دلنشیں ہیں۔ دل میں حق کی طلب وجستجو ہو تو بادۂ گفتار دو آتشہ بن جاتا ہے۔ خواجہ صاحب بصیرت افروز نکتے بیان کرتے ہیں اور اِس بے تکلفی کے ساتھ کہ اہلِ ذوق ونظر کو لُطف سِوا ملتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ ''تعمیرِ ملت'' اِن لوگوں کے لیے قابلِ اعتماد رہنما ہے جنہیں اِس الحاد پرست دَور میں حق و صداقت کی تلاش ہے۔

خواجہ صاحب کی یہ بات بڑی ہی خیال آفریں ہے کہ صوفی اور فلسفی دونوں کو حق کی تلاش ہوتی ہے، اِس اعتبار سے تصوّف وفلسفہ ایک ہی مسلک کے دو نام ہیں لیکن فلسفی عقل کے ذریعے حقیقت کا ادراک کرنا چاہتا ہے اور صوفی وجدان کے ذریعے۔ اِس لحاظ سے فلسفہ اور تصوُّف دو جداگانہ مسلک ہیں، دونوں کی منزل و مقصود اگرچہ ایک ہی ہے مگر راہیں

مختلف ہیں۔

خواجہ صاحب کے اِس موقف کی تائید اور قارئین کی دلچسپی کے لیے مشہور فلسفی ابنِ سینا اور مشہور صوفی ابوسعیدؒ کی ملاقات کا ایک واقعہ نقل کیا جاتا ہے:۔

بوعلی سینا فلسفی تھے اور ابوسعیدؒ اہلِ حال صوفی............ایک مرتبہ دونوں کی ملاقات ہوئی، جس کا ذکر ''اسرارِ توحید'' میں یوں آیا ہے:۔

بوعلی سینا اور ابوسعیدؒ دونوں کو ایک مرتبہ مل بیٹھنے کا اتفاق ہوا، تین دن کی مجلسی صحبت کے بعد بوعلی سینا وہاں سے رخصت ہوئے۔ بوعلی سینا کے شاگردوں نے اِن سے پوچھا ''آپ نے شیخ سعیدؒ کو کیسا پایا؟'' آپ نے کہا ''جو کچھ میں جانتا ہوں وہ ابوسعیدؒ دیکھتا ہے''۔ ابوسعیدؒ کے مریدوں نے جب اِن سے دریافت کیا کہ ''آپ نے بوعلی سینا کو کیسا پایا؟'' تو آپ نے جواب میں کہا ''جو کچھ میں دیکھتا ہوں وہ جانتا ہے''۔ (مرزا مقبول بیگ بدخشانی: ادب نامہ ایران، لاہور)

صوفی کی راہ اِن لوگوں کی راہ ہے جو اِس پر چل کر منزلِ مقصود پر پہنچ گئے، اِس لیے قرآن مجید کی زبان میں یہ ''صراطِ مستقیم'' ہے۔ یعنی اِن لوگوں کی حسین راہ جن پر اللہ تعالیٰ نے اپنا انعام واکرام کیا اور انہیں حقیقی کامیابی نصیب ہوئی۔

اِس عہد میں طریقت کو عموماً ذکر واذکار کا ایک ایسا نظری مسلک سمجھا جاتا ہے، جس میں عمل کو چنداں اہمیت نہیں دی جاتی۔ عمل سے مُراد اجتماعی زندگی میں بھرپور حصّہ لینا ہے۔ خواجہ صاحب کے نزدیک طریقت وشریعت میں کوئی فرق نہیں، بلکہ یہ ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہیں۔ نام کا فرق محض اِس حقیقت پر دلالت کرتا ہے کہ سالک شریعت پر قائم رہ کر ''دیدِ دوست'' کی طلب وجستجو میں اپنی توجہ تزکیہ نفس پر مرکوز کر دیتا ہے تاکہ اس کا قلب حسین ومنور بن جائے اور وہ اس حسن ونور کے ذریعے اپنے ''دوست'' کے حسن کا مشاہدہ کر سکے۔ خواجہ صاحب طریقت کو ''دیدِ دوست'' تزکیۂ نفس اور تعمیرِ ملّت کا ذریعہ سمجھتے

ہیں۔ وہ طریقت کو اصحابِ صفّہ کا مسلک خیال کرتے ہیں جو بیک وقت طالبانِ علم وحکمت، دائم الصائم، قائم اللیل اور مجاہد بھی تھے۔ وہ دُنیا میں رہتے ہوئے بھی اس کی محبت میں مبتلا نہ تھے بلکہ انہیں محبت تھی تو اپنے ''اِلہٰ'' سے، اپنے ہادی و مرشد پیغمبر اعظم و آخرؐ سے، اپنے مسلمان بھائیوں سے، اور تمام بندگانِ خدا سے۔ یادِ الٰہی اور تلاوت قرآن مجید ان کا وظیفۂ حیات تھا۔ ملّت کو جب اغیار کی طرف سے خطرہ درپیش ہوتا تو وہ شہادت کی آرزو میں میدانِ وفا میں کفن بر دوش جاتے تھے۔

خواجہ صاحب کے فلسفۂ طریقت کا ماحصل یہ ہے کہ انسان کا قلب حسین ومنوّر ہو جائے تو اس سے محبت کے چشمے پھوٹ پڑتے ہیں، اور یہ محبت ہی ہے جو انسان کو اللہ تعالیٰ کا دوست اور انسانیت کا محسن بناتی ہے۔ نیز محبت ہی ملتِ بیضا کے احیاء کا بہترین ذریعہ ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اہلِ حسن ومحبت ہی اس دُنیا میں حسین انقلاب لاتے رہے اور تعمیرِ ملت وانسانیت کرتے رہے ہیں۔ چنانچہ زیرِ نظر کتاب کے لکھنے کا مقصود بھی یہ ہے کہ مسلمانوں کو بالخصوص اہلِ حُسن ومحبت بنایا جائے اور اسی لیے خواجہ صاحب نے اہلِ حُسن ومحبت بننے کے جو طریقے بتائے ہیں، وہ سہل، سادہ، نیز شریعت اور فطرتِ انسانی سے ہم آہنگ ہیں۔

موضوعات کثیر ہیں، لیکن ان میں توحید کی روح کار فرما ہے، جس کی وجہ سے کثرت میں وحدت آشکارا ہے۔ میرے نزدیک یہ کتاب اپنے گوناگوں محاسن کی بناء پر طالبانِ حق و صداقت کے لیے اور ان لوگوں کے لیے جو اہلِ حُسن ومحبت بن کر اپنی خودی اور ملّت کی تعمیر کرنا چاہتے ہیں، قابلِ اعتماد ہادی و مرشد ہے۔

ڈاکٹر نصیر احمد ناصر (ایم اے ڈی لٹ)
سیکرٹری، اُردو انسائیکلوپیڈیا آف اسلام
پنجاب یونیورسٹی لاہور
26 شعبان 1394ھ، 14 دسمبر 1974ء

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ

ایک اہم سوال

دنیائے اسلام کے لیے وقت کا سب سے اہم سوال یہ ہے کہ جب ہمارا دین مکمّل، ہمارا نبیؐ برحق اور ہمارا قرآن اللہ کی سچی کتاب ہے تو پھر ملّتِ اسلامیہ کے زوال کی وجہ کیا ہے؟ یہ سوال جس قدر اہم اور ہماری توجہ کا مستحق ہے، افسوس کہ ہماری مُردہ دلی اور بے حسی کی وجہ سے اس کے ایک ہزارویں حصے پر بھی غور و خوض نہیں کیا گیا۔ زندہ قوموں کا حال یہ ہے کہ اگر کوئی منصوبہ پورا نہ ہو، کوئی مہم ناکام رہے یا میدانِ جنگ میں کوئی معمولی سی فوج بھی شکست کھا جائے تو اس کے اسباب کی دریافت کے لیے بڑی بڑی تحقیقاتی کمیٹیاں بٹھائی جاتی ہیں، کمیشن مقرّر ہوتے ہیں اور لاکھوں روپے صرف کر دیئے جاتے ہیں تاکہ آئندہ کے لیے ایسی ناکامیوں کا پوری طرح انسداد ہو جائے۔ ہماری حالت یہ ہے کہ اس سوال پر جو ہمارے لیے موت اور زندگی کا سوال ہے، بین المِلّی طور پر تو کیا انفرادی طور پر بھی کماحقّہٗ غور و فکر نہیں کیا جاتا۔ ناچ گانوں کی محفلوں پر لاکھوں روپے برباد کیے جاتے ہیں، محافلِ میلاد، مجالسِ عزا اور مواعظ کے جلسوں میں موتی اور پھول برسائے جاتے ہیں، لوگوں کو رُلایا اور ہنسایا جاتا ہے، علمی اجتماعات میں مناظرے اور مباحثے کیے جاتے ہیں، مقالات پڑھے جاتے ہیں، مشاعروں میں داد و ستائش کے

نعروں سے آسمان سر پر اٹھا لیا جاتا ہے، مگر آج تک کسی محفل، کسی مجلس، کسی مشاعرے، کسی وعظ میں آپ نے اس موضوع پر بھی کچھ سنا ہے کہ ہمارے زوال و پستی کے اسباب کیا ہیں اور کن تدابیر سے ہم اپنا کھویا ہوا مقام پھر حاصل کر سکتے ہیں؟ انفرادی طور پر البتہ جب کبھی اور جس کسی سے یہ سوال کیا جاتا ہے تو مشرق سے مغرب اور شمال سے جنوب تک ہر مُلک کا مسلمان اس کا یہی ایک جواب دیتا ہے کہ ہم نے قرآن کی تعلیم پر عمل کرنا چھوڑ دیا ہے۔ یہ جواب اپنی جگہ سو فیصدی صحیح لیکن اس قدر مُجمَل ہے کہ سننے والے کو کوئی خاص فائدہ اس سے نہیں پہنچ سکتا۔ خصوصاً جبکہ ہر شخص اپنی جگہ پر یہ سمجھتا ہو کہ جہاں تک تعلیمِ قرآن پر عمل کرنے کا تعلق ہے، صرف وہ اور اس کا فرقہ ہی پکا مسلمان ہے اور باقی تمام مسلمان گمراہی میں مبتلا ہیں۔

قرآن صرف عبادات اور ان کے متعلق احکامات ہی پر تو مشتمل نہیں، یہ تو ایک مکمّل دستور العمل ہے حیاتِ انسانی کا۔ یعنی حیاتِ انسانی کے جتنے بھی شعبے ہیں، اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ان سبھی کے متعلق ہدایات دے کر وہ راستہ متعیّن کر دیا ہے جس پر چل کر انسان دُنیا میں امن و آسائش اور اطمینان و مسرّت کی زندگی بسر کر سکتا ہے۔ اب چونکہ انسانی زندگی کے بہت سے پہلو ہیں، اِس لیے صرف یہ کہہ دینا کہ "ہمارے زوال کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے قرآن کی تعلیم پر عمل کرنا چھوڑ دیا ہے" ہرگز کافی نہیں ہے بلکہ ہمیں یہ دیکھنا چاہیۓ کہ ہر شعبۂ زندگی میں ہم کس طرح اور کس حد تک قرآن کی ہدایات پر عمل کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ بات دو چار فقروں میں تو کیا ایک ضخیم کتاب میں بھی پوری تفصیل و تشریح سے بیان نہیں ہو سکتی، لیکن بالکل کچھ نہ ہونے سے کچھ نہ کچھ ہونا بہرحال بہتر ہوتا ہے۔ اِس لیے صفحات ذیل میں ہم نے اس سوال کا جواب دینے کی ایک معمولی سی

کوشش کی ہے۔ ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ دُنیائے اِسلام میں جو حضرات حقیقی معنوں میں عالم و فاضل ہیں وہ اس سوال کا جواب دیتے اور ہر شعبۂ زندگی پر مفصّل اور مبسُوط کتابیں لکھ کر زوالِ ملّت کے تمام اسباب بیان فرماتے۔ لیکن بدقسمتی سے ایسا نہیں ہوا یا کم از کم ہمارے علم کے مطابق اس کی کوئی معقول کوشش اب تک نہیں کی گئی۔ اِس لیے باوجود اپنی علمی کم مائیگی کے محض فرض کفایہ سمجھ کر ہم نے خود اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ ہم اپنی کوشش میں کہاں تک کامیاب ہوئے ہیں اور ملّت کو اس کتاب سے کچھ فائدہ پہنچے گا یا نہیں؟ لیکن اتنی امید ضرور ہے کہ ہماری اس ناچیز کوشش کو دیکھ کر اربابِ علم و دانش اس طرف متوجہ ہوں گے اور حقیقتاً اچھی اچھی کتابیں لکھ کر اس کام کو مکمّل کر دیں گے جو ایک زمانہ سے تشنۂ تکمیل پڑا ہوا ہے۔

کسی خطّۂ زمین کے باشندے انفرادی طور پر کتنے ہی خوشحال کیوں نہ ہوں جب تک وہ ایک جماعت کی شکل میں منظّم اور مربوط نہ ہو جائیں اور ذاتی فوائد کو اجتماعی منافع پر قربان کرنا نہ سیکھ لیں، تمدّنی ترقی نہیں کر سکتے اور دوسری منظّم اور طاقتور اقوام کی دستبرد اور ظلم و ستم سے محفوظ نہیں رہ سکتے۔ اِس لیے ہم نے اس کتاب میں سب سے پہلے اجتماعیت کے وہ قرآنی اُصول بیان کیے ہیں جن پر عمل کر کے رسولِ خدا کے صحابیوں کی مبارک جماعت نے قلیل ترین عرصہ میں وہ شاندار ترقی کی جس کی مثال تاریخِ عالم میں کہیں نہیں ملتی۔ پھر یہ بتایا ہے کہ ان قرآنی اُصولوں سے انحراف اور رُوگردانی کس طرح ہمارے موجودہ تنزل کا باعث ہوئی۔ اس کے بعد اسلامی عقائد، عبادات اور معاملات یعنی حقوق اور اخلاق و آداب کا بیان کیا گیا ہے۔

اسلامی عقائد چونکہ سبھی غیب سے تعلق رکھتے ہیں اور اللہ کا حکم ہے کہ غیب پر بغیر دیکھے

ایمان لے آؤ لیکن باوجود ازیں کچھ آدمی ایسے بھی ہوتے ہیں جو ان غیبی امور کو عقل سے سمجھ کر یا آنکھوں سے دیکھ کر ان کی حقیقت معلوم کرنا چاہتے ہیں اور یہ کام علمِ تصوّف کا ہے، اِس لیے کچھ ضروری بیان تصوّف کا بھی کیا گیا ہے۔ اس بیان میں یہ بتایا گیا ہے کہ موجودہ تصوّف اور حقیقی اسلامی تصوّف میں کیا فرق ہے۔ قرآن سے تصوّف کی کیا سند ہے، رسولِ اکرمؐ اس کے متعلق کیا سکھاتے تھے۔ پہلے زمانے کے اولیائے عظام اور صوفیائے کرام نے کفار کو مسلمان بنانے اور مسلمانوں میں ایمانِ کامِل اور اخلاقِ محمدیؐ پیدا کرنے کے لیے کیا کچھ کیا اور بعد کی صدیوں میں تصوّف کے جھوٹے دعویداروں اور جاہل صوفیوں نے اس مبارک علم کی کیسی مٹی پلید کی اور ملّتِ اسلامیہ کو کس قدر شدید نقصان پہنچایا۔ تصوّف کے ضمن میں مبدا اور معاد کا بھی ذکر آ گیا ہے۔ یعنی یہ بتایا گیا ہے کہ انسان کی روح انسان کے پیدا ہونے سے پہلے کہاں تھی، اس میں کیا کیا صفات تھیں، وہ اپنی اصلی جگہ سے کس شکل میں چلی اور کن کن مقامات سے گزرتی ہوئی اور کیا کیا صفات حاصل کرتی ہوئی جسدِ انسانی تک پہنچتی ہے۔ وہ نیک اور بد اعمال سے کس طرح متاثّر ہو کر کثیف یا لطیف بنتی ہے۔ مرنے کے بعد کس طرح سفرِ آخرت طے کرے گی اور کن کن عوالم سے گزرتی ہوئی دوزخ یا جنت میں اپنے مستقر تک پہنچے گی۔ اس سلسلے میں جبر و قدر کے مسئلہ پر بھی کچھ روشنی ڈالی گئی ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں نے تقدیر کو ماننے کے باوجود بھی کیوں اس قدر شاندار ترقی کی اور قرونِ اُخریٰ کے مسلمان تقدیر کو ماننے کی وجہ سے کیوں ذلیل و خوار ہو گئے۔

عبادات کے بیان میں طہارت، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور جہاد کا ذکر ہے اور یہ دکھایا گیا ہے کہ یہ اسلامی عبادات افراد کے اعمال و کردار پر کیا نفسیاتی اور روحانی اثر ڈالتی ہیں

جن کی وجہ سے وہ ایک ایسی طاقتور جماعت بن جاتے ہیں کہ دُنیا کا کوئی اور نظامِ اجتماعی ان کا پاسنگ بھی ثابت نہیں ہوسکتا اور کس طرح ایک انسان ان عبادات کو پوری طرح اختیار کر لینے سے ابدی مسرّت و اطمینان کے اُن خزانوں پر قابض ہو جاتا ہے جہاں فلسفہ، سائنس یا کسی اور علم کا ہاتھ بھی نہیں پہنچ سکتا۔

معاملات کے بیان میں اجتماعی اور روز مرّہ زندگی کے تمام حقوق العباد اور اخلاق و آداب کا ذکر ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ ان پر قرآنی تعلیم و ہدایت کے مطابق عمل کرنے سے کس طرح انفرادی اور اجتماعی زندگی کی تکمیل ہوتی ہے اور کس طرح ایسے افراد اور اُن کی قوم دُنیا اور آخرت دونوں میں فائز المرام ہو سکتے ہیں۔ سب سے آخر میں ساری کتاب کا ایک مختصر سا خلاصہ دیا گیا ہے تا کہ جو لوگ ایک مرتبہ تمام کتاب کو پڑھ لینے کے بعد عام استفادہ کی نظر سے کتاب کی روح کو معلوم کرنا چاہیں تو بار بار اس خلاصہ کو پڑھ کر اپنا مقصد حاصل کر سکیں۔

اس قسم کی تصانیف خصوصاً تصوّف وغیرہ کی جتنی کتابیں اب تک لکھی گئی ہیں، ان کا طرزِ بیان، موضوع کی دشواری اور اصطلاحات کی گرانباری کی وجہ سے اس قدر مشکل ہوتا ہے کہ پڑھنے والے پریشان ہو جاتے ہیں اور پورا فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ اِس لیے ہم نے اس کتاب میں نہایت آسان اور سلیس زبان لکھی ہے، حتیٰ کہ تصوّف جیسے خشک مضمون کو بھی ایسے آسان اور دلکش انداز میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے کہ قارئین کا دل نہ اکتائے اور مطلب آسانی سے ذہن نشین ہو جائے۔

یہ کتاب تمام عالمِ اسلام کے لیے ہے لیکن اُردو میں ہونے کی وجہ سے ہمارے مخاطب علی الخصوص پاکستان کے مسلمان ہیں۔ پاکستان ایک نوزائیدہ مُلک ہے اور اس دعوے

کے ساتھ بنایا گیا ہے کہ یہاں صرف قرآن اور سنّت کے مطابق حکومت کی جائے گی۔ دُنیا میں اب تک بیسیوں طرزِ حکومت آزمائے جا چکے ہیں لیکن کوئی طرزِ حکومت بھی انسان کو من حیث الکل مطمئن نہیں کر سکا۔ مسلمانوں کا دعویٰ ہے کہ انسان کو سو فیصدی مطمئن کرنے اور خوش حال و فارغ البال رکھنے والا طرزِ حکومت صرف وہی ہے جس کے اُصول قرآن میں بتائے گئے ہیں۔ اس پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ مسلمانوں نے چودہ سو برس تک جن مختلف ممالک پر حکومت کی ان کے عوام ہی کب خوش رہے، علاوہ ازیں تمہارے اسلامی ممالک خود آپس ہی میں ہمیشہ لڑتے اور خونریزیاں کرتے رہے، اِس لیے تمہارا دعویٰ باطل ہے۔ اس کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ درحقیقت قرآنی اُصولوں کے مطابق حکومت تو صرف رسول پاکؐ کے زمانے سے حضرت عمرؓ یا زیادہ سے زیادہ خلافتِ راشدہ تک ہی رہی ہے اور اس زمانہ میں نہ صرف ممالکِ اسلامی بلکہ اُن ملکوں کے عوام بھی ہر طرح خوش رہے جہاں مسلمانوں کی حکومت تھی، لیکن خلافتِ راشدہ کے بعد جتنی بھی اسلامی حکومتیں قائم ہوئیں وہ قرآنی اُصولوں کے مطابق نہ تھیں، اِس لیے ان حکومتوں میں عوام کو وہ امن و سکون میسر نہ ہوا جس کی تلاش میں اہلِ دُنیا ہمیشہ سے سرگرداں و پریشان ہیں۔ لہٰذا اب ہم پاکستانی محض کتاب و سنت کے مطابق ایک نظامِ حکومت قائم کر کے دُنیا پر ثابت کر دیں گے کہ صرف وہی طرزِ حکومت جو قرآن نے بتایا اور رسولِ خدا نے قائم کر کے دکھایا، دُنیا کی فلاح و بہبود کے لیے مکتفی ہو سکتا ہے۔ یہ بظاہر چھوٹا منہ اور بڑی بات ہے، لیکن دعویٰ اپنی جگہ پر قائم ہے اور وہ مُلک جو اس دعوے کے تحت بنایا گیا ہے، موجود ہے اس لئے ''اے پاکستانی مسلمانو! اچھی طرح ذہن نشین کر لو کہ یہ بات تمام دُنیا کے لیے ایک نیا تجربہ ہے اور تمام اسلامی و غیر اسلامی ممالک کی آنکھیں تمہاری طرف لگی ہوئی ہیں اور وہ سب تمہارے اس دعوے کی

صداقت کو دیکھنا چاہتے ہیں۔ اگر تم سچے ثابت ہوئے تو معلوم ہے کیا ہوگا؟ امکان نہیں بلکہ یقینِ کامل ہے دُنیا کے تمام ممالک کی بھاری اکثریت صداقتِ قرآن کی قائل اور تعلیمِ قرآن پر عامل ہو جائے گی۔ لیکن اگر تم ناکامیاب رہے تو ساری دُنیا میں تمہارا، تمہارا نہیں خدا اور رسول ﷺ کا مذاق اُڑے گا اور اُس کی سزا میں تم اِس دُنیا میں بھی ذلیل و رُسوا ہو گے اور آخرت میں سخت عذاب کی طرف لوٹا دیئے جاؤ گے‘‘۔

قیامِ پاکستان کو کافی عرصہ ہو گیا ہے، اب تک ہم نے کیا کیا ہے، اس پر پورا تبصرہ تو ممکن نہیں اتنا یقینی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ پاکستان بننے کے بعد یہاں کے باشندوں میں نماز کا چرچا بہت زیادہ ہو گیا ہے، مساجد بھی عام طور پر ہر جگہ نمازیوں سے بھری ہوئی نظر آتی ہیں اور سب سے زیادہ خوشی کی بات یہ ہے کہ اکثر اُمراء اور حُکّام بھی موٹروں میں بیٹھ کر آتے اور اپنے غریب بھائیوں کے ساتھ ایک ہی صف میں کھڑے ہو کر اللہ تعالیٰ کے آگے جھک جاتے ہیں۔ روزوں کی پابندی اور رمضان کی رونق بھی پہلے سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ زکوٰۃ دینے والوں اور حج کرنے والوں کی تعداد بھی بڑھتی جا رہی ہے اور حصولِ دولت کے لیے عمل کی قوّت میں بھی بے اندازہ ترقی ہوئی ہے اور بے عملی، سُستی اور کاہلی کی تباہ کن عادتیں رفتہ رفتہ کم ہو رہی ہیں، لیکن جہاں تک اخلاق کا تعلق ہے نہایت افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اس میں ہمارے پاکستانی بھائیوں نے بالکل ترقی نہیں کی بلکہ الٹا تنزّل ہوا ہے، حالانکہ یہی وہ کسوٹی ہے جس پر غیر مسلم قرآن کریم کی تعلیم اور رسولِ خدا کے اسوۂ حسنہ کو جانچتے، پرکھتے اور اسلام کے متعلق رائے قائم کرتے ہیں۔ یہ لوگ تمہاری نماز اور روزوں کو ہرگز نہیں دیکھتے، وہ تو صرف یہ دیکھتے ہیں کہ کاروبار اور معاشرتی معاملات میں تم ان کے ساتھ کس طرح پیش آتے ہو۔ یہ لوگ تمہارے اخلاق کے متعلق بہت بُری رائے رکھتے ہیں اور سبب

قرآنی تعلیم کو ٹھہراتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ پاکستانی عوام آدابِ مجلس میں بالکل کورے ہیں، بول چال میں ان کی زبان نا ملائم، لہجہ سخت اور حرکات وسکنات درشت ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ پاکستانی مسلمانوں کو راستہ تک چلنے کی تمیز نہیں ہے، راستے میں ہر وقت تھوکتے ہیں، پھلوں کے چھلکے پھینکتے ہیں، چلتے میں ایک دوسرے کو دھکے دیتے ہیں، حتیٰ کہ بچوں اور خواتین کا بھی لحاظ نہیں کرتے۔ بسوں اور ٹرینوں میں سوار ہوتے وقت ان کو قطار تک بنانی نہیں آتی۔ چلتے چلتے لڑ پڑنا، گالیاں بکنا اور ایک دوسرے سے دست بگریبان ہو جانا ان کی عام عادتیں ہیں جو پاکستان کے ہر شہر میں عام راستوں پر ہر وقت نظر آسکتی ہیں۔ ان لوگوں کو ہم پاکستانیوں کی بددیانتی کا بھی بہت شکوہ ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ پاکستانی نوکر بے انتہا بے ایمان ہوتے ہیں، ہم ان سے سودا منگائیں تو ایک روپیہ کے دو روپیہ وصول کرتے ہیں اور اگر ہم بازار سے خود جا کر لیں تو پاکستانی دکاندار ایک چیز کی قیمت دس روپے مانگتے ہیں اور آخر میں حجّت اور بک بک جھک جھک کے بعد وہی چیز دَو روپے میں دے دیتے ہیں۔ اگر یہاں کے سوداگروں سے کوئی بڑا سودا کیا جائے تو بے ایمانی اور بھی بڑی کرتے ہیں۔ اِن کو اپنی زبان اور اپنے وعدوں کا بالکل لحاظ نہیں ہوتا۔ نمونہ کچھ دکھاتے ہیں دیتے کچھ اور ہیں۔ حتّٰی کہ جو سامان غیر ممالک کو بڑی مقدار میں بھیجا جاتا ہے اس میں بھی یہی بے ایمانی کی جاتی ہے جس کی وجہ سے باہر کی منڈیوں میں ان کی ساکھ کم ہو رہی ہے، جو غیر ملکی حضرات قرآن کا مطالعہ کرنے کے بعد اسلام کی سادگی، صداقت اور آسانیوں کو دیکھ کر مسلمان ہو جاتے ہیں وہ جب اسلامی ممالک میں اپنے دینی بھائیوں کو دیکھنے آتے ہیں تو سخت مایوس ہوتے ہیں۔ ہم نے ایسے کئی حضرات کو بگوشِ خود کہتے سنا ہے کہ ''ہم تو قرآن کی تعلیم کو دیکھ کر ایمان لے آئے مگر جب یہاں آکر دیکھا تو معلوم ہوا کہ یہ مسلمان تو شرافت اور اخلاقِ حسنہ کے نام سے بھی واقف

نہیں اور ہم اب یہ غور کررہے ہیں کہ ہم نے اسلام قبول کر کے غلطی تو نہیں کی‘‘۔

ان تمام باتوں کو دیکھتے ہوئے ہم اپنے تمام مسلمان بھائیوں سے عموماً اور پاکستان کے مسلمانوں سے خصوصاً یہ مخلصانہ استدعا کرتے ہیں کہ عبادات کی پابندی کے ساتھ ساتھ آپ اپنے اخلاق کو زیادہ سے زیادہ سنوارنے اور سدھارنے کی کوشش کریں تاکہ اقوامِ عالم اسلام کے متعلق غلط رائے قائم نہ کرسکیں اور آپ کو اس کے لیے اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب نہ دینا پڑے۔

اب ہم آئندہ صفحات میں اس سوال کا جواب پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو شروع میں لکھا جاچکا ہے، یعنی جب ہمارا دین مکمّل، ہمارا نبیؐ برحق اور ہمارا قرآن اللہ کی سچی کتاب ہے تو پھر ملّتِ اِسلامیہ کے زوال کی وجہ کیا ہے؟

قرنِ اوّل میں مُسلمانوں کی ترّقی

مسلمانوں کے زوال کی وجوہات معلوم کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ قرنِ اوّل میں ان کی ترّقی کے اسباب دریافت کیے جائیں اور دیکھا جائے کہ وہ کون سے اُصول تھے جن پر عمل کر کے اس زمانہ کے مسلمانوں نے ترّقی کی تھی اور یہ کہ اس زمانہ میں بھی ہم اُن اُصولوں پر عمل کر سکتے ہیں یا نہیں۔ چنانچہ جب ہم اس نظر سے تاریخِ اسلامی کے پہلے باب پر غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ سرورِ دو عالمؐ کی پیدائش سے پہلے مُلک عرب دُنیا کا سب سے کمزور، جاہل اور پسماندہ مُلک تھا، لیکن حضورؐ کی بعثت کے بعد سو برس کے اندر اندر عربوں نے دُنیا کے بہترین آدھے حصّے پر قبضہ کیا اور باقی آدھے پر اپنی سیادت قائم کر لی جس طرح آج امریکہ اور یورپ کے چند ممالک نے قائم کر رکھی ہے۔ عربوں نے ان ملکوں پر قبضہ ہی نہیں کیا بلکہ اس نئی تہذیب کو بھی وہاں پھیلایا جو قرآن کی تعلیم سے وجود میں آئی تھی۔

تاریخِ عالم کا یہ واقعہ ایسا عجیب ہے جس کی مثال موجود نہیں۔ یورپ کے اکثر مورّخین اور محققین نے اس ترّقی کے اسباب کی تحقیق و تلاش میں عمریں صرف کر دیں لیکن یہ لوگ چونکہ فخرِ کائنات کی روحانیت اور صداقت کے قائل نہیں تھے اِس لیے انہوں نے قرآنی تعلیم کے صرف نفسیاتی پہلو پر نظر کی اور وہ اُصول معلوم کر لیے جو اس بظاہر سیدھی سادی تعلیم میں اس طرح چھپے ہوئے ہیں جیسے درختوں کے رگ و ریشہ میں پانی۔ اور حق تو یہ ہے کہ یورپ

کی ترقّی کے بُنیادی اُصول وہی ہیں جن پر عمل پیرا ہو کر قرنِ اَوّل کے مسلمانوں نے ترقّی کی تھی۔ برخلاف ازیں جب خود مسلمان اپنے قرنِ اَوّل کی تاریخ کو اس نظر سے دیکھتے ہیں کہ اُس محیّر العقول ترقی کے اسباب معلوم کریں تو ان کی آنکھیں حضورؐ کی روحانی تابناکیوں یعنی معجزات و خوارقِ عادات سے خیرہ ہو کر رہ جاتی ہیں اور وہ یہ نہیں دیکھ سکتے کہ نفسیاتی لحاظ سے اس تعلیم میں وہ کون سی طاقتیں پوشیدہ ہیں جو مُردوں کو زندہ اور زندوں کو زندۂ جاوید بنا دیتی ہیں۔ ہمارے خیال میں یورپ میں مادّی فروغ اور روحانیت کے فقدان کی بڑی وجہ یہی ہے کہ اس نے تعلیمِ اسلام کا مطالعہ روحانی نقطۂ نظر سے نہیں بلکہ مادّی عینک لگا کر کیا ہے۔ اسی طرح موجودہ مسلمانوں کے زوال کا سبب بھی یہ ہے کہ وہ قرآن کا مطالعہ روحانی کرشمہ سازیوں کی روشنی میں کرتے ہیں، مادّی افادیت کے خیال سے نہیں کرتے۔

ہر قوم کو ذہنی قابلیت کے لحاظ سے کم از کم تین حصوں میں بانٹا جا سکتا ہے طبقۂ اعلیٰ، طبقۂ اوسط اور طبقۂ ادنیٰ۔ جب اللہ تعالیٰ کسی قوم کو ترقّی دینا چاہتا ہے تو اس میں ایک ایسا آدمی پیدا کر دیتا ہے کہ طبقۂ اول کی غالب اکثریت دل و جان سے اس کی پیرو بن جاتی ہے۔ اب یہ لوگ اسی کی ہاں پر ہاں اور نہیں پر نہیں کہتے ہیں، اسی کے اٹھائے اٹھتے اور بٹھائے بیٹھتے ہیں، اسی کے اشاروں پر جیتے اور اُسی کے حکم پر مر جاتے ہیں۔ اس طرح ایک ایسی منظّم جماعت وجود میں آتی ہے جو اپنے اعلیٰ اخلاق اور بلند کردار کی وجہ سے ساری قوم میں ہر دلعزیز اور معزز بن جاتی ہے۔ طبقۂ اوسط کی اکثریت اُس جماعت کی ہر طرح تقلید اور مدد کرتی ہے اور طبقۂ ادنیٰ کی تعدادِ کثیر بھی انہی کے نقشِ قدم پر چلنے لگتی ہے اس طرح پوری قوم میں ایک انقلاب آ جاتا ہے۔

قومِ عرب کے طبقۂ اعلیٰ کی قیادت اللہ تعالیٰ نے سرکارِ دو عالم محمد رسول اللہؐ کے سپُرد کی

تھی۔ آپ ایک طرف تو ذاتی شرافت، اخلاق اور دانائی کی وجہ سے افضل البشر تھے، دوسری طرف اللہ تعالیٰ نے آپ کو وحی کے ذریعہ وہ تعلیم دی تھی جو نہ صرف قومِ عرب بلکہ تمام جہان کے باشندوں کی فلاح و بہبود اور آئندہ امن و ترقّی کے لیے ضروری تھی۔ حضورؐ چونکہ آخری نبی اور قرآن چونکہ آخری آسمانی کتاب ہے اِس لیے اس میں دُنیا اور عُقبیٰ دونوں کے متعلق وہ تمام طریقے بیان کر دیئے گئے ہیں جو قیامت تک نوعِ انسان کی دنیاوی ترقّی اور نجاتِ اُخروی کے لیے ضروری ہیں۔ یہ سچ ہے کہ قرآن میں صرف اُصول بیان کیے گئے ہیں، تفصیلات نہیں دی گئیں، لیکن قرآن کا سب سے بڑا معجزہ ہی یہ ہے کہ انسانی دماغ پستی یا بلندی کی کسی حد تک پہنچ جائے، کیسی ہی ایجادات ہو جائیں انسان اُڑ کر دوسرے ستاروں میں جا پہنچے، امن و امان سے زندگی گزارنے، دنیاوی ترقّی کرنے اور مرنے کے بعد دوسرے جہان میں آرام و آسائش حاصل کرنے کے جو اُصول قرآن میں بتائے گئے ہیں وہ ہمیشہ صحیح رہنمائی کرتے رہیں گے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ دنیاوی ترقّی کے لیے قرآن میں وہ کون سے اُصول بتائے گئے ہیں جن پر عمل پیرا ہو کر اُس جماعت نے ترقّی کی جس کو رسولِ خداؐ نے خود مرتب اور منظّم کیا تھا۔ اُس جماعت میں حضورؐ کے صرف وہ صحابی شامل تھے جو آپ کا زیادہ سے زیادہ قُرب حاصل ہونے کی وجہ سے آپ کی صحبت اور تعلیم سے اوروں کی نسبت زیادہ فیض یاب ہوئے تھے۔ اِن صحابۂ کبار کی تعداد چند سو نفوس سے زیادہ نہ تھی، لیکن یہی وہ طبقۂ اعلیٰ تھا جو تمام عرب کا دل و دماغ تھا۔ طبقۂ اوسط میں وہ لوگ شامل تھے جو خدا پر کامل تو نہیں مگر اچھا ایمان رکھتے تھے اور قرآنی احکام کی طبقۂ اعلیٰ سے کچھ کم مگر طبقۂ ادنیٰ سے بہت زیادہ پابندی کرتے تھے۔ طبقۂ ادنیٰ میں تین قسم کے آدمی تھے، ایک وہ جو اگرچہ صدق دل سے مسلمان ہوئے تھے لیکن

ایمان وعمل میں کمزور تھے، دوسرے وہ جو سطوت وشوکتِ اسلامی کو دیکھ کر مجبوراً یا لالچ سے مسلمان ہوئے لیکن آخر میں سچے دل سے ایمان لے آئے، تیسرے وہ جو محض منافق اور در پردہ اسلام کے دشمن تھے مگر حضرت عمرؓ کے زمانہ خلافت تک ان کی کچھ پیش نہ گئی اور وہ جماعت وجود میں آ گئی جو اجتماعیات کے تمام اُصولوں پر ہر لحاظ اور ہر زاویہ سے پوری اترتی تھی۔ وہ اُصول کیا تھے؟ یوں تو اُس جماعت کے افراد قرآن کے تمام احکام پر ہی سختی سے عمل کرتے تھے مگر ہم یہاں صرف اُن اُصولوں کا ذکر کریں گے جو اللہ تعالیٰ نے جماعت بندی کے ذریعہ سے قومی ترقّی کے لیے قرآن میں مقرّر فرمائے ہیں، یہ اُصول پانچ ہیں:۔

۱۔ ایمان۔ یعنی یقینِ محکم

۲۔ اتّحاد۔ یعنی باہمی محبت اور اخوت

۳۔ رابطہ۔ یعنی تنظیم

۴۔ اطاعت۔ یعنی ضابطہ کی پابندی (ڈسپلن)

۵۔ عمل۔ یعنی کام کرنے کی بے پناہ قوّت اور اس کا استعمال

یہ پانچ باتیں ایسی ہیں کہ جب تک منتشر افراد کے کسی گروہ میں اکٹھی نہ ہو جائیں وہ جماعت کی شکل میں منظّم نہیں ہو سکتا۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ جس قدر کسی جماعت کے افراد اِن اُصولوں پر سختی سے عمل کرتے ہیں اتنی ہی وہ جماعت مضبوط اور طاقتور ہوتی ہے۔ اب ہم اِن اُصولوں کا بیان الگ الگ اور کسی قدر تفصیل سے کرتے ہیں:۔

ایمان:

ہر جماعت کی بُنیاد چند ایسے عقلی، ذہنی، وجدانی یا روحانی نظریات ومعتقدات پر قائم ہوتی ہے جن پر اُس جماعت کے ہر فرد کو بدرجۂ مسلمات یقین و وثوق ہوتا ہے۔ یہ یقین و

وثوق جس قدر پختہ اور کامل ہو اسی قدر یہ جماعت زیادہ مضبوط اور طاقتور ہو گی، یعنی باقی چار اصولوں پر زیادہ سختی اور پابندی سے عمل کرے گی۔ صحابۂ کبارؓ کی جس جماعت کا ہم نے ذکر کیا ہے اس کا بُنیادی عقیدہ یہ تھا کہ اس کائنات کا خالق و مالک صرف اللہ تعالیٰ ہے، محمدؐ اس کے بندے اور رسول ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے انسان کی ہدایت و رہنمائی کے لیے پیدا کیا ہے۔ یہ ہدایات وحی کے ذریعے نازل ہوتی ہیں جن کے مجموعے کا نام قرآن ہے۔ اس عقیدے کے بظاہر تین حصّے ہیں اللہ، رسولؐ اور قرآن، لیکن اصل اس کی صرف اللہ ہے کیونکہ اسی نے محمدؐ کو پیدا کیا اور اسی نے قرآن نازل فرمایا۔ اِس لیے اس عقیدے کی اساس اللہ اور صرف اللہ ہے جو ذات و صفات میں ہر لحاظ سے یکتا اور اپنی مخلوق پر ہر طرح قادر ہے۔ اسی وجہ سے اس عقیدے کو عقیدۂ توحید کہتے ہیں۔

توحید:

تاریخ شاہد ہے کہ جس قوم نے عقیدۂ توحید اختیار کیا وہ اتنی جلدی ترقّی کر گئی کہ دیکھنے والے حیران رہ گئے۔ مثال کے طور پر پروٹسٹنٹ فرقے کو لیجیے، عیسائی قوموں کی ترقّی اسی فرقہ کے وجود میں آنے کے بعد شروع ہوئی۔ اسی طرح آریہ سماجی فرقے کو دیکھئے جو پچھلی ہی صدی میں پیدا ہوا۔ یہ فرقہ ایک خدا کو ماننے کا مدعی ہے۔ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ اس فرقے کی توحید، اسلامی توحید کے مقابلے میں اتنی بھی حیثیت نہیں رکھتی جتنی سونے کے مقابلہ میں پیتل، کیونکہ یہ لوگ خدا کو قادر و قیوم مانتے ہوئے خدا کے ساتھ روح اور مادّے کو بھی ازلی اور ابدی مانتے ہیں۔ باوجود ازیں اس نقلی توحید کے عقیدے نے بھی ہزاروں سال کے سوئے ہوئے ہندوؤں کو بیدار کرنے اور ان میں اتّحاد و عمل کی روح پھونکنے میں جو مدد دی ہے وہ ان اربابِ نظر و فکر سے پوشیدہ نہیں جنھوں نے ہندوؤں کی موجودہ بیداری کے اسباب پر غور کیا ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر اس عقیدے میں وہ کونسی

طاقت پوشیدہ ہے جس کی وجہ سے یہ جماعتی اور قومی ترقّی میں اس قدر سریع الاثر اور قوی العمل ثابت ہوتا ہے، تو اس کی کئی وجوہات ہیں۔ اوّل تو یہ کہ جو چیز ہمیشہ نظر کے سامنے رہے اُس کی عظمت و وقعت دل سے جاتی رہتی ہے۔ اللہ چونکہ نظر نہیں آتا اِس لیے اس کی عظمت کبھی کم نہیں ہوتی، دوسرے یہ کہ جو چیز سامنے رہتی ہے انسان اس کی صفات و عادات اور ماہیت سے رفتہ رفتہ واقف ہو جاتا ہے۔ اللہ چونکہ نظر نہیں آتا انسان اس کی ذات و صفات کی حقیقت سے کما حقّہٗ کبھی بھی واقف نہیں ہوسکتا، اِس لیے ہمیشہ خوف و رِجاء کی حالت میں رہتا ہے جس کی وجہ سے نہ تو بے پرواہ ہونے پاتا ہے نہ نا امید۔ تیسرے یہ کہ اللہ کو ماننے والا جانتا ہے کہ کفار و مشرکین کے معبودانِ باطل بھی اللہ ہی کے پیدا کیے ہوئے ہیں اِس لیے وہ نہ تو ان معبودوں سے ڈرتا ہے نہ ان کے ماننے والوں سے اور بدیں وجہ ان کے مقابلہ میں ہمیشہ زبردست رہتا ہے۔ چوتھے یہ کہ مومن چونکہ سوائے اللہ کے نہ تو کسی کے آگے سر جھکاتا ہے نہ کسی سے مدد کی امید رکھتا ہے، اِس لیے اس کی ذہنیت کبھی غلامانہ نہیں ہو سکتی۔ پانچویں یہ کہ اللہ کو ماننے والوں کی قوّتِ عمل کبھی کم یا مفقود نہیں ہوسکتی کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ اللہ خود آ کر کسی کا کام نہیں کرتا بلکہ صرف عمل کرنے والوں کی نصرت و مدد فرماتا ہے، اِس لیے وہ اس کی نصرت کی امید پر مصروفِ عمل رہتے ہیں اور اپنی کامیابی پر ہمیشہ یقین رکھتے ہیں۔ برخلاف ازیں جو لوگ ''اربابٌ من دون اللہ'' مثلاً پیروں، فقیروں وغیرہ کو مانتے ہیں وہ چونکہ ان کو اپنی آنکھوں کے سامنے موجود دیکھتے ہیں، اِس لیے خود عمل نہیں کرتے بلکہ یہ سمجھ کر بے فکر ہو جاتے ہیں کہ پیر صاحب کے تعویذ گنڈے یا دعا سے خود ہی سب کام ہو جائیں گے، ہم کو مشقت میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے۔ اس طرح ان کی قوّتِ عمل بالکل جاتی رہتی ہے۔ چھٹا سبب روحانی ہے اور وہ یہ ہے کہ اللہ پر ایمان رکھنے والوں کے قلب میں ایک ایسی حرارت اور برقی طاقت پیدا ہو جاتی ہے جس کے جوش میں وہ بڑی سے بڑی مشقت اور مصیبت کو بھی ہنستے کھیلتے برداشت کر لیتے ہیں اور کبھی تھکتے نہیں۔ ساتویں یہ کہ ان مومنوں کو چونکہ یقین ہوتا ہے کہ اگر ہم اللہ کے حکموں پر عمل کرتے رہے تو اس دُنیا

میں بھی کامیاب ہوں گے اور اُس جہان میں بھی ہم کو اچھی سے اچھی جنتیں اور لازوال نعمتیں میسّر آئیں گی، اِس لیے وہ اُس کے راستے میں کسی ایثار و قربانی سے منہ نہیں موڑتے۔ وہ اپنے مال و دولت کی آخری کوڑی صرف کرتے وقت بھی یہ نہیں سوچتے کہ کل کھانے کو کہاں سے آئے گا۔ مال و دولت کا تو ذکر ہی کیا جان بھی دینی پڑے تو اس خوشی سے دیتے ہیں گویا پردیس سے اپنے وطن کو جا رہے ہیں۔ برخلاف ازیں جن لوگوں کے نظریات وعقائد کی بُنیاد ایسی ہستیاں ہوں جن کے عیوب ونقائص عقلاً ثابت ہو سکتے ہوں یا جن کی شکست و ریخت آنکھوں سے نظر آ سکتی ہو، اُن پر جب اپنے معبودوں کے نقائص ظاہر یا ثابت ہو جائیں یا جب وہ بچشمِ خود اُن کو فنا ہوتے دیکھ لیں تو ان کا عقیدہ کسی طرح قائم نہیں رہ سکتا۔ چنانچہ جب کبھی ایسا کوئی واقعہ پیش آئے تو ان لوگوں کا یقین ختم اور اجتماعی قوّت فنا ہو جاتی ہے۔ توحید پرست مسلمانوں کو جب بھی بُت پرست اور مشرک اقوام سے واسطہ پڑا یہی نتیجہ نکلا۔ ہندوستان میں مسلمان حملہ آوروں کی مٹھی بھر فوجوں نے ہندوؤں کے لاتعداد لشکروں کو کیوں شکستیں دیں۔ محض اس وجہ سے کہ دہلی، متھرا، کانگڑہ اور سومنات وغیرہ میں اپنے معبودوں کو تباہ ہوتے دیکھ کر اُن کا بُنیادی عقیدہ فنا اور ان کی اجتماعی قوّت ختم ہو چکی تھی۔ جب تک مسلمانوں میں توحید پرستی باقی رہی وہ کہیں اور کبھی مغلوب نہ ہوئے لیکن جیسے جیسے یہ ایمان کم ہوا وہ بھی کمزور ہوتے گئے اور جب توحید پرستی کی جگہ ان میں اشخاص پرستی، پیر پرستی، قبر پرستی، تعزیہ پرستی، زر پرستی، حُکام پرستی اور دیگر پرستیاں پیدا ہو گئیں تو اللہ تعالیٰ نے بھی ان کی طرف سے منہ موڑ لیا اور پستی وذلّت کے اس غار میں چھوڑ دیا جہاں پڑے ہوئے وہ آج اغیار کا منہ تک رہے ہیں۔ بہر حال یہ تو تھی محض ایک نفسیاتی توجیہہ۔ حقیقت یہ ہے کہ جن کو اللہ تعالیٰ پر واقعی یقینِ کامل ہوتا ہے وہ یقیناً اس کی محبت اور شفقت کو دل سے محسوس کرتے اور اس کی امداد و نصرت کو آنکھوں سے نازل ہوتا ہوا دیکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کیسی ہی مصیبتیں پڑیں اُن کے پائے استقلال کو لغزش نہیں ہوتی۔ وہ جانتے کہ اللہ تعالیٰ یہ مصائب اُن کو تکلیف دینے کے لیے نہیں بلکہ اُن کے کردار کو پختہ اور کامل بنا کر اپنی نعمتوں کا

اِتمام کرنے کے لیے نازل فرماتا ہے۔اس ایمان کی وجہ سے ان کے دلوں میں اطمینان ومسرت کے وہ سمندر ٹھاٹھیں مارتے ہیں جن کے سامنے دُنیا کے تمام مصائب وآلام پرِ کاہ جتنی بھی وقعت نہیں رکھتے۔پچھلے اقران و ادوار کا تو کہنا ہی کیا اس گئے گزرے زمانہ میں بھی جب کبھی کفروشرک کا مقابلہ کسی توحید پرست سے ہوا ہے تو دُنیا اُس کے محیر العقول کارنامے دیکھ کر انگشت بدنداں رہ گئی ہے۔ہم آپ کو ایک توحید پرست مومن کا سچا واقعہ سُناتے ہیں جس سے معلوم ہوگا کہ توحید پر ایمان کسے کہتے ہیں اوراس کی طاقت کیا ہوتی ہے، یہ واقعہ ایک سکھ کی زبانی ہے اور اُسی کے الفاظ میں بیان کیا جاتا ہے، وہ کہتا ہے:

''ستمبر ۱۹۴۷ء میں جب ہم نے اور ہندوؤں نے مسلمانانِ دہلی کے قتل عام کا فیصلہ کیا تو ہم نے یہ دستور بنالیا کہ دس دس، بیس بیس مسلح آدمیوں کی ٹولیوں میں مضافات دہلی میں نکل جاتے اور جو مسلمان نظر آتا اُسے تہ تیغ کر دیتے۔بیس پچیس دن تک یونہی ہوتا رہا لیکن بعد میں جیسے جیسے دن گزرتے گئے شکار ملنا کم ہوتا گیا اور اکثر جتھے خالی واپس آنے لگے۔ایک دن رات کے وقت ہم لوگ واپس آرہے تھے کہ شہر میں کمپنی باغ کے نزدیک ایک مسلمان ملا۔بہت دُبلا پتلا اور کمزور سا انسان تھا۔لمبا قد، کالا رنگ، منہ پر چگّی ڈاڑھی، ایک میلا سا تہمد باندھے اور کھدر کی میلی سی قمیض پہنے ہوئے تھا۔ہم نے اسے ٹھہرا لیا اور کہا چل ہمارے ساتھ۔بولا، کہاں؟ ہم نے کہا تجھے قتل کریں گے۔پوچھا میرا کیا قصور ہے؟ جواب میں کوئی بولا تو مسلمان ہے یا نہیں؟ جواب دیا الحمدللہ۔ہم نے کہا بس اسی لیے تجھ کو قتل کریں گے۔کہنے لگا، اچھا یہ بات ہے! چلو اس سے اچھی موت اور کیا ہوگی۔چنانچہ ہم اُسے کمپنی باغ میں لے گئے۔وہاں پہنچ کر کسی نے کہا، میاں صاحب جان بچانا چاہو تو بچ بھی سکتی ہے۔پوچھا، کس طرح؟ میں نے جواب دیا کہ سکھ ہو جاؤ تو تمھیں چھوڑ دیں گے۔معلوم ہوتا ہے وہ سمجھا نہیں۔کہنے لگا، کیا مطلب؟ میں بولا، مطلب یہی کہ اپنا دین چھوڑ کر ہمارا مذہب قبول کرلو۔

یہ سنتے ہی اُس آدمی میں ایک عجیب تبدیلی پیدا ہوئی، چہرہ سُرخ انگارہ ہوگیا اور پہلی مرتبہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا، آنکھوں سے شرارے اور منہ سے جھاگ نکل رہی تھی۔ گرج کر بولا، میں...... تمہارا مذہب؟.... کافر کے بچّو! میں مسلمان ہوں مسلمان! ''میں'' تم سے کہتا ہوں کہ ''تم'' مسلمان ہو جاؤ ورنہ مار مار کر ڈھیر کر دوں گا۔ یہ سُن کر ہم سب اس کا مذاق اڑانے لگے اور ایک سردار جی کرپان لے کر قتل کے ارادے سے آگے بڑھے۔ ابھی وہ دو قدم بھی نہ جانے پائے تھے کہ ایک بجلی سی کوندی۔ وہ مسلمان اُچھلا اور ایک ہی جَست میں خالصہ جی کے ہاتھ سے کرپان چھین کر کوئی دس گز فاصلے پر جا کھڑا ہوا اور کہنے لگا، لو اب آؤ، دیکھوں کون مجھے سکھ بناتا ہے، بڑھو نا۔ منہ کیا دیکھ رہے ہو، بزدل کہیں کے۔ یہ سنتے ہی ہم سب نے مل کر اس پر حملہ کر دیا۔ لیکن ہم ابھی دُور ہی تھے کہ وہ اللہ اکبر کہہ کر پھر اُچھلا، ہماری آنکھیں جھپک گئیں، دیکھا تو دو سکھ زمین پر تڑپ رہے تھے۔ ابھی ہم سنبھلنے بھی نہ پائے تھے کہ اللہ اکبر کہہ کر اس نے پھر حملہ کیا اور ایک سکھ کو ختم کر گیا۔ اب ہم کو بھی غصہ آیا، ست سری اکال کا نعرہ مار کر ہم نے بھی حملہ کر دیا اور کوشش کی کہ چاروں طرف سے گھیر کر اسے ختم کر دیں مگر وہ تو بجلی تھا قریب ہی نہ آنے دیتا تھا، اللہ اکبر کہہ کر حملہ کرتا اور ہر وار میں ایک دو آدمی زمین پر گر جاتے۔ نعروں کی آواز سُن کر بہت سے سکھ قریب کے مکانوں سے نکل آئے اور حملوں میں ہمارے ساتھ شریک ہو گئے مگر وہ قابو میں نہ آیا۔ کوئی آدھ گھنٹہ لڑائی رہی اور ہمارے کئی آدمی مارے گئے۔ آخر بہت سے سِکھ لمبے لمبے نیزے لے کر آئے اور چاروں طرف سے گھیر کر اس کو کچوکنے لگے۔ اس ترکیب سے وہ بہت زخمی اور نڈھال ہو گیا لیکن برابر لڑتا رہا۔ آخر میں ایک نیزہ اس کی کمر توڑ کر سینے کے پار ہو گیا اور وہ بے دم ہو کر زمین پر گر گیا، ایک سردار جی نے گالی دے کر کہا، دیکھا مزہ! جواب دیا، کافر کے بچے ہاں دیکھا اِسی

مزے کے لیے تو جان دی ہے۔ اگر تجھے معلوم ہوتا کہ اِس وقت مجھے کیا مزہ آرہا ہے تو، تُو بھی مسلمان ہو کر ابھی اِن سکھوں سے لڑتا اور شہید ہو جاتا۔ اِس کے بعد وہ کچھ نہ بولا اور کلمہ پڑھتا رہا اور چند منٹ بعد ٹھنڈا ہو گیا۔ ہم نے گنتی کی تو ہمارے اٹھارہ آدمی مرے اور گیارہ سخت زخمی ہوئے تھے۔ میں نے کہا یہ ایک ہی ''مسلمان'' ملا تھا اگر ایسے دو چار ہزار اکٹھے ہوں تو خدا جانے کیا کریں۔''

دیکھا آپ نے ایک توحید پرست مومن کیا کچھ کر سکتا ہے جو ایسے ہوں چند اک ہزار پھر کیا ہو؟ حقیقت میں مومن ایسا ہی ہوتا ہے۔ اگرچہ عام حالات میں وہ شہد سے زیادہ میٹھا اور ریشم سے زیادہ نرم ہوتا ہے مگر ضرورت پڑنے پر زہر سے زیادہ کڑوا اور فولاد سے زیادہ سخت ثابت ہوتا ہے۔ وہ موت پر ہنستا ہے اور شہادت کی آرزو میں مرتا ہے۔ موقع ہو تو نہتا ہی لڑتا ہے، نہ تلوار کی حاجت رکھتا ہے نہ بندوق کی۔

کافر ہے تو شمشیر پہ کرتا ہے بھروسا
مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

یہ تھا اللہ پر ایمانِ محکم کا ایک ادنیٰ سا کرشمہ۔ اب کمزور ایمان کا ایک واقعہ بھی سن لیجئے۔

انہی دنوں یعنی ستمبر ۱۹۴۷ء میں جب مسلمانانِ دہلی کا خون پانی کی طرح بہایا جا رہا تھا، ان کے مکانات جل رہے تھے، مال و اسباب لٹ رہا تھا، عورتوں کی عصمت دری ہو رہی تھی، ایک دن گاندھی جی ایک مسلمان محلّے میں تشریف لائے اور ایک مشہور کانگریسی مسلمان کے مکان پر کئی گھنٹے ٹھہرے تاکہ مسلمانوں کی شکایات سُن کر ازالے کی کوشش کریں۔ یہ سننا تھا کہ سینکڑوں مسلمان جمع ہو گئے اور اپنی مصیبتیں بیان کرنے لگے۔ گاندھی جی سنتے جاتے تھے اور تسلی دے کر وعدے کرتے جاتے تھے کہ دہلی کے ایک بہت مشہور کانگریسی مولوی تشریف

لائے۔ گاندھی جی ان کی بہت عزت کرتے تھے، دیکھ کر کھڑے ہوگئے اور پاس بٹھا کر پوچھا، مولانا آپ کیسے آئے؟ یہ سنتے ہی مولوی صاحب پر ایسی رقّت طاری ہوئی کہ آنکھوں سے جھڑی لگ گئی، ہچکیاں لے کر فرمانے لگے ''مہاتما جی! میں تو...... صرف اتنا...... چاہتا ...... ہوں کہ آپ ...... میری اور میرے ...... بچوں کی ...... جان ...... بچالیں'' یہ کہتے جاتے تھے اور فرطِ گریہ سے بے حال ہوئے جارہے تھے گاندھی جی نے یہ دیکھ کر نہایت پیار کے لہجہ میں کہا ''مولانا' مولانا' اس طرح تو میں اپنے بھگوان سے کہتا ہوں'' یہ سُن کر مولانا کی اور بھی ہچکی بندھ گئی اور پھر وہی فرمایا جو پہلے کہا تھا، گاندھی جی نے بھی وہی جواب دیا جو پہلے دیا تھا۔ کئی دفعہ ایسا ہی ہوا لیکن مولانا آپے میں نہ آسکے۔ آخر گاندھی جی نے دوسری طرف منہ پھیر لیا اور صاحبِ خانہ سے کہا ''ان کو سمجھائیے''

به بیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا

ایک وہ غالباً جاہل مسلمان جس کا واقعہ پہلے بیان ہوا، ایک یہ مسلمانوں کے پیشوا اور رسولِ خدا کی وراثت کے دعوے دار۔ فَاعْتَبِرُوْا یٰۤاُولِی الْاَبْصَارِ

الغرض یہ ہے وہ یقینِ محکم اور ایمانِ کامل جو قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کی ترقّی کا باعث ہوا اور آج بھی اگر اکثریت میں نہیں صرف دس پندرہ فیصدی مسلمانوں میں پیدا ہو جائے تو پھر اسی ترقّی کا باعث ہوگا۔ یہ ایمان کس طرح پیدا ہوسکتا ہے؟ اس کا بیان آگے مناسب موقعہ پر کیا جائے گا، اب اجتماعی قوّت کے دوسرے اُصول یعنی اتّحاد کا بیان سنئے:۔

اتّحاد:

جماعتی قوّت کے لیے اتّحاد بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا ایمان۔ تاریخِ عالم گواہ ہے کہ کوئی جماعت یا قوم اس وقت تک تباہ نہ ہوسکی جب تک اس میں اتّحاد باقی رہا اور کوئی

جماعت یا قوم تباہی سے بچ نہ سکی جب اس میں نا اتفاقی اور پھوٹ پیدا ہوگئی۔ قوموں کی بقا اور فنا کا یہ قانون اٹل ہے۔ اس میں نہ کبھی تبدیلی ہوئی ہے اور نہ آئندہ ہو سکے گی۔

اتّحاد کیا ہے؟ جماعت یا قوم کے افراد میں اس قدر محبت و اخوت اور قلبی تعلق کا موجود ہونا کہ اگر ایک فرد کو دُنیا میں کسی جگہ کوئی تکلیف پہنچے تو جماعت کے باقی تمام افراد خواہ کہیں بھی ہوں اپنی اپنی جگہ پر محسوس کریں کہ یہ تکلیف خود انہی کو پہنچی ہے۔ رسول اکرمؐ نے فرمایا ہے کہ ''تمام مسلمان ایک جسد کی مانند ہیں کہ اگر اس کی آنکھ یا سر میں تکلیف ہو تو تمام جسم بے چین ہو جاتا ہے''۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ ''اگر ایک عضو کو تکلیف ہو تو تمام بدن میں بیداری اور حرارت پیدا ہو جاتی ہے'' اس حدیث میں بیداری اور حرارت کے حکیمانہ الفاظ خاص طور پر قابلِ غور ہیں۔ ان کا مطلب یہ ہے کہ تمام بدن اس تکلیف کی مدافعت کے لیے تیار ہو کر عمل کرنے لگتا ہے۔ مسلمانوں میں اس درجے کا اتّحاد صدیاں گزریں ختم ہو چکا ہے۔ اسپین کی سلطنت تباہ ہوتی رہی، سلطنتِ عباسیہ بیٹھی دیکھتی رہی۔ سلطنتِ عباسیہ پر زوال آیا لیکن کسی کا قدم مدد کے لیے نہ اٹھا۔ ہندوستان میں سلطنتِ مغلیہ دم توڑتی رہی، ایران اور ترکی نے مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ وہ شیر بیشۂ وفا یعنی سلطان ٹیپو انگریزوں اور خود اپنے غدّار بھائیوں کے ہاتھ سے چرکے پر چرکے کھاتا اور مدد کے لیے چلاتا رہا کسی مسلمان طاقت نے مرہم کی ایک ڈبیہ اس کو نہ بھیجی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آخر میں جب ترکی انگریزوں کے ہاتھوں قتل ہو رہا تھا تو عالمِ اسلام میں کوئی طاقت بھی ایسی نہ تھی جو مدد کرتی۔ حقیقت یہ ہے کہ جس جماعت کے افراد میں دوسرے بھائیوں کی تکلیف کا احساس نہ ہو وہ ہرگز جماعت کہلانے کی مستحق نہیں، وہ تو بھیڑ بکریوں کا ایک گلّہ ہے کہ قصائی جس کو چاہے ذبح کر دے، دوسری کھڑی منہ تکتی رہتی ہیں۔ قرونِ اولیٰ میں یہ بات نہ تھی۔ اس وقت ایک مسلمان کو

تکلیف پہنچتی تو ساری دنیائے اسلام بے کل ہو کر انتقام اور مدافعت پر آمادہ ہو جاتی تھی۔ خلیفہ عبدالملک نے سندھ پر حملہ محض اِس لیے کیا تھا کہ وہاں کچھ مسلمانوں پر ظلم ہوا تھا جن میں ایک مسلمان لڑکی بھی تھی۔ اِس لڑکی نے خلیفہ کی دہائی دی۔ ایک مسلمان جو وہاں قید تھا، سن رہا تھا۔ اتفاق سے وہ کسی طرح بچ کر بھاگ نکلا اور دمشق پہنچ کر یہ خبر دی۔ خلیفہ نے سنا تو لڑکی کی داد رسی کے لیے فوراً فوج کشی کر دی اور سندھ مسلمانوں کے قبضہ میں آ گیا۔ ایک دفعہ ایران میں کسی نے ایک انگریز سپاہی کو مار ڈالا تو برطانیہ کی ساری پبلک بے چین ہو گئی اور حکومت برطانیہ نے جنگی جہازوں کا ایک پورا بیڑہ ایران کا سر کچلنے کے لیے خلیج فارس میں جمع کر دیا۔ یہ ہے وہ بات کہ ایک عضو کو تکلیف پہنچے تو تمام بدن بیدار اور مدافعت کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ بات یہ ہے کہ جس جماعت میں یہ روح پیدا ہو جاتی ہے اِس کا کوئی فرد کہیں اور کبھی بھی اپنے آپ کو اکیلا اور بے کس و بے بس نہیں سمجھتا، بلکہ پوری جماعت کی مدد اور پشت پناہی پر یقینِ محکم رکھتا ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہوا کہ جماعت کے ہر فرد میں ہر وقت پوری جماعت کی طاقت موجود رہتی ہے۔

قرآن میں اتّحاد اور اخوّت و محبت کے لیے بھی ایسے ہی قطعی احکام موجود ہیں جیسے کہ نماز، روزے اور دوسری عبادتوں کے لیے، لیکن جس قدر بے اعتنائی اِن احکامات سے برتی جاتی ہے شاید اور کسی حکم سے نہیں برتی جاتی۔ اگر یہ بے اعتنائی صرف عوام ہی تک محدود ہوتی تب بھی صبر آ جاتا۔ رونا تو یہ ہے کہ پڑھے لکھے اور قرآن کو خوب اچھی طرح سمجھنے والے بزرگ، عوام سے کہیں زیادہ اتّحاد و اخوت کی جڑوں پر کلہاڑے چلاتے، تفرقہ ڈلواتے اور فرقہ بندی کی آگ کو ہر وقت ہوا دیتے رہتے ہیں۔ اب تیسرے اُصول کا بیان سنئے:۔

رابطہ:

اجتماعی طاقت اور جماعت کی شیرازہ بندی کے لیے تیسری ضروری چیز رابطہ یا تنظیم ہے۔

قرآن میں ارشاد ہوتا ہے۔

یَآ اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اصْبِرُوْا وَ صَابِرُوْا وَرَابِطُوْا وَاتَّقُوا اللّٰہَ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ (آل عمران:۲۰۰)

یعنی ’’اے ایمان والو صبر کرو اور ایک دوسرے کو صبر دلاؤ اور باہم ملے رہو اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو شاید تم اپنی مراد کو پہنچو۔‘‘

رابطے کے یہ معنی ہیں کہ جماعت کے تمام ٹکڑوں اور حصوں میں باہمی تعلق اور تعاونِ عمل بدرجۂ اتم موجود رہے اور کوئی حصّہ کسی دوسرے حصّہ کی حالت سے کسی وقت بھی بے خبر نہ ہونے پائے۔ بات یہ ہے کہ نوعِ انسانی اپنے جذبات وکوائف اور ضروریات وحوائج میں متنوّع الخلقت واقع ہوئی ہے، اِس لیے ہر جماعت یا قوم میں مختلف گروہ یا طبقے پیدا ہو جاتے ہیں جو مختلف پیشے اور فن اختیار کر لیتے ہیں۔ اِن میں سے ہر طبقہ دوسرے طبقے کی مدد کامحتاج اور اپنے پیشے یا فن کے لحاظ سے پوری قوم کی ضروریات کا کفیل ہوتا ہے۔ بدیں وجہ اگر ان طبقات میں باہمی ارتباط اور تعاونِ عمل نہ ہو تو پوری قوم کے نظام میں خلل آ جاتا ہے اور اِس کی طاقت کم ہو جاتی ہے۔ اِس لیے ہر طاقتور جماعت میں تنظیم کا مکمّل ہونا بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا یقینِ محکم اور اتّحاد کا۔

تنظیم کا صرف ایک ہی طریقہ ہے کہ کسی قوم یا جماعت میں جتنے چھوٹے چھوٹے طبقے ہوں اِن سب کا ایک ایک مرکز ہو جو اُن کا نگران اور محافظ ہو، جو اِن کے ہر دُکھ درد، تکالیف اور ضروریات سے کماحقہٗ واقف رہے اِن کی ہر تکلیف کا ازالہ کرے اور اِن سے مناسب کام لے۔ پھر اِن تمام مراکز کا ایک واحد مرکز ہو جو اِن تمام طبقات کی ضروریات کا کفیل اور نگران ہو جو اِن تمام طبقات کو قابو میں رکھے اور اُن سے مناسب اور متناسب کام لیتا رہے۔

یہ واحد مرکز جماعت کے افراد و طبقات میں جس قدر مقبول اور ہر دلعزیز ہوگا اِسی قدر قوم طاقت ور اور خوشحال ہوگی۔ رسول اکرمؐ کے زمانہ سے حضرت عمرؓ کے زمانہ تک مسلمانوں کی بے مثال طاقت کا راز یہی تھا کہ پوری قوم کا ہر طبقہ اور ہر فرد مرکز پر نہ صرف اعتماد کامل رکھتا تھا بلکہ اِس کا والہ وشیدا اور عاشقِ زار تھا۔ تنظیم کی اِس اہمیت کے پیشِ نظر اسلامی عبادات میں نماز اور حج کی ترکیب و نہج ہی ایسی رکھی گئی ہے کہ اگر اِس پر پوری طرح عمل کیا جائے تو تنظیم کا ڈھانچہ خود بخود تیار ہو جاتا ہے۔ اب رہی اِس کی تکمیل اور تزئین تو وہ معمولی سمجھ کے قائد اور رہنما بھی اپنے اپنے زمانہ کی صورتِ حالات اور ماحول کے مطابق تھوڑی سی ترمیم اور تجدید کے بعد خود ہی کر سکتے ہیں۔ نماز اور حج سے تنظیم کا خاکہ کس طرح تیار ہوتا ہے، اِس کا بیان ہم عبادات کے بیان میں کریں گے۔ یہاں اِس قدر کہہ دینا کافی ہے کہ ملّتِ اسلامیہ کی عالمگیر تنظیم صرف اِس طرح ہوسکتی ہے کہ ہر ایک اسلامی مُلک اپنی اپنی جگہ پوری طرح متحدّ، مضبوط اور طاقتور ہو اور پھر یہ تمام ممالک ایک واحد مرکز سے متحد ہوں جو مکہ معظّمہ یا مدینہ منورہ میں ہونا چاہیئے۔ اِس مرکز کا امیر تمام ممالکِ اسلامیہ کی رائے سے منتخب کیا جائے۔ اِس امیر کی ایک مجلسِ شوریٰ ہو جس میں تمام اسلامی ممالک کے نمائندے شریک ہوں۔ اس مرکز میں تمام ممالکِ اسلامی کے مناقشات اور تنازعات کا فیصلہ پنچایت کے اُصول سے ہوا کرے۔ بین الاسلامی تمام مسائل یہیں طے ہوں اور جب دُنیا میں کسی مملکتِ اسلامی کو اغیار سے خطرہ ہو تو اِس کے دِفاع کا بندوبست یہیں سے کیا جائے۔ ہم یہ سب کچھ لکھ رہے ہیں لیکن ہمارا دل شرما رہا ہے۔ کیونکہ موجودہ حالات میں یہ باتیں شیخ چلی کی بڑ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتیں لیکن ہم یہ یقین کیے بغیر نہیں رہ سکتے کہ وہ وقت زیادہ دُور نہیں جب دنیائے اِسلام ایک دفعہ پھر کروٹ لے گی اور جو خواب ہم دیکھ رہے ہیں اِس کی

تعبیر مجسم ہو کر سامنے آ جائے گی۔ بہر حال جہاں ہو اور جب بھی ہو، تنظیم کا کمال یہ ہے کہ پوری قوم میں کوئی ایک شخص بھی ایسا نہ ہو جسے کوئی تکلیف یا حاجت ہو اور حکومت یا معاشرہ اِس سے بے خبر رہے اور اِس کا مداوا نہ کر سکے۔ اب ہم جماعت بندی کے چوتھے اُصول یعنی اطاعت کا ذکر کرتے ہیں:۔

اطاعت:

اطاعت کے معنی ہیں فرمانبرداری اور حکم ماننے کے۔ جس طرح ایک بچے اور ایک فرد کی اصلاح و تربیت اِس وقت تک ممکن نہیں جب تک وہ اپنے ماں باپ، اُستاد یا اتالیق کا حکم نہ مانے، اِسی طرح ایک جماعت یا قوم کی تنظیم بھی اِس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک کہ اِس کا ہر فرد اپنے قائدوں اور رہنماؤں کے ہر حکم اور ہدایت پر آنکھ بند کر کے بے چون و چرا عمل نہ کرے۔ فرض کیجئے میدان جنگ میں ایک جماعت مصروفِ کارزار ہے اور اس کا جنرل اپنے ماتحت افسروں کے ذریعہ احکام دے رہا ہے کہ آگے بڑھ جاؤ، دہنے فلینک پر حملہ کرو، اب بائیں طرف ہلّہ بول دو، اب آہستہ آہستہ پیچھے ہٹ آؤ وغیرہ وغیرہ۔ اب غور کیجئے کہ اگر تمام افسر اور سپاہی اس کے حکموں پر بے چون و چرا اور پوری طرح عمل نہ کریں، آگے بڑھنے کا حکم ملے تو پیچھے ہٹ آئیں یا وہیں ٹھہرے رہیں۔ پیچھے ہٹنے کو کہا جائے تو بڑھ جائیں، داہنے کے بجائے بائیں اور بائیں کے بجائے داہنی طرف حملہ کر دیں تو اِس جماعت یا فوج کا حشر کیا ہوگا۔ بالکل یہی حال ایک قوم کا ہے۔ جتنا کسی قوم کے افراد اپنے مذہبی اور ملکی قوانین و احکام پر عمل کریں گے، اتنی ہی وہ قوم ترقّی کرے گی۔ جتنی بے پروائی برتیں گے اتنا ہی زوال ہوگا۔ قائدین کے احکام پر سختی سے متحد العمل رہنا ہی قومی اتّحاد و ترقّی کی ضمانت ہے۔ قرآن صاف اور واضح الفاظ میں کہہ رہا ہے کہ اطاعت کرو اللہ کی،

رسولؐ کی اور اپنے اُن صاحبانِ امر کی جو تم پر مامور ہیں۔ یہی نہیں، ایک جگہ تو یہاں تک کہہ دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک فرمانبرداری ہی دین ہے، اِس لیے ہر مسلمان کو اپنی اپنی جگہ یہ محاسبہ کرتے رہنا چاہئے کہ وہ کہاں تک اللہ کے اِن احکام پر عمل کرتا ہے۔

اطاعت صرف یہ نہیں ہے کہ تم کو جو حکم وقتاً فوقتاً دیئے جائیں اُن پر فوری عمل کرو بلکہ اطاعت یہ بھی ہے کہ تمہارے لیے جو احکام یا ہدایات مستقلاً عمل کرنے کی غرض سے لکھ کر ایک جگہ جمع اور شائع کر دی جائیں، اِن پر بھی ہمیشہ عمل کرتے رہو۔ مثلاً قرآن، صحیح احادیث، تمہارے مُلک کا آئین و قانون، بلدیات کے قواعد و بائی لاز، دفتروں کے کنڈکٹ رولز اور دوسرے قواعد وضوابط وغیرہ وغیرہ۔ اگر تم اِن تمام قواعد وضوابط اور احکام و قوانین پر کماحقّہٗ عمل کرتے رہو گے تو تمہارے افراد کے افکار و تخیّلات میں ہمیشہ وحدت و ہم آہنگی رہے گی۔ تمہارا اتحّاد مضبوط سے مضبوط تر اور تمہاری جماعت قوی سے قوی تر ہوتی چلی جائے گی۔ آج کل کی اصطلاح میں اِسی بات کو ڈسپلن کہا جاتا ہے۔

یہ اطاعت وفرمانبرداری یا ڈسپلن کوئی معمولی چیز نہیں بلکہ قوم کی شیرازہ بندی اور اِس میں وحدتِ فکر و عمل پیدا کرنے کے لیے اتنی ہی ضروری ہے جتنی کہ ایک فرد کی زندگی اور صحت کو برقرار اور اعتدال پر رکھنے کے لیے قلب کی باقاعدہ حرکت۔ اگر آپ کو اطاعت کی واقعی قدر و قیمت معلوم کرنا ہو تو اعلیٰ درجے کی باقاعدہ اور تربیت یافتہ فوجوں میں جا کر دیکھیں۔ اِن فوجیوں میں افسروں سے لے کر سپاہیوں تک سب کا اُٹھنا بیٹھنا، چلنا پھرنا، بولنا چالنا، کھانا پینا الغرض ہر چیز کا انداز و نہج اِس قدر ملتا جلتا ہے کہ سب ایک ہی سانچے کے ڈھلے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ یہیں جماعت اور اجتماعیت کے حقیقی معنی معلوم ہوتے ہیں۔ اِن فوجیوں کو حکم ماننے کی اِس قدر مشق اور عادت ہو جاتی ہے کہ آرڈر ملتے ہی بغیر سوچے صحیح

عمل کر گزرتے ہیں۔ ہم نے فوجی چھاؤنیوں میں کئی مرتبہ دیکھا کہ ایک سپاہی ہاتھ میں دودھ کا گلاس لیے جا رہا ہے اور پیچھے سے کسی دوست نے مذاقاً اٹین شن کا حکم دے دیا۔ جانے والے سپاہی کے دونوں ہاتھ فوراً رانوں سے لگ گئے اور دودھ کا گلاس ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر گر گیا۔ اِس ڈسپلن کی مشق پریڈ کے میدان میں ریکروٹی کے زمانہ ہی سے کرائی جاتی ہے اور ٹیکنیکل تعلیم و تربیت سے پہلے ہی یہ چیز پکّی کرا دی جاتی ہے۔ پھر وہ اِس میں اِس قدر پختہ ہو جاتے ہیں کہ میدان جنگ میں جب اِن کو ''ایڈوانس'' کا حکم ملتا ہے تو سامنے خواہ گولوں اور گولیوں کا مینہ ہی کیوں نہ برس رہا ہو یہ حکم کے تابعدار بندے بغیر سوچ اور غور کیے اِس آگ کے دریا میں کود پڑتے ہیں۔ مسلمانوں کو بھی قرآن میں اِسی قسم کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے۔ کیا ہمارے لیے اِس میں عبرت کا کوئی سبق نہیں کہ یہ فوجی سپاہی اور افسر جن کو ماہوار چاندی کی چند ٹکلیاں ملتی ہیں اِس بے جگری سے جان دے دیتے ہیں اور حکم عدولی نہیں کرتے اور ہم جن کو ہمارے خالق و مالک نے جان، عقل، بیوی بچے، علم و دانش، صحت اور تمام عمر کا رزق عطا فرمایا ہے اِس کے حکم کی اتنی بھی پرواہ نہیں کرتے جتنی کہ یہ فوجی اپنے بالا دست افسروں کے حکم کی کرتے ہیں۔

اِس میں شک نہیں کہ جس طرح قرنِ اوّل کے مسلمان اللہ اور رسولؐ کے حکم کی تعمیل میں اپنے دین و ملّت کی حفاظت کے لیے لڑا کرتے تھے، اِسی طرح اب سے کچھ عرصہ پہلے تک انگریزی فوجیں اپنے بادشاہ، وطن اور قوم کے لیے لڑتی رہیں، لیکن اب نصف صدی سے یہ جذبہ اِن میں سے جاتا رہا ہے۔ اب انگریزی فوجیں صرف ڈسپلن کے بل بوتے پر جنگ کرتی ہیں اور کامیاب ہوتی ہیں۔ جس دن یہ ڈسپلن رُخصت ہوا، انگریزی اقتدار کے تابوت میں آخری کیل ٹھک جائے گی۔ ڈسپلن صرف مذہبی و ملکی آئین و قوانین اور فوجی و

دفتری قواعد وضوابط ہی کا نام نہیں بلکہ یہ زندگی کے ہر شعبہ مثلاً تجارت، زراعت، صنعت و حرفت اور خانگی امور کو کامیابی سے انجام دینے کے لیے بھی کچھ کم ضروری نہیں ہے۔ اِن امور و معاملات میں ڈسپلن یہ ہے کہ ہر شخص مقررہ قواعد وضوابطِ اخلاق وغیرہ کا پوری طرح پابند رہے، اپنے اختیار وحقوق کی حدود میں کام کرے، اِن سے باہر نہ نکلے، دوسروں کے کاموں میں بلاوجہ دخل نہ دے اور اپنے فرائض کو کماحقّہٗ ادا کرے۔ گھریلو زندگی میں ڈسپلن کی بہت ہی ضرورت ہے۔ خاوند، بیوی، بچے، ملازم اور دوسرے مکین اپنے اپنے حقوق کی حدوں سے خوب واقف ہوں اور اپنے فرائض کو کماحقّہٗ انجام دیں۔ جس چیز کو قرینہ اور سلیقہ کہتے ہیں وہ بھی ڈسپلن (یعنی قواعد وضوابط کی پابندی) ہی سے حاصل ہوتا ہے اور قائم رہتا ہے۔

یعنی گھر میں جو چیز جس کام کے لیے ہو اِسی کے لیے استعمال کی جائے، ہر چیز کی جو جگہ ہے وہیں رکھی جائے۔ جس شخص کی جو چیز ہو، اِس کی اجازت کے بغیر اِستعمال نہ کی جائے اور جو کام جس طرح اور جس وقت ہونا چاہئے ٹھیک اِسی طرح اور اِسی وقت کیا جائے۔ ممکن ہے بعض آدمیوں کو یہ باتیں بہت معمولی نظر آئیں لیکن ان کو معلوم ہونا چاہئے کہ اطاعت کی بُنیاد بچپن ہی سے پڑتی ہے اور بچے جیسا کچھ گھر میں ہوتا دیکھتے ہیں وہی سیکھتے ہیں، اِس لیے خانگی زندگی کو خوشگوار بنانے اور بچوں کو اچھا شہری اور پکّا اطاعت گزار اٹھانے کے لیے گھر کی ہر بات میں قواعد وضوابط کی پابندی کا خیال رکھنا اور اس کو قوّت سے عمل میں لانا بہت ہی اہم بات ہے، اسے معمولی نہ سمجھنا چاہئے۔

فوجی ڈسپلن کی ابتدا بھی ایک بہت معمولی سی بات یعنی صرف حکم پر داہنا اور بایاں پاؤں اٹھانے اور اپنے ساتھیوں سے قدم ملا کر چلنے سے پڑتی ہے مگر آخر میں اس سے کس قدر مہتم

بالشّان نتیجے پیدا ہوتے ہیں۔اب ہم پانچویں اُصول یعنی عمل کا بیان کرتے ہیں۔

عمل:

پانچویں چیز جس سے جماعت کے وجود کا ثبوت ملتا ہے اور افراد کو اجتماعیت کے فوائد واقعی حاصل ہوتے ہیں ''عمل'' ہے۔ جماعت کے لیے عمل بالکل ایسا ہی ہے جیسے ایک زندہ جسم کے لیے حرکت۔ اگر کوئی جاندار پیدا ہونے سے مرنے تک کوئی حرکت نہ کرے، ہمیشہ بے حس وحرکت ایک ہی حالت میں پڑا رہے تو خواہ اس کی عمر ہزاروں برس ہی کیوں نہ ہو اس پر ''زندہ'' کا لفظ صادق نہیں آسکتا۔قرآن میں سُستی، کاہلی اور بے عملی کی سخت مذمت کی گئی ہے، اِس لیے صحابۂ کباران چیزوں کو پاس بھی نہ پھٹکنے دیتے تھے۔صحابہ کے بعد بھی کئی سو برس تک مسلمانوں میں قوّتِ عمل خاصی تھی۔ جب تک یہ قوّت ان میں باقی رہی وہ زندگی کی دوڑ میں دوسری قوموں سے کہیں آگے رہے۔ جب یہ قوّت ختم ہوئی وہ کھڑے ہو گئے اور دوسری قومیں آگے نکل گئیں۔عمل کی قوّت کو کام میں لانے کے لیے کسی مقصد اور مہیّج کی ضرورت ناگزیر ہے بغیر اس کے کوئی جسم حرکت نہیں کرتا۔کیڑے مکوڑے، پرندے اور دوسرے تمام جانور خوراک حاصل کرنے اور گرمی سردی کی تکلیف سے بچنے کے لیے متحرک اور مصروفِ عمل رہتے ہیں۔انسانی اجسام کو متحرک رکھنے کے لیے بھی اصلاً یہی چیزیں مہیّج کا کام دیتی ہیں، لیکن اس کے مقاصد وعزائم صرف یہیں تک محدود نہیں رہتے، اس کی اور بھی بہت سی خواہشات ہیں جو جانوروں میں نہیں۔انسان بالفطرت آرام وآسائش کی کسی حالت پر بھی مطمئن نہیں رہتا اور ہمیشہ بہتر سے بہترین اور اعلیٰ سے اعلیٰ ترین حالت کی طرف بڑھنا چاہتا ہے۔یہی خواہش اس کو ہمیشہ مصروفِ عمل رکھتی اور ارتقائے تمدّن کے اعلیٰ مدارج کی طرف چلاتی رہتی ہے۔انسانوں کی جو جماعت اپنی حالت پر قانع ہو کر عمل سے دستکش ہو

جاتی ہے وہی پسماندہ کہلاتی ہے۔ یہی خواہش انسان کے موجودہ معیارِ تمدّن تک پہنچنے کی وجہ ہے اور خدا ہی جانے کہ وہ ابھی کہاں پہنچ کر دم لے گا یا شاید قیامت تک کہیں دم ہی نہ لے۔

کھانے پینے، کپڑے لتّے اور مکانات کے علاوہ انسان میں ایک اور فطرتی خواہش بھی ہے، یعنی وہ اپنی اصل کو معلوم کرنا چاہتا ہے، وہ جاننا چاہتا ہے کہ پیدا ہونے سے پہلے میں کیا تھا؟ کن حالات میں سے گزرنے کے بعد پیدا ہوا؟ یہ مادّہ اور روح کیا چیز ہے؟ موت کیا ہے؟ مرنے کے بعد مجھے کہاں جانا ہے؟ اس عالم کو پیدا کرنے والا کوئی ہے بھی یا نہیں ہے؟ ہے تو کیسا ہے؟ کہاں ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ جو قومیں ان سوالات کا جواب معلوم کرنے کے لیے تفکّر سے کام لیتی اور مصروفِ عمل رہتی ہیں، اُن کو حیاتِ نو عطا ہوتی رہتی ہے، کیونکہ جہاں تک روٹی کپڑے اور مکان کا سوال ہے، انسان اپنی کوششوں سے جلد ہی اس حد تک پہنچ سکتا ہے جہاں اسے مزید عمل کی ضرورت محسوس نہ ہو اور وہ اپنی نادانستگی، جہالت یا تن آسانی کی وجہ سے قانع ہو کر بیٹھ جائے اور عمل کرنا چھوڑ دے، لیکن جہاں تک مبداء اور معاد کے متعلق تسکین کا سوال ہے یہ تشنگی کبھی بھی ختم نہیں ہوسکتی اور وہ ہمیشہ مصروفِ عمل رہ سکتا ہے، یہی وجہ ہے کہ قرآن میں مسلمانوں کو دونوں باتوں کا حکم دیا گیا ہے۔

فرماتے ہیں ''اس زمین پر پھیل جاؤ اور اللہ تعالیٰ کا فضل یعنی رزق تلاش کرو۔'' ارشاد ہوتا ہے کہ ''اپنا دُنیا کا حصّہ حاصل کیے بغیر دم نہ لو۔'' کہتے ہیں کہ ہم سے یوں مانگا کرو ''اے ہمارے رب ہم کو دُنیا اور آخرت دونوں کی نعمتیں عطا فرما۔'' مبداء اور معاد کی گتھیاں سلجھانے کے لیے قرآن میں سینکڑوں جگہ ارشاد ہوا ہے کہ ہماری نشانیوں میں غور و فکر کیا کرو۔ چنانچہ ایک جگہ فرمایا ہے ''دنیا میں سفر کرو اور معلوم کرو کہ آفرینش کی ابتدا کیونکر ہوئی؟'' دیکھنے میں یہ ایک معمولی سی بات اور چھوٹی سی آیت ہے لیکن اسی ایک سوال کا جواب معلوم کرنے کی

کوششوں سے بیسیوں علوم وجود میں آ گئے، مثلاً علمِ طبقات الارض، علمِ نباتات، علمِ حیوانات، علمِ الحیات، جغرافیہ، تاریخ، علمِ طب، علمِ ہیئت، فزکس اور کیمسٹری وغیرہ وغیرہ، اور یہی وہ علوم ہیں کہ جو قومیں اُن کو حاصل کرتی ہیں خدائی انعامات و نوازشات سے مالا مال ہو جاتی ہیں۔ ان علوم کی تحصیل کا حکم دینے میں مصلحت یہ ہے کہ ان کی کوئی انتہا نہیں اور انسان اس بہانے سے ہمیشہ عمل میں مصروف رہ کر ترقّی کرتا چلا جاتا ہے۔ مسلمانوں کو مصروفِ عمل رکھنے کے لیے خدا نے کیا نہیں کہا، سارا قرآن ''عمل کرو'' ''عمل کرو'' ''مناسب عمل کرو'' کے الفاظ سے بھرا پڑا ہے۔ کسب معاش، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، جہاد، تبلیغ اور تفکّر فی آیات اللہ کے احکام اگر قوّتِ عمل کو بیدار کرنے، متحرک رکھنے کے لیے نہیں تو پھر کس لیے ہیں؟ مگر افسوس کہ جس قدر زیادہ قرآن میں عمل پر زور دیا گیا ہے اسی قدر ہم نکمّے، سست، بیکار اور بے عمل ہیں۔

الغرض یہ ہیں وہ پانچ عناصر جن سے جماعت کا جسم، روح، قلب، دماغ اور حواس تیار ہوتے ہیں اور اس میں قوّتِ اجتماعیت پیدا ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ آدمیوں کا جو گروہ ان پانچ باتوں پر جس قدر زیادہ سختی اور سرگرمی سے پابند ہو گا، اسی قدر زیادہ منظّم اور طاقتور جماعت بن جائے گا۔ لیکن ایک جماعت میں صرف انہی پانچ باتوں کا ہونا ہی کافی نہیں۔ انسانی زندگی کے بہت سے پہلو اور بھی ہیں اور ہر انسان کی بیسیوں مختلف اضافی حیثیتیں ہوتی ہیں، مثلاً ایک شخص بسا اوقات ایک ہی وقت میں باپ بھی ہوتا ہے بیٹا بھی، بھائی بھی ہوتا ہے بھتیجا اور بھانجا بھی، چچا اور ماموں بھی ہوتا ہے، خالو اور پھوپھا بھی، خاوند بھی ہوتا ہے، دیور اور جیٹھ بھی، نوکر بھی ہوتا ہے آقا بھی، ماتحت بھی ہوتا ہے افسر بھی، سودا بیچنے والا بھی ہوتا ہے اور خریدار بھی، زمیندار بھی ہوتا ہے اور مزارع بھی، وغیرہ وغیرہ، تو ضرور ہے کہ اِن

تمام اضافی حیثیتوں کے لحاظ سے مختلف فرائض کی بجا آوری کے لیے کوئی ایسا آئین وضابطہ اورقوانین وقواعد موجود ہوں جن پر اِس جماعت کا ہر فرد آنکھ بند کر کے عمل کر سکے تاکہ تمام افراد کے افعال میں یکسانیت اور وحدت عمل قائم رہے اورقوّتِ اجتماعی میں خلل نہ پڑے۔ چنانچہ مسلمانوں کی ہدایت و رہنمائی کے لیے ایک مکمّل ضابطۂ حیات موجود ہے جس کا نام ہے قرآن۔

قرآن:

یہ ایک مُنَزِّل مِنَ اللّٰہ کتاب ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے تمام دُنیا کی ہدایت و رہنمائی کے لیے اپنے محبوب اور عزیز ترین بندے اور رسول جناب احمد مُصطفٰے محمدّ مُجتبےٰؐ پر جبریل امین کے ذریعہ نازل فرمایا۔ یہ کتاب مبارک جیسی کہ سرورِدو عالمؐ پر اُتری تھی آج تک بغیر ایک حرف یا زیر و زبر کی کمی بیشی کے محفوظ ہے اور قیامت تک محفوظ رہے گی کیونکہ اللہ تعالیٰ نے خود اِس کی حفاظت کا وعدہ فرمایا ہے۔ اِس کتاب میں کیا ہے؟ اِس میں کیا نہیں؟ ہر وہ چیز جس کی ایک انسان کو دُنیا اورآخرت دونوں میں آرام واطمینان کی زندگی بسر کرنے کے لیے ضرورت پڑ سکتی ہے اِس میں موجود ہے۔ یہ نوع انسان کو زندگی بسر کرنے کے وہ طریقے بتاتی ہے کہ اگر ان پر کما حقہٗ عمل کیا جائے تو سارے کرۂ ارض پر وہ عالمگیر امن وامان قائم ہو جائے جس کی تلاش میں اہلِ دُنیا شاید دُنیا کی پیدائش سے آج تک سرگرداں و پریشان ہیں۔سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ قرآن برائی اور بھلائی کی حدود مقرّر کرتا اور اِن میں تمیز کرنا سکھاتا ہے۔ پھر کہتا ہے بُرائیوں سے بچو کہ اِن سے تم کو بالآخر تکلیف پہنچے گی اور بھلائیوں کو اختیار کرو کہ وہ دُنیا و آخرت دونوں میں تمہارے لیے راحت واطمینان کا باعث ہوں گی۔ پھر وہ انسانوں کے ان تمام حقوق وفرائض کا تعین کرتا ہے جو متمدّن زندگی کی وجہ

سے ایک دوسرے پر عائد ہوتے ہیں اوران پر عمل کرنے کے طریقہ سکھاتا ہے۔ وہ دُنیا کے تمام علوم اپنی گود میں لیے ہوئے ہے۔ صحت وصفائی سے لے کر معیشت، معاشرت، زراعت، تجارت، صنعت وحرفت، اقتصادیات، معاملات، اخلاق وآداب، سائنس اور فلسفہ وحکمت تک کونسی شے ہے جو اِس میں موجود نہیں۔

قرآن سُستی، کاہلی اور بیکاری کی مذمت اور کسبِ معاش کے لیے عمل ومحنت کی تلقین کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اِس زمین کی وسعتوں میں پھیل جاؤ اور رزق و دولت تلاش کرو۔ وہ پکارتا ہے کہ سمندر کے سینوں کو اپنے جہازوں اور کشتیوں سے چیر ڈالو اور غیر ملکوں سے تجارت کرو۔ سمندر کی تہوں میں اُتر جاؤ اور لؤلؤ ومرجان سے اپنے خزانے بھر کر فارغ البال ہو جاؤ۔ قرآن صرف دولت مند بننے ہی کی ترغیب نہیں دیتا بلکہ جہانگیری وجہانبانی کا حکم دیتا اور اِس کے اُصول وطریقے بھی بتاتا ہے۔ قرآن میں کھانے پینے، ملنے جلنے اور بولنے چالنے کے معمولی آداب وقواعد سے لے کر نکاح، بیاہ، طلاق، وراثت، خیرات، زکوٰۃ، عدالتی انصاف، دیوانی، فوجداری، جدال وقتال اور حرب وضرب تک سبھی کے متعلق احکام وقوانین موجود ہیں۔ علم وادب کے لحاظ سے بھی یہ بے نظیر کتاب ہے۔ اِس کی فصاحت و بلاغت ساری دُنیا کے نزدیک مسلّم اور بے مثال ہے۔ عرب ممالک کے مکاتب و مدارس اور خصوصاً مصر کے جامع ازہر میں تو قرآن ہی تمام عربی علم وادب کے نصاب کی اساس و بُنیاد ہے۔ قرآن میں تاریخی قصص اور حکایات و واقعات بھی ہیں جن سے بیش قیمت تاریخی معلومات اور بے انتہا عبرت ونصیحت حاصل ہوتی ہے۔

علم و دانش کی اِن تمام باتوں کے علاوہ قرآن میں وہ سب کچھ بھی ہے جس کی ضرورت انسانی اجسام کو اتنی نہیں جتنی اُس کے ذہن، عقل اور روح کو ہوتی ہے۔ اِس صحیفہ میں حسن و

رعنائی کی کیف آور تجلیاں ہی نظر نہیں آتیں بلکہ عشق و محبت کے جنوں پرور نسخے بھی ملتے ہیں۔ اِس میں یہ بھی ہے کہ انسان پیدا ہونے سے پہلے کیا تھا، کہاں تھا؟ کن کن منازل و مراحل سے گزر کر وہ اِس مادّی پیکر میں ملبوس و متشکل ہوا، یہاں وہ کس غرض سے بھیجا گیا ہے۔ مرنے کے بعد اِس کو کہاں جانا ہے، کس راستے سے جانا ہے۔ کن کن طبقات و مقامات سے کس طرح گزرنا ہے، روح، عقل، نفس، عدم و وجود، دوزخ، جنت، فرشتے، عرش و کُرسی کیا ہیں؟ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان سب کا بنانے والا کون ہے؟ کیسا ہے، کہاں ہے؟ اور اِس کی معرفت و لقاء کس طرح میسر آ سکتی ہے؟ دیکھنے والی آنکھ، جستجو کرنے والا دماغ اور آتشِ شوق سے تڑپتا ہوا دل ہو تو قرآن سے کیا نہیں مل سکتا؟ جو لوگ اِس کے اسرار و غوامض میں تفکّر سے کام لیتے اور عمل کرتے ہیں، اپنی مُراد پاتے اور طرح طرح کی نعمتوں سے سرفراز ہوتے ہیں۔ جو صرف لفظی کرشمہ سازیوں کی تحقیق میں مصروف رہتے ہیں یا بے معنی و مطلب سمجھے، صرف زبانی تلاوت و ترتیل میں عمر گزار دیتے ہیں وہ بھی نامراد نہیں رہتے، کم از کم اِن کی ذہنی و روحانی تسکین ہی ہو جاتی ہے۔

مختصر یہ کہ قرآن میں سب ہی کچھ ہے۔ ہاں نہیں ہے تو ایک چیز۔ آپ حیران ہوں گے کہ وہ کیا ہے؟ لوسنو! قرآن میں، ہاں اُسی قرآن میں جس میں سب کچھ ہے یہ کہیں نہیں لکھا کہ اگر ایک مسلمان مُلک پر کسی غیر مسلم قوم کا قبضہ ہو جائے اور مسلمان محکوم و غلام بن جائیں تو اِس صورت میں انہیں کیا کرنا چاہئے۔ بے شک قرآن میں محکومی اور غلامی کی زندگی بسر کرنے کے قاعدے کہیں نہیں بتائے گئے۔ لیکن یہ قرآن کا نقص نہیں ہے، یہ اِس کی خامی اور کمی نہیں، یہ تو اِس کی تعلیم کے قطعی، آخری اور مکمّل ہونے کا عین ثبوت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن صرف عزت و اقتدار اور آزادی و حاکمیت کی تعلیم دیتا ہے۔ جو قومیں اِس کی

تعلیم پر چلیں گی معزز، مقتدر، آزاد و حاکم رہیں گی، محکومی اور غلامی کی زندگی سے انہیں واسطہ ہی نہ پڑے گا۔ البتہ جو لوگ اِس کی تعلیم سے روگردانی اور سرتابی کریں گے وہ محکوم اور غلام ہو جائیں گے اور اِس صورت میں قرآنی تعلیم یا اِس کو نازل کرنے والے پر اِن کی غلامی و محکومی اور ذلّت و تباہی کی کوئی ذمہ داری عائد نہ ہوگی۔

الغرض یہ ہے قرآن اور اِس کی تعلیم جس پر عمل کر کے قرنِ اَوّل کے مسلمانوں نے دُنیا پر حکمرانی کی۔ جب تک پچاس فیصدی مسلمان بھی اِس تعلیم پر عمل کرتے رہے انہیں دُنیا کی سیادت حاصل رہی، لیکن جب ان کی اکثریت نے غیر قرآنی عقائد کی پیروی شروع کی وہ رسوا اور ذلیل ہو گئے۔ اِس پر بھی اللہ کا کرم ہے کہ آج دُنیا کے بہت سے ملکوں میں اِن کی اپنی حکومت ہے اور یہ مُلک خواہ کتنے ہی کمزور اور دوسروں کے دست نگر ہوں، داخلی اعتبار سے یہ قدرت ضرور رکھتے ہیں کہ چاہیں تو قرآن پر عمل شروع کر کے پھر اپنا وہی مقام حاصل کریں جس پر اغیار نے قبضہ کر لیا ہے۔ اب ہم مسلمانوں کے زوال کی وجوہات بیان کریں گے۔

اسبابِ زوال

مسلمانوں کے زوال کی وجوہات معلوم کرنے کے لیے اُن کے نقائص اور خامیوں پر تفصیلی نظر ڈالی جائے تو بے اختیار یہ مثل یاد آتی ہے کہ اونٹ رے اونٹ تیری کونسی کل سیدھی؟ اونٹ کی تو ممکن ہے کوئی کل شاید سیدھی بھی ہو، لیکن اِس اُمتِ مرحومہ کی تو واقعی کوئی بھی کل سیدھی نہیں ہے۔ عقائد، عبادات، علم، اخلاق، معیشت اور معاشرت، جس لحاظ سے بھی دیکھو کجی اور کجروی کے سوائے کچھ بھی نظر نہیں آتا، اِن اسبابِ زوال کو تفصیلاً بیان کرنا کسی طرح بھی ممکن نہیں۔ اِس لیے ہم صرف وہ بڑے بڑے سبب بیان کریں گے جو دیگر تمام اسباب پر حاوی ہیں۔ آسانی کی غرض سے اِن تمام وجوہات کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک داخلی اسباب، دوسرے خارجی اسباب، پہلے داخلی اسباب کا بیان سنئے:۔

داخلی اسباب:

داخلی اسباب میں سب سے بڑا سبب تو یہ ہے کہ ہم نے اُن اُصولوں پر عمل کرنا چھوڑ دیا ہے جو قرآن نے جماعت کی شیرازہ بندی اور اجتماعی قوّت پیدا کرنے کیلئے مقرّر کیے ہیں۔ یہ اُصول اوپر بیان ہو چکے ہیں۔ یہاں ہم ان میں سے ہر ایک کو الگ الگ بیان کر کے یہ دکھائیں گے کہ اب مسلمان ان پر کس طرح عمل کر رہے ہیں۔

توحید:

جیسا کہ بیان ہو چکا ہے، مذہبِ اسلام کا سب سے پہلا اور بُنیادی اُصول توحید یعنی اس بات پر ایمانِ کامل رکھنا ہے کہ اللہ اپنی ذات و صفات میں ہر لحاظ سے ایک اور بیمثل

ہے۔ کسی لحاظ سے بھی اس کا کوئی شریک نہیں، وہ اس کائنات کا خالق ہے جیسا کہ خود فرماتا ہے۔

قُلِ اللّٰہُ خَالِقُ کُلِّ شَیۡءٍ وَّھُوَ الۡوَاحِدُ الۡقَھَّارُ (الرعد:۱۶)

ہر شے کو اس نے اپنی مرضی اور مصلحت سے جیسا چاہا اور جس نہج پر چاہا پیدا کیا ہے۔ جس طرح چاہے اسی طرح رکھتا ہے۔ اس نے اپنی مرضی سے انسان کو جس قدر چاہا اختیار بخشا ہے اور جس قدر چاہا مجبور رکھا ہے۔ اس کے سوائے اور کوئی نہ تو کسی کا کچھ بنا سکتا ہے نہ بگاڑ سکتا ہے۔ ان اور دیگر امور میں وہ کسی کے آگے جواب دہ نہیں ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ آج کل مسلمان توحید کے بارے میں کیا عقیدہ رکھتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ جس ذات قدسی صفات نے اللہ سے تعلیم پا کر مسلمانوں کو یہ عقیدہ سکھایا اور اس پر شدت و سختی سے کاربند رہنے کا حکم دیا، بے شمار مسلمان آج خود اسی کو خدا مانتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ احد اور احمد میں فقط میم کا فرق ہے اور یہ میم مادّہ کی میم ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ احد جب مادّی لباس میں ملبوس ہو کر اس زمین پر جلوہ گر ہوا تو احد سے احمد بن گیا، ورنہ در حقیقت دونوں نام ایک ہی ذاتِ احدیت مآب کے ہیں۔ استغفر اللہ! یہ عقیدہ صرف ہندوستان اور پاکستان کے مسلمانوں میں پایا جاتا ہے اور اس کے ماننے والوں کی جماعت مشتمل ہے ایک خاص قسم کے صوفیوں اور اُن کے مریدوں پر جن کی تعداد لاکھوں سے زیادہ ہے۔ ہند اور پاکستان تک اس عقیدے کے محدود ہونے کی وجہ صرف یہ ہے کہ ہندوستان کے ہندوؤں میں ہزارہا سال سے اوتاریت کا عقیدہ رائج اور راسخ ہے۔ ہمارے صوفیاء نے جب دیکھا کہ ہندوؤں کا پرمیشور تو رام، کرشن اور رشیوں منیوں کا روپ دھار کر بار بار دُنیا میں آتا اور ہندوؤں کی اصلاح اور مدد کرتا رہتا ہے تو ہم کیوں ان سے پیچھے رہیں، چنانچہ انہوں نے جھٹ یہ عقیدہ گھڑ مارا، مریدوں کو پہلے ہی یہ سکھایا جاتا ہے

کہ۔

بے سجادہ رنگیں کُن گرت پیرِ مغاں گوید
کہ سالک بے خبر نبود زِراہ و رسمِ منزلہا

انہوں نے بے چون و چرا اس ہفوات کو تسلیم کرلیا۔صوفیوں نے سینکڑوں مقالات اور کتابیں اس پر لکھیں۔شاعروں نے ہزارہا شعر، نظمیں اور گیت اس پر کہے۔پیروں کی مجلسوں اور بزرگوں کے عرسوں پر ڈوموں، قوالوں اور رنڈیوں نے اس کی تبلیغ کی۔نتیجہ یہ ہوا کہ بے شمار لوگ آج اس کو حقیقت جانتے اور مانتے ہیں اور کوئی نہیں دیکھتا کہ قرآن اس کی بابت کیا کہتا ہے اور خود رسول اللہؐ کی احادیث کیا بیان کرتی ہیں۔اگر یہ عقیدہ صرف جہلاء ہی تک محدود ہوتا تو بھی ہم صبر کر لیتے، رونا تو یہ ہے کہ اچھے خاصے تعلیم یافتہ اور پڑھے لکھے لوگ بھی اس کے معتقد ہیں اور علی الرغم قرآن واحادیث، اس کی ترویج کو اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ان میں کچھ لوگ تو بِلا استثناء رسول کو خدا مانتے ہیں، لیکن زیادہ ایسے ہیں جو حضورؐ کو تقریباً ہر بات میں خدا کا شریک گردانتے ہیں۔اس قسم کے مضامین اور اشعار جمع کیے جائیں تو ایک طُومار ہو جائے، اِس لیے ہم مُشتے نمونہ از خروارے صرف دو شعر لکھتے ہیں۔ ایک صاحب فرماتے ہیں۔

اللہ کے پلّے میں وحدت کے سوا کیا ہے
جو کچھ مجھے لینا ہے لوں گا میں محمدؐ سے

ملاحظہ فرمایا آپ نے اس شاعر کے نزدیک اللہ کس قدر بیچارہ (نقلِ کفر کفر نباشد) اور محمدؐ کس قدر قادرِ مطلق ہیں۔دوسرے کسی شاعر کا شعر ہے۔

کہتا ہوں میں رسول مرا کار ساز ہے
یہ کفر وہ ہے جس پہ کہ ایماں کو ناز ہے

ذرا اس ''کہتا ہوں میں'' کا ٹھاٹھ ملاحظہ فرمایئے۔ شاعر صاحب کا انداز بیان یہ ہے کہ قرآن لاکھ کہے کہ کارساز صرف اللہ ہے اور رسول اللہ لاکھ اس کی تصدیق فرمائیں یہ سب غلط (نعوذ باللہ) مگر ''میں جو کہتا ہوں'' اور علی الاعلان کہتا ہوں، ڈنکے کی چوٹ کہتا ہوں، خم ٹھونک کر کہتا ہوں اور علی الرغم قرآن و حدیث کہتا ہوں کہ میرا کارساز تو صرف رسول ہی ہے، یہ صحیح۔ اور پھر یہ بھی کہ اگر ایسا کہنا کفر ہے تو ہوا کرے میں اس ایمان کی کیا پرواہ کرتا ہوں جس پر قائم رہنے کا حکم قرآن و حدیث میں ہے۔ واہ کیا ڈھٹائی ہے، کیا پختہ ایمان ہے، کیسی اچھی تعلیم ہے جو ایک گری ہوئی قوم کو دی جا رہی ہے۔

وائے گر در پسِ امروز بود فردائے

قرآن میں آنحضورؐ کے متعلق جو آیات ہیں ان میں سے چند ایک کا ترجمہ ملاحظہ ہو:

(۱) محمدؐ کچھ نہیں ایک رسول ہے پہلے بھی بہت سے رسول ہو گزرے ہیں پھر اگر وہ مر گیا یا مارا گیا تو کیا تم اپنی ایڑیوں پر واپس لوٹ جاؤ گے۔ (آل عمران: ۱۴۴)

(۲) اے محمدؐ کہہ دے کہ نہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں، نہ میں غیب داں ہوں نہ فرشتہ۔ (الانعام ۵۰)

(۳) کہہ دو کہ مجھ کو نہیں معلوم میرا کیا ہونا ہے اور تمہارا کیا ہونا ہے۔ (الاحقاف آیت 9)

(۴) کہہ دو کہ میں مالک نہیں اپنے بُرے بھلے کا بھی۔ (الاعراف ۱۸۸)

(۵) کہہ دو میرے ہاتھ میں نہیں تمہارا بُرا بھلا۔ (الجن ۲۱)

ان کھلی اور صاف آیات کی موجودگی میں حضورؐ کو خدا ماننا، قادرِ مطلق جاننا یا کسی لحاظ سے بھی اللہ کا شریک ٹھیرانا کہاں کا اسلام ہے اور کون سی مسلمانی؟ قرآن کریم میں حضورؐ کی بے انتہا توصیف اور بڑائی بیان کی گئی ہے لیکن یہ کہیں نہیں کہا گیا کہ حضورؐ کسی حیثیت سے بھی اللہ کے شریک یا برابر ہیں، حضورؐ کی سب سے بڑی بزرگی تو یہ ہے کہ اور نبی تو صرف

اپنی اپنی قوم کے لیے آئے، لیکن آپ تمام دُنیا کے لیے معبوث ہوئے اور حضورؐ کی وساطت سے دُنیا کی ہدایت کے لیے وہ آخری اور قطعی آئین نافذ ہوا جس کا نام قرآن ہے۔ اگر آپؐ پیدا نہ ہوتے اور آپ کے ذریعہ قرآن اور اخلاقِ محمدی کی تعلیم دُنیا کو نہ دی جاتی تو کون صحیح اندازہ کرسکتا ہے کہ آج دُنیا کس حال میں ہوتی۔ حضورؐ کی بعثت کے وقت نہ صرف یورپ بلکہ دُنیا کے ہر مُلک میں وحشت و بربریت کا دَور دَورہ تھا اور انسان انسان کو کھا رہا تھا۔ ساری دُنیا میں یہ ایک معمولی بات تھی کہ صاحبانِ اقتدار اپنے مجرموں، غلاموں اور بے گناہ معتوب لوگوں کو شیروں اور کتوں سے پھڑواتے، زندہ گڑواتے اور دیواروں میں چنوا دیتے تھے۔ اکثر ملکوں میں دُختر کُشی عام تھی اور ہندوستان میں دُختر کُشی کے علاوہ پتھر کی مورتیوں کے آگے انسانی جانوں کی قربانیاں دی جاتی تھیں اور بیوہ عورتوں کو اپنے مُردہ شوہروں کے ساتھ جلنا پڑتا تھا۔ اس وقت صرف اسلام ہی تھا جس نے یہ بتایا کہ مساوات اور امن و امان سے رہنے کے طریقے کیا ہیں۔ وہ قرطبہ، غرناطہ، بغداد اور دمشق کی اسلامی درس گاہیں ہی تو تھیں جہاں یورپ اور دُنیا کے دوسرے ممالک سے آکر لوگ اخلاقِ حسنہ اور تہذیب و شرافت کے معنے سیکھتے تھے۔ ایک موٹی عقل کا آدمی بھی سمجھ سکتا ہے کہ جب صرف اسلامی تہذیب کا آفتاب نصف النہار پر تھا اس وقت علم و اخلاق کی روشنی سوائے اسلامی ممالک کے اور کہیں سے حاصل ہو ہی نہ سکتی تھی۔ اِس لیے آج جو کچھ بھی کسی قوم کے پاس ہے اس کا منبع صرف اسلام ہی کا سرچشمہ ہے۔ الغرض رسول خداؐ کی تمام بزرگی اور بڑائی یہ ہے کہ حضورؐ کے اسوۂ حسنہ اور حضورؐ کی تعلیم سے وہ اخلاق پیدا ہوا جس نے آج دُنیا کو تمدنی ارتقاء کے موجودہ مقام تک پہنچایا۔ ہمارا اپنا ایمان وعقیدہ تو یہ ہے کہ دُنیا میں جتنے انسان اب تک پیدا ہوئے، اب موجود ہیں یا قیامت تک پیدا ہوں گے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تمام خوبیوں میں اُن سب سے بدرجہا افضل و اکرم ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں

یہ کہنا بلا مبالغہ درست ہے کہ

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

کیا یہ بات حضورؐ کی بڑائی اور عظمت کے لیے کافی نہیں جو حضورؐ کو خدا ہی مانا جائے اور اس کے لیے طرح طرح کی تاویلیں کی جائیں اور قصے گھڑے جائیں۔ جو لوگ یہ عقیدہ رکھتے ہیں وہ اکثر کہا کرتے ہیں کہ ہم نے خدا کو حضورؐ ہی کے ذریعہ سے جانا ہے لہٰذا ہمارے لیے تو جو کچھ بھی ہیں حضورؐ ہی ہیں۔ اگر حضورؐ نہ ہوتے تو خدا کا تصوّر بھی نہ ہوتا۔ ہم اس بات کی صداقت کو سو فیصدی تسلیم کرتے ہیں لیکن اس کے یہ معنی ہر گز نہیں کہ آپ سبب کو مسبّب اور واسطہ کو مقصود ٹھہرالیں۔ اے رسول اللہؐ کی محبت کے دعویٰ دار و سچی محبت کا تقاضا تو یہ ہے کہ محبوب کا حکم آنکھ بند کر کے مانا جائے۔ پھر بتاؤ کہ جب قدم قدم پر حضورؐ نے اپنے عبد ہونے کا اقرار کیا ہے تو تم اُن کو کسی حیثیت سے بھی اللہ تعالیٰ کا شریک کس طرح ٹھیرا سکتے ہو۔ اگر تم ایسا کرتے ہو تو اسلام یا بانیٔ اسلام کی کوئی خدمت نہیں بجالاتے بلکہ اپنے محبوبؐ کی حکم عدولی کے ساتھ ساتھ اسلام کو نقصان پہنچاتے، دوسری قوموں میں مسلمانوں کو ذلیل کرتے اور خدا و رسولؐ کی ہنسی اڑواتے ہو۔

غیر مسلم اقوام میں اسلام کی تبلیغ کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے، لیکن آج کل کی دُنیا میں محض معجزات و کرامات اور خوارق عادات بیان کر کے دوسروں کو مسلمان کرنے کی کوشش کرنے سے کوئی فائدہ مترتّب نہیں ہوسکتا، ایسی باتوں سے آج کے متمدّن اور دانش مند لوگ اسلام کی طرف مائل نہیں ہوسکتے بلکہ نفرت کرنے لگتے ہیں۔ یاد رکھو کہ آج سائنس کی اس ترقی کے باوجود یورپ و امریکہ کو تسکینِ روحانی اور عالمی امن و امان کے لیے ٹھوس اور قطعی اُصولوں کی سخت تلاش اور جستجو ہے۔ تمہیں چاہیے کہ قرآن کی تعلیم اور رسول اللہؐ کے اسوۂ حسنہ سے یہ اُصول ان کے سامنے پیش کرو۔ دیکھو! زمانہ بدلتا رہا ہے، بدل رہا ہے، بدلتا

رہے گا۔ معاشرت بدلے گی، معیشت کے طریقے بدلیں گے، خیالات میں تبدیلی آئے گی، افکار میں تغیر ہوگا لیکن جہاں تک دنیا میں امن و آسائش سے زندگی گزارنے کا سوال ہے قرآن قیامت تک نوع انسان کو صحیح طریقے بتاتا اور صراط مستقیم دکھاتا رہے گا۔ اے رسول اللہؐ کی محبت و وراثت کے دعویدار و نئی شاہراہوں پر بھی قرآن کی سرچ لائٹ ڈالو تا کہ سائنس کے دیوانوں اور ماہ و مشتری کے مسافروں کو اس روشنی میں اپنا راستہ نظر آجائے اور وہ بھی محمدؐ کی غلامی کا حلقہ اپنے کان میں ڈال لیں۔

رسول اللہؐ کے بعد صحابہؓ کی باری ہے، لیکن صحابیوں میں صرف حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہٗ کی ذاتِ بہجت آیات ہی ایسی ہے جن کو بہت سے مسلمان خدا کی طرح حاضر و ناظر، قادر و قیوم، اور قاضیِ الحاجات مانتے ہیں اور نصیری تو سچ مچ خدا ہی جانتے ہیں۔ نہ معلوم ان مسلمانوں کو انسانوں کے خدا بنانے میں کیا مزہ آتا ہے ورنہ کیا حضور شیرِ خداؓ کی بزرگی اور بڑائی کے لیے یہ حقائق کافی نہیں کہ آپ بچوں میں سب سے پہلے مسلمان، رسولِ خداؐ کے سب سے عزیز صحابی، مددگار، دوست اور داماد تھے۔ کیا آپ کی عزت و مکرمت کے لیے یہ کچھ کم ہے کہ آپ دُنیا کے سب سے بہادر سپاہی، لشکرِ رسولؐ کے سب سے جری مجاہد اور اسلام کے سب سے بڑے فدائی تھے۔ کیا آپ کی فضیلت و رفعت کے لیے یہ ناکافی ہے کہ آپ سب سے پکّے زاہد، عابد، صالح، متّقی، اخلاق محمدیؐ کا مکمّل نمونہ اور آنحضورؐ کے تمام علوم ظاہری و باطنی کے حامل اور قاسم ہیں۔

صحابہ کے بعد ائمۂ کرام ہیں، ان قدسی صفات بزرگوں میں سب سے زیادہ قابلِ ذکر ہستی جناب سیدنا امام حسینؓ کی ہے، جن کے متعلق بے شمار مسلمان وہی عقائد رکھتے ہیں جو اوپر رسول اکرمؐ اور علیؓ معظمؓ کے ضمن میں بیان ہوئے۔ دل چاہتا تھا کہ حضورؓ کی تعریف میں کچھ لکھا جائے لیکن بخدا جس قدر آپ کے اخلاق و کردار پر غور کیا، دماغ کو مفلوج، قوّتِ

بیان کو لنگ اور زبانِ قلم کو گنگ پایا اور ان چار مصرعوں سے بہتر مضمون سمجھ میں نہ آیا جو حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے آپ کی شان میں تحریر فرمائے ہیں۔

شاہ است حسین بادشاہ است حسین
دین است حسین ، دین پناہ است حسین
سرداد ، نداد دست در دستِ یزید
حقّا کہ بنائے لاالہ است حسین

کون حسینؓ؟ وہ کہ جہاں اس کے پدر بزرگوار نے دَورِ اول میں ذوالفقارِ تابدار سے فتنۂ ارتداد کا سر قلم کر کے قصرِ اسلام کی بُنیادیں محکم کی تھیں، وہاں دَورِ ثانی میں اس نے خود اپنا سر قلم کرا کے اسلام کی گرتی ہوئی عمارت کو تھام لیا۔ ہاں وہی حسینؓ جس کی یادگار میں ہم ہر سال محرّم کے عشرۂ اوّل میں سوگ مناتے ہیں۔

محرّم میں کیا ہوتا ہے؟ تعزیے بنائے جاتے ہیں۔ سبیلیں لگائی جاتی ہیں۔ مہندی اور ذوالجناح وغیرہ کے جلوس نکالے جاتے ہیں۔ مجالسِ عزا قائم کی جاتی ہیں، جن میں بہت تھوڑا سا کردار حسینؓ اور بہت زیادہ واقعاتِ کربلا بیان کیے جاتے ہیں۔ عزا خواں خود بھی روتے ہیں، اوروں کو بھی رُلاتے ہیں، ماتم ہوتا ہے، شیعہ بھائی تیرہ دن تک سیاہ کپڑے پہنتے ہیں، بھوکے پیاسے، برہنہ سر اور برہنہ پا رہتے اور زمین پر سوتے ہیں۔ دسویں کی رات اور دن میں تعزیوں کے جلوس نکلتے ہیں جن کے ساتھ مرثیہ خواں مرثیے اور سوز پڑھتے ہیں۔ ماتم کرنے والے ماتم کرتے ہیں اور بعض لوگ زنجیروں سے سینہ کوبی کر کے لہولہان ہو جاتے ہیں۔ پٹا، بنوٹ اور گتکے کے اکھاڑوں میں ماہرین اپنا اپنا ہنر دکھاتے ہیں، منتیں ماننے والے منّتیں مانتے اور تعزیوں پر نذریں اور مٹھائیاں چڑھاتے ہیں۔ منّتوں کی نشانیوں میں کپڑوں کی دھجیاں اور کلاوے باندھے جاتے اور جناب امامؑ سے براہِ راست درخواستیں کی

جاتی ہیں کہ ہماری فلاں منت پوری ہوگئی تو آئندہ سال فلاں چیز تعزیہ پر چڑھائی جائے گی۔ الغرض بڑا بھاری میلہ ہوتا ہے جس میں صرف چند آنکھیں اشک بار اور چند دل سوگوار ہوتے ہیں، باقی سب دُنیا خوش وخرم نظر آتی ہے۔ لوگ ہنستے ہیں، قہقہے لگاتے ہیں، تحفے خریدتے ہیں، مٹھائیاں کھاتے ہیں، سگریٹ کے دھوئیں اڑاتے اور تماشہ دیکھ کر اپنے اپنے گھر چلے جاتے ہیں۔

ان باتوں کے علاوہ ہماری آنکھوں نے ہندوستان علی الخصوص جنوبی ہند کے اکثر شہروں اور قصبوں میں یہ بھی دیکھا ہے کہ تعزیوں کے ساتھ رنڈیاں اور لونڈے ناچتے اور نہایت بازاری اور فحش گیت بھی گاتے ہیں۔ لوگ شراب پی کر آتے اور رنگ رلیاں مناتے ہیں۔ پہلی ہی تاریخ سے کچھ لوگ شیر بنتے ہیں یعنی صرف ایک لنگوٹ باندھ کر سارے بدن پر زرد پینٹ ملتے ہیں، اس پر کالی دھاریاں بناتے ہیں، منہ پر شیر کا مقوّہ اور پیچھے ایک دم لگاتے ہیں۔ دونوں ہاتھوں میں ہرن کا ایک ایک سینگ پکڑتے اور پینترے بدل بدل کر کچھ ناچتے اور کچھ تھرکتے تمام بازاروں میں دن بھر گھومتے پھرتے ہیں۔ ان کے پیچھے ایک تاشہ والا تاشہ بجاتا ہے، یہ شیر جس حلوائی یا شراب والے کی دکان پر جاتے ہیں وہی ان کو مٹھائی اور شراب مفت پیش کرتا ہے۔ ہم نے وہاں کے عوام سے پوچھا کہ یہ کیا بات ہے؟ تو ہم کو بتایا گیا کہ ان آدمیوں کے اندر ولی گھس گئے ہیں۔ دسویں کے جلوس میں طرح طرح کے سوانگ رچائے اور تماشے دکھائے جاتے ہیں، لوگ عمدہ عمدہ لباس پہنتے اور ٹھاٹھ سے میلے میں جاتے ہیں، شاگرد پیشہ چپراسی اور چٹھی رساں انعام طلب کرتے ہیں۔ اگر ان سے پوچھو کہ کیسا انعام تو کہتے ہیں کہ کیا آج بڑی عید نہیں ہے؟ **اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ لَا حَوْلَ وَ لَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمِ**

ہم پوچھتے ہیں کہ اس پچھلی خرافات سے قطع نظر کر کے جو کچھ پہلے بیان کیا گیا ہے اگر

اس میں سے سب باتیں بلا استثناء صحیح اور درست بلکہ ثواب عظیم ہوں تو بھی اے علیؓ اور حسینؓ کے عاشقو! کیا یہی ایک طریقہ ہے اس شہیدِ اعظم کا سوگ اور اس ''ذبحِ عظیم'' کی یادگار منانے کا۔ اگر تمہاری سمجھ میں اس سے بہتر اور کوئی طریقہ نہیں آتا تو پھر کم سے کم اسی کو قاعدے اور قرینے سے مناؤ۔ یہ محرّم کے میلے کیا ہوتے ہیں؟ ایک اژدہام بے ہنگام ہوتا ہے، نہ کوئی تنظیم ہوتی ہے نہ انتظام۔ ان میلوں سے فائدہ اٹھاؤ، ان میں سید الشہداء کے کردار اور اس شہادتِ عظمٰی کے مقصد کی تبلیغ کراؤ اور مسلمانوں کو اسلام کے دفاع میں مرنا سکھاؤ۔ مرثیہ اور سوزخوانی ہو یا بینڈ باجوں پر نوحہ سرائی، پٹا بازی ہو یا ماتم آرائی جو کچھ بھی ہو قاعدے، قرینے اور ضبط و نظم کے ساتھ شاندار طریقے پر ہو۔ تربیت یافتہ رضا کاروں کے فوج در فوج دستے ہوں، ایک سی وردی، ایک سے پٹکے ہوں، وہی سب کام اور میلے کے انتظام و اہتمام کو خوبی و تندہی سے انجام دیں۔ متمدّن قوموں کے میلوں اور ضبط و نظم سے کچھ سبق لو اور غیر قوموں کی نظر میں اپنی اور اسلام کی سُبکی نہ کراؤ۔ تم اگر اتنا بھی کرلو تو بہت ہے، لیکن سچ پوچھو تو جس کارنامۂ اعظم کی تم یادگار منانا چاہتے ہو اس کے لحاظ سے تو یہ سب کچھ بھی ایک طفلانہ عقیدت مندی سے زیادہ کچھ بھی نہیں۔

کیا حسینؓ نے اسی لیے جان دی تھی اور سجدے میں سر کو اسی لیے کٹایا تھا کہ ہر سال محرّم کے دس بارہ دن تم تعزیہ سازی، مرثیہ گوئی اور سینہ کوبی کرو، بھوکے پیاسے رہو اور چند آنسو بہا کر سال بھر کے لیے خاموش بیٹھ جاؤ اور بس۔ اگر تمہارے خیال میں یہی کافی ہے تو پھر تم نہ اس شہیدِ اعظم کی عظمت کو سمجھے ہو نہ اس شہادتِ عظمٰی کے مقصد کو۔ کیا تم اتنا بھی نہیں جانتے کہ حسینؓ نے سر کٹایا تھا صرف تعلیمِ قرآن کی بقاء اور اپنے مقتدر نانا محمد عربیؐ کے اسوۂ حسنہ کو رہتی دُنیا تک برقرار رکھنے کے لیے۔ اگر یہ صحیح ہے اور یقیناً صحیح ہے تو اس کارنامۂ عظیم کی یادگار کا مقصد بھی یہی اور صرف یہی ہونا چاہیئے۔ کیا تمہارے خیال میں آج اسلام

خطرات سے گِھرا ہوا نہیں ہے اور کیا اس کی حفاظت و بقا کے لیے آج پھر اُسی قربانی کی ضرورت نہیں جو حسینؓ نے پیش کی تھی اور کیا آج پھر اسی راہ پر گامزن ہونا فرض نہیں ہو گیا ہے جس پر سے کل حسینؓ گزرا تھا۔

آج اسلام کو دو خطرے ہیں، ایک خارجی اور ایک داخلی۔ خارجی خطرہ یہ ہے کہ چاروں طرف ایسی قومیں آباد ہیں جو تم سے بدرجہا طاقتور اور ترقی یافتہ ہیں۔ ان قوموں کے پاس علم و دولت ہے، اتّحاد و محبت ہے، حرکت و عمل ہے، جنگی ساز و سامان سے آراستہ فوجیں ہیں، پانی میں چلنے والے جہاز اور آبدوزیں ہیں، ہوا میں اڑنے والے طیارے اور راکٹ ہیں، آگ برسانے والی توپیں ہیں، تباہ کرنے والے ایٹم اور ہائیڈروجن بم ہیں۔ کیا تم نہیں جانتے کہ زندگی اور اقتدار صرف طاقت کا نام ہے؟ جس کی لاٹھی اس کی بھینس والی مثل غلط نہیں۔ دُنیا میں یہی ہوتا آیا ہے، یہی ہوتا رہے گا۔ بڑی مچھلیاں چھوٹی مچھلیوں کو کھاتی رہیں گی، طاقتور قومیں کمزور قوموں کو غلام بناتی رہیں گی۔ ان قوموں نے اگر تم کو چھوڑ رکھا ہے تو کسی مصلحت اور باہمی عناد و رقابت کی وجہ سے۔ داخلی خطرہ یہ ہے کہ تمہارے پاس علم و دولت ہے نہ اتّحاد و محبت، صبر و استقلال ہے نہ حرکت و عمل، ایمان کی طاقت ہے نہ اخلاق کی قوّت، اور سب سے زیادہ یہ کہ تمہیں اپنی ان کوتاہیوں اور کمزوریوں کا صحیح علم ہے نہ احساس اور اس کمزوری و ناطاقتی کو دُور کرنے کی کوئی کوشش و پرواہ ہے نہ علاج اور دوا۔

تمہارے پاس ایک کتاب ہے سب سے بڑے حکیم کی تصنیف لیکن تمہاری بے پروائی کی یہ حالت ہے کہ اس کی طرف دیکھتے تک نہیں۔ تمہارے تساہل کی یہ کیفیت ہے کہ کسی نسخے کو آزماتے تک نہیں۔ یہ باتیں جب مسلمانوں سے کہی جاتی ہیں تو وہ جواب دیتے ہیں ''ارے میاں اسلام تباہ نہیں ہوسکتا، یہ اللہ کا اپنا دین ہے قیامت تک رہے گا۔ اگر موجودہ سب مسلمان بھی فنا ہو جائیں تو اللہ کسی اور قوم کو مسلمان کر دے گا جو اسلام کا چراغ روشن

رکھے گی'' مطلب یہ کہ ہم بلا سے مارڈالے جائیں، تباہ ہو جائیں، ہمارے بچے، ہماری بہو بیٹیاں اور بہنیں نسلاً بعد نسل کفر و شرک کی زندگی بسر کریں مگر ہم اپنی خامیوں کو رفع اور دُنیا میں عزت وعظمت کی زندگی بسر کرنے کے لیے ٹس سے مس نہ ہوں گے۔قرآنی تعلیم ہچکیاں لے رہی ہے تو لیتی رہے اور محمدی اخلاق دم توڑ رہا ہے تو توڑا کرے۔ایسے مسلمانوں سے تو ہم کیا کہیں لیکن اگر کوئی سننے کو تیار ہے تو سنے کہ حسینؓ نے ان تمام بیماریوں کا علاج یہی بتایا تھا کہ اگر قوم پر کوئی وقت ایسا پڑے جب کوئی دوا با اثر اور کوئی نسخہ کارگر نہ ہو تو اس وقت صرف یہی علاج ہے کہ اپنی جانوں کی قربانی دو اور شجرِ اسلام کو اپنے خون سے سینچو۔اے مسلمانو! اگر تم حسینؓ کے عاشق ہو اور اس کے شایانِ شان یادگار منانا چاہتے ہو تو اٹّھو اور اسلام کو بچانے کے لیے اپنی جانوں کی قربانی دے ڈالو۔ہمارا یہ مطلب نہیں کہ بلا وجہ جہاد کر دو اور مسلمانوں کے گرد و پیش جتنی غیر مسلم قوّتیں راج کر رہی ہیں ان پر چڑھ دوڑو۔یہ بات تو خدا اور رسول کے حکم اور تعلیمِ قرآنی کے خلاف ہے۔جہاد تو صرف وطن وملّت کی مدافعت میں جان دینے کا نام ہے۔اللہ کی راہ میں جان دینے کا صرف یہی ایک طریقہ نہیں اور بھی طریقے ہیں۔کیا یہ طریقہ کچھ کم ہے کہ قوم کو بوقت ضرورت مدافعت کی غرض سے تیار کرنے کے لیے اپنی جانوں کو وقف کر دو، اپنا آسائش وآرام تج دو، اپنے عشرت کدوں سے باہر آجاؤ، مرغن اور لذیذ غذائیں ترک کر دو، خدم و حشم کو تیاگ دو، ملبوساتِ فاخرہ اتار ڈالو، مسافرانہ اور سپاہیانہ زندگی اختیار کرو۔سادہ کھاؤ، سادہ پہنو، اپنا روپیہ اور دولت سامانِ حرب کی فیکٹریاں کھولنے اور ایٹم اور ہائیڈروجن بم بنانے میں صرف کر دو اور کام کرو قوم کی اصلاح و فلاح اور تنظیم کے لیے، کوشش کرو مسلمانوں میں اخلاق اور ایمان وعمل کی روح پھونکنے کے لیے، جانیں لڑا دو آپس کے فرقہ وارانہ اور طفلانہ اختلافات مٹانے کے لیے۔ ہاں اٹّھو اور کام کرو۔ان مقاصدِ عالیہ کے لیے اپنی جانوں کو گُھلا دو، اپنی روحوں کو پگھلا دو،

اپنی ہستی کو مٹا دو اور کام کرتے رہو، کرتے رہو، یہاں تک کہ اسلام اور مسلمان پھر اپنا کھویا ہوا مقام حاصل کرلیں اور ملّتِ اسلامیہ پھر ایک ایسی ''بُنیانٌ مرصوص'' بن جائے کہ جو اس سے ٹکرائے پاش پاش ہو کے رہ جائے۔ مسلمانو! شہادتِ حسینؓ کی یادگار منانی ہے تو اس طرح مناؤ۔ کیا تم حسینؓ کے پیغامِ شہادت کی تعمیل میں اتحادِ اسلام کے لیے اتنا کچھ بھی نہیں کر سکتے جتنا پچھلی تحریک میں بھارت کے ہندوؤں نے گاندھی کے مرن برت سے متاثر ہو کر انگریز جیسی جابر و قاہر قوم کے خلاف متحد ہو کر دکھایا؟

آئمۂ عظام کے بعد اولیائے کرام کا نمبر ہے۔ ہم ان کی بابت کیا لکھیں، ماشاءاللہ زندہ اور مُردہ لاکھوں اور کروڑوں ہی ہیں اور ان میں سے ہر ایک کو ''اربابٌ من دون اللّٰہ'' میں کا ایک رب بنا دیا گیا ہے۔ ان بزرگانِ دین میں سب سے زیادہ قابلِ ذکر ذاتِ ستودہ صفات جناب حضرت سیّد شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی ہے جن کو لوگ ''بڑے پیر'' یا ''غوث الاعظم دستگیر'' کے نام سے پکارتے اور سمجھتے ہیں کہ یہ لوگوں کی بگڑی بنا سکتے اور اللہ کی طرف سے نازل کی ہوئی مصیبتوں کو ٹال سکتے ہیں۔ یہ لوگ اٹھتے بیٹھتے ہر وقت یا غوث الاعظم دستگیر کے نعرے لگاتے ہیں اور کبھی بھول کر بھی اللہ کا لفظ زبان پر نہیں لاتے۔ اب اگر آپؒ کی زندگی اور تعلیم کا مطالعہ اور تحقیق کی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ آپ دُنیا کے تمام اولیاء میں سب ہی سے زیادہ متقی، پرہیزگار اور کتاب و سنّت کے پابند تھے اور آپ کی بزرگی و بڑائی ہرگز اس میں نہ تھی کہ آپ سفید کو سیاہ اور سیاہ کو سفید کر دکھاتے، لوگوں کی مرادیں برلاتے، غریبوں کو امیر بناتے، بے اولادوں کو اولاد عطاء کرتے، بیماروں کو شفا دیتے، مُردوں کو زندہ کرتے یا بارہ برس کی ڈوبی ہوئی روایتی ناؤ نکال کر دکھا دیتے تھے، بلکہ آپ کی ساری عظمت و شان اس بات میں مضمر ہے کہ ساری عمر کوئی فعل آپ سے خلافِ سنّت سرزد نہیں ہوا، نہ کوئی قول خلافِ شریعت آپ کی زبانِ مبارک سے نکلا۔ آپ کی کتابیں فتوحُ الغیب اور غُنیۃ الطّالبین موجود ہیں،

اٹھا کر دیکھ لیجیے، ایک ایک لفظ قرآن اور سنت کے انشراح اور اتباع میں ہے۔

ان سب سالکانِ راہِ خدا کی بڑائی اور بزرگی مسلّم، لیکن کیا اس بزرگی کو ماننے کا صرف یہی طریقہ ہے کہ ان کو خدا یا خدا کا شریک ٹھیرایا جائے، ان کی قبروں پر سجدے کیے جائیں، چادریں اور نذرانے چڑھائے جائیں، مَنّتوں کے چلّے باندھے جائیں، رزق طلب کیا جائے، اُن کے مزاروں پر لکھی ہوئی عرضیاں پیش کی جائیں، مرد اُن کے مزار کی خاک کو حرزِ بازو بنائیں اور عورتیں استقرارِ حمل کے لیے پیٹ ننگا کر کے ان کی قبروں سے ملیں۔ شرم کرو اے اسلام کے دعویدارو کچھ تو شرم کرو۔ مانا کہ انہوں نے زندگی میں بڑی کرامتیں دکھائیں، فقیروں کو بادشاہ بنا دیا، بیماروں کو پھونک مار کر اچھا کیا اور مُردوں کو ٹھوکر مار کر اٹھا بٹھایا، لیکن کیا باوجود اس کے بھی وہ اس قابل ہیں کہ ان کو خدا مانا جائے اور خدائے برتر و توانا کو بھلا دیا جائے جس نے اُن کو یہ بزرگی اور کرامات عطا کی تھیں۔ ان بزرگانِ دین کی بزرگی اور بڑائی ماننے اور اس کی قدر کرنے کا طریقہ تو یہ ہے کہ ان کے اخلاق و کردار کی تقلید میں نیکی اختیار کرو، بُرائیوں سے بچو، شریعت پر چلو اور جس طرح انہوں نے ''صرف ایک خدا'' کے عشق و محبت میں یہ مراتب حاصل کیے، تم بھی وہی مراتب حاصل کر کے مسلمانوں کی اصلاح و فلاح کے لیے کام کرو۔ توحید کا ڈنکا بجاؤ، رسالت کا پیغام سناؤ، کفر و شرک سے لوگوں کو بچاؤ اور تعلیمِ قرآن کی روشنی اور معرفت و حقیقت کے باطنی نور سے مسلمانوں کے ظلمت کدوں کو جگمگا دو اور اُن کے سینوں کو منوّر بنا دو۔

کشف و کرامات بلاشبہ بڑی چیز ہیں۔ یہ ولایت اور بزرگی کی نشانیاں اور ثبوت ہیں، لیکن ان کی وجہ سے کسی کو خدا یا خدا کا شریک ماننا کس طرح جائز ہو سکتا ہے۔ کشف میں کیا ہوتا ہے؟ یہی کہ آئندہ کے کچھ واقعات معلوم ہو جاتے ہیں۔ لیکن اگر کسی کو یہ معلوم بھی ہو جائے کہ مجھ پر یا فلاں آدمی پر فلاں مصیبت آنے والی ہے یا فلاں وقت میری یا کسی کی موت

واقع ہونی ہے تو کوئی رسول یا ولی اللہ اس مصیبت یا موت کو ٹال تو نہیں سکتا تو پھر ایسے کشف سے سوائے رنج واندوہ کے اور کیا فائدہ ہے؟ اسی طرح کرامات میں کسی بزرگ سے کوئی بات عجیب وغریب سرزد ہوتی ہے۔ لیکن جتنے بزرگ گزرے ہیں اور اب موجود ہیں وہ سب یہی کہتے ہیں کہ ایسی باتیں محض اللہ کے حکم سے ایک ایسی بے خودی اور خود رفتگی کے عالم میں سرزد ہوتی ہیں جب ہم کو خود نہیں معلوم ہوتا کہ ہم کیا کہہ رہے ہیں یا کر رہے ہیں۔ تو اے کشف وکرامات کی وجہ سے اولیاء اللہ کو ''اربابٌ من دون اللہ'' سمجھنے والو! تم خود اس خدائے قادر وقیوم کو کیوں نہیں مانتے اور مصیبتوں کے وقت خود اسی کو کیوں نہیں یاد کرتے جس نے اولیاء اللہ کو بزرگی عطاء فرمائی ہے۔ یہ خدا اگر چاہے تو بے شک تمہاری آنے والی مصیبتوں کو دُور کر سکتا ہے اور اگر تم کسی کو محض کرامات ہی کی وجہ سے قادر وتوانا مانتے ہو تو پھر سورج کی پرستش کرو جو دُنیا کا سب سے بڑا کراماتی ہے۔ یہ سورج تمہاری زمین کو روشنی اور حرارت پہنچاتا ہے جس سے زندگی قائم ہے، یہ تمہارے سمندروں سے پانی بھاپ بنا کر اُڑاتا ہے جس کی وجہ سے بارش ہوتی ہے اور تمہارا رزق پیدا ہوتا ہے۔ اگر سورج نہ ہو تو کوئی جاندار بھی اس زمین پر زندہ نہیں رہ سکتا۔ پس اگر کرامتوں اور فائدہ وفیض رسانی ہی پر کسی کے ماننے یا نہ ماننے کا انحصار ہے پھر سورج کو مانو اور اس کی پرستش کرو۔ اولیاء اللہ سورج کے مقابلے میں ذرّہ برابر بھی فائدہ نہیں پہنچا سکتے۔ بے انتہا لوگ سورج کی اسی وجہ سے پرستش کرتے رہے ہیں اور اب بھی کرتے ہیں۔ لیکن تھوڑی سی عقل والے بھی جانتے ہیں کہ سورج خود مخلوق ہے۔ اس میں یہ حرارت اور روشنی بھی اللہ تعالیٰ ہی کی پیدا کی ہوئی ہے۔ انسان کو تو اپنے اعمال وافعال پر کافی اختیار ہے لیکن سورج تو محض مجبور ہے جو کام اس کے سپُرد ہیں، مجال ہے کہ اُن سے ایک بال برابر بھی روگردانی کر سکے۔ تو اے بھلے لوگو! تم صرف اس خدا کو کیوں نہیں مانتے جس نے حیات آفرینی کی یہ مشین یعنی یہ سورج پیدا کیا ہے اور جو

سورۂ یٰسین میں اس سورج کی بابت فرماتا ہے۔

وَالشَّمْسُ تَجْرِیْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ذٰلِكَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ (یٰسین:۳۸)

پچھلے بیانات سے یہ تو سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ مسلمانوں کی تعدادِ کثیر نے کس کس طرح ''ایک اللہ'' کو چھوڑ کر اپنے لیے بے شمار ''اربابٌ من دون اللہ'' پیدا کر لیے اور توحید کے عقیدے اور توحید پرستی کے کس طرح ٹکڑے اڑا دئے۔ اب یہ بتانا ہے کہ باوجود ان تمام باتوں کے اب بھی چالیس پچاس فیصدی مسلمان ایسے رہ گئے تھے جو صرف ایک اللہ کو مانتے اور اسی پر ایمان رکھتے تھے خواہ وہ ایمان کتنا ہی کمزور کیوں نہ تھا، لیکن اربابِ زمانہ نے توحید کے عقیدہ کو مٹانے میں صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا، ابھی ایک قیامت اور آنے والی تھی، ایک طوفان اور اٹھنے والا تھا۔ یہ طوفان عشق الٰہی کے خاص دعویداروں اور معرفت وحقیقت کے سب سے بڑے علم برداروں کی خانقاہوں اور عُزلت کدوں سے اٹھا اور عقیدۂ توحید کی جو کچھ دھجیاں باقی رہ گئی تھیں ان کو بھی پارہ پارہ کر گیا۔ یہ تھا صوفیوں کا عقیدہ ''وحدت الوجود'' یا ''ہمہ اوست''۔

ہم مانتے ہیں کہ اس عقیدے کے مبلّغوں میں چند بڑے بزرگ اور ولی اللہ بھی تھے اور ان کی نیتیں انتہائی نیک اور پاک تھیں۔ ان پر جو کیفیتیں اپنے سلوک وسیر میں طاری ہوئیں وہ انہوں نے جن الفاظ میں بھی ہو سکا آگے آنے والے سالکوں کی معلومات اور افادے کے لیے قلم بند کر دیں۔ لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ یہ بات جب حقیقی اہل اللہ کے حلقہ سے نکل کر جاہل اور جھوٹے صوفیوں کے کان میں پڑی اور ان سے عوام تک پہنچی تو ان پر اُس کا یہ اثر ہوا کہ وہ کائنات کے ذرّہ ذرّہ کو خدا سمجھ بیٹھے۔ عقیدۂ توحید پر یہ چوٹ بہت زبردست تھی وہ اس کو نہ سنبھال سکا۔ یعنی اب تک تو چند ہستیاں ہی اللہ کی شریک گردانی جاتی تھیں اب کائنات کی ہر چیز خدا بن گئی (استغفر اللہ)۔ لیکن الحمدللہ کہ علماء، فقراء

اورعوام میں آج بھی دس بیس فیصدی لوگ ایسے ہیں جوصرف اللہ پر ایمان رکھتے ہیں، مگر افسوس کہ ان میں سے بھی زیادہ کا ایمان اس قدر محکم نہیں جس قدر کہ ہونا چاہیئے۔ اگر موٴحّدین کی اس قلیل تعداد کو بھی اللہ پر ایمانِ کامل اور یقینِ محکم ہوتا تو یہی جماعت تمام دُنیا کے مسلمانوں کو اٹھانے اور صحیح راستے پر چلانے میں کامیاب ہوسکتی تھی۔ ''ہمہ اوست'' کا مکمّل بیان ہم آگے کریں گے اور بتائیں گے کہ یہ حقیقت نہیں صرف ایک کیفیت ہے جو عملی سلوک میں ایک خاص مقام پر سالکینِ راہِ خدا میں سے کسی کسی پر طاری ہوتی ہے اور وہ غلطی سے اس کو حقیقت سمجھ بیٹھتے ہیں۔

الغرض یہ حشر ہوا اس عقیدۂ توحید کا جو مسلمانوں کے دین کی اساس، ان کی جماعتی شیرازہ بندی کی بُنیاد اور اجتماعی طاقت کا اصل راز تھا۔ اب تھوڑا سا حال اتّحاد کا سنئے:۔

اتّحاد:

معلوم نہیں خدا کی کیا مصلحت تھی کہ اسلام کے ساتھ ہی منافقوں کو بھی پیدا کر دیا۔ یہ منافق ابتداء ہی سے مسلمانوں کو آپس میں لڑانے اور ان کی اجتماعی قوّت کو کمزور کرنے میں کوشاں رہے۔ حضرت عمرؓ کی خلافت تک تو ان کا بس نہ چلا لیکن حضرت عثمانؓ کی نرمیٔ مزاج سے انہوں نے بہت فائدہ اٹھایا۔ حضرت عثمانؓ کی شہادت، حضرت علیؓ سے حضرت عائشہؓ اور امیر معاویہؓ کی لڑائیاں اور حضرت امام حسینؓ کی شہادت اِنہی منافقوں کی شرارتوں کا نتیجہ تھی۔ حضرت علیؓ کے زمانہ ہی میں مسلمان دو تین فرقوں میں تقسیم ہو چکے تھے اگرچہ یہ اختلافات زیادہ نمایاں اور موٴثر نہ تھے، لیکن شہادتِ امامؓ کے بعد تو ملّتِ اسلامیہ اعلانیہ کئی فرقوں میں تقسیم ہوگئی۔ اس کے بعد اِن فرقوں کی تعداد ہمیشہ بڑھتی ہی رہی یہاں تک کہ بہتر (۷۲) سے بڑھ کر کئی سو تک پہنچ گئی۔ باوجود ازیں یہ حقیقت ہے کہ مسلمانوں کے یہ اختلافات ہرگز ہرگز اُصولی نہیں بلکہ محض فروعی ہیں۔ کیونکہ قرآن کریم، رسول اکرمؐ اور اللہ کو

سبھی مانتے ہیں۔ یہ اختلافات ان فرقوں کے بانیوں کے اُس اجتہادی اختلاف سے پیدا ہوئے جس کو سرورِ دو عالمؐ نے رحمت فرمایا ہے۔ لیکن یہاں یہ حالت ہے کہ تمام فرقوں کے مسلمان ایک دوسرے سے اس قدر بیگانہ اور دُور ہیں کہ آپس میں بات چیت کرنے اور پاس بٹھانے کے بھی روادار نہیں۔ حتیٰ کہ ایک فرقہ کا مسلمان دوسرے فرقے کی مسجد میں نماز تک ادا نہیں کرسکتا۔ ہم نے یہ مناظر بیسیوں مرتبہ بچشمِ خود دیکھے ہیں کہ اگر کوئی مسلمان کسی غیر فرقے کی مسجد میں بھول کر بھی چلا آیا تو اس کو گالیاں دی گئیں، بے عزت کیا گیا اور مار پیٹ کر نکال دیا گیا۔ اللہ تو قرآن میں فرماتا ہے کہ سب مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں، لیکن آج دو سگے بھائیوں میں بھی وہ محبت نہیں جو کسی زمانہ میں دو غیر ملکی اور اجنبی مسلمانوں میں ہوا کرتی تھی۔ ہم نے برسہا برس نہایت رنج واندوہ سے اس بات کا مطالعہ کیا ہے کہ ایک چار کمرے والے مکان میں چار مختلف ہندو خاندان نہایت سلوک اور محبت سے رہ سکتے ہیں لیکن ایک دس کمرے والی کوٹھی میں دو سگے مسلمان بھائی ہرگز نہیں رہ سکتے اور اگر وہ رہ بھی سکیں تو ان کی بیگمات تو یقیناً نہیں رہ سکتیں۔ ایک مکان تو کیا مسلمان تو ہمسایوں کے ساتھ بھی حسنِ سلوک سے نہیں رہتے۔ رسولِ خداؐ فرماتے ہیں کہ ''وہ شخص جنت میں داخل نہ ہوگا جس کا ہمسایہ اس کی بُرائیوں سے امن میں نہ ہو'' لیکن ہمارے معاشرے میں تو بہت کم ایسے خوش نصیب ہوں گے جو اپنے ہمسایوں کے شر سے امن میں ہوں۔ قرونِ اولیٰ کا تو ذکر ہی کیا۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے پچاس برس پہلے تک یہ بات تھی کہ جب کوئی ہندو سفر پر جاتا تو اپنے بیوی بچوں اور مال و دولت کو ہندو کی بجائے کسی مسلمان پڑوسی کے سپُرد کرکے جانا بہتر سمجھتا تھا۔ لیکن بعد میں یہ کایا پلٹی کہ آج کوئی غیر مسلم اپنے محلّہ میں کسی مسلمان کو کرایہ پر مکان دینا بھی گوارا نہیں کرتا۔

مسلمانوں کا افتراق مذہبی فرقہ بندی تک ہی محدود نہیں بلکہ اس کی اور بھی کئی شقیں ہیں

مثلاً نسلی، وطنی، قومی، لسانی، اور سیاسی وغیرہ۔ عربی، مصری، افریقی، ترکی، ایرانی، عراقی، افغانستانی اور پاکستانی سبھی اپنے آپ کو دوسروں سے افضل اور بہتر سمجھتے ہیں اوران میں اپنائیت کا وہ جذبہ ہرگز موجود نہیں جو قرآن پیدا کرنا چاہتا ہے اور یہ بات انگریز کی تبلیغِ قومیت پرستی سے پیدا ہوئی ہے۔ اپنے وطن سے محبت کرنا تو بہت سعید جذبہ ہے لیکن دوسرے مُلک کے باشندوں کو کم تر یا ذلیل جاننا کہاں کی شرافت ہے، خصوصاً جب کہ وہ تمہارے اسلامی بھائی اور کلمے کے شریک ہوں۔ بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی، مصیبت تو یہ ہے کہ ایک ہی مُلک کے مختلف صوبوں اور علاقوں میں احساسِ کمتری و برتری بلکہ جذبۂ منافرت موجود ہے۔ پاکستان ہی کو لیجیے، تقسیم ہند کے بعد اس میں پانچ صوبے تھے جن میں سے اب چار صوبوں کو ملا کر مغربی پاکستان کی ایک وحدت بنا دی گئی ہے۔ لیکن باوجود اس کے بنگالی، پنجابی، سندھی، پختونی اور بلوچی کی باہمی نفرت اب بھی دُور نہیں ہوئی۔ اس منافرت کا بیان الفاظ میں تو ممکن نہیں۔ یہ مناظر دیکھنا اور باتیں سننا ہوں تو دفتروں میں جایئے اور بچشمِ خود ملاحظہ فرمایئے کہ وہاں کس قدر منظّم مخاصمت باہمد گر پائی جاتی ہے۔ چپراسی کی معمولی سی آسامی بھی خالی ہو تو ایک آگ بھڑک اٹھتی ہے۔ کلرک اور سپرنٹنڈنٹ ہی نہیں بلکہ بڑے سے بڑے افسروں تک کی کوشش یہی ہوتی ہے کہ یہ آسامی ان کے علاقے کے کسی آدمی کو ملے، بڑی بڑی آسامیوں کا تو ذکر ہی فضول ہے۔ عام طور پر ہر افسر یہ کوشش کرتا ہے کہ لائق اور جائز حق داروں کو محروم کر کے یہ آسامی اِس کے کسی رشتہ دار کو نہیں تو علاقہ کے آدمی ہی کو مل جائے خواہ وہ کتنا ہی نالائق اور جونیئر کیوں نہ ہو۔ علاوہ ازیں اکثر افسران اپنے غیر علاقائی ماتحتوں کو محض اِس لیے تنگ کرتے اور نالائق بنانے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں کہ وہ ترقی نہ کر سکیں۔ ہمارا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اِس کلیہ میں کوئی استثناء ہی نہیں ہے، بلاشبہ اچھے، نیک اور منصف مزاج افسروں کی بھی کمی نہیں لیکن عام حالت یہی ہے جو بیان ہوئی

اور یہ تمام چالیں اور شرارتیں وہی ہیں جو قبل تقسیم کے ہندوستان میں ہندو افسران مسلمان ماتحتوں کے ساتھ برتا کرتے تھے۔ کیا کسی قوم کے زندہ رہنے اور طاقتور بننے کے یہی آثار ہیں؟ دعویٰ تو یہ کیا جاتا ہے کہ تمام پاکستانی ایک قوم ہیں لیکن عملی ثبوت اِس کے خلاف دیا جاتا ہے۔

صوبجاتی اور علاقائی اختلافات سے زیادہ اندوہناک لسانی تعصب ہے۔ چنانچہ جب پاکستان میں ایک قومی اور سرکاری زبان بنانے کا خیال پیدا ہوا تو ایک قیامت برپا ہوگئی۔ مختلف صوبوں کے اکثر لوگ یہی چاہتے تھے کہ اِن کی زبان خواہ کسی قدر لچر پوچ اور کم مایہ کیوں نہ ہو، سرکاری زبان بنا دی جائے۔ یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے انگریزی زبان کو مُلک میں رائج رکھنے پر تو کبھی اعتراض نہیں کیا لیکن اُردو کا نام سنتے ہی چراغ پا ہوگئے۔ کوئی بیوقوف بھی تو اِس حقیقت سے انکار نہیں کرسکتا کہ اُردو ہی صرف ایک ایسی زبان ہے جو اگرچہ کسی بھی صوبے کی مقامی زبان نہیں لیکن تمام مُلک بلکہ بیرونِ مُلک بلا تکلّف بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ علاوہ ازیں اِس میں بہت سے علوم کا ترجمہ ہو چکا ہے اور یہ قدرتی استعداد بھی موجود ہے کہ باقی علوم کو بھی اپنے الفاظ کے دامن میں پرورش کرسکے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اِس کی نہج اسلامی ہے کیونکہ اِس میں عربی و فارسی ادب کا کافی حصّہ منتقل ہو چکا ہے، لیکن تعصب اور ہٹ دھرمی کا کیا علاج؟ یہاں ہم یہ اعتراف کیے بغیر نہیں رہ سکتے کہ پنجاب نے اُردو کے متعلق جس ایثار، فراخدلی اور خدمت کا ثبوت دیا ہے، پاکستان کا کوئی علاقہ اِس کی مثال پیش نہیں کرسکتا۔ برخلاف ازیں بنگال نے اِس معاملہ میں جس قدر تنگ دلی کا ثبوت دیا اِس پر تعجب ہوتا ہے۔ ہندو اُردو سے محض اِس لیے نفرت کرتے تھے کہ یہ فارسی اور عربی سے پیدا ہوئی ہے اور ایک اسلامی زبان ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ہمارے بنگالی مسلمان بھائیوں کو اِس سے کیوں نفرت ہے۔ بنگالی زبان کی اساس سنسکرت پر ہے، اِس کا سارا

لٹریچر ہندوانہ ہے، اِس کے بڑے بڑے مصنف سب ہندو ہیں۔ الغرض ہر لحاظ سے یہ ایک ہندو زبان ہے اور یہی وجہ ہے کہ بنگالی عوام کے کلچر میں ہندوئیت زیادہ اور اسلامیت کم ہے۔ زبان کے مسئلہ کا ایک سیدھا ساحل یہی ہے کہ ہر علاقہ میں وہاں کی علاقائی زبان کو پھلنے پھولنے کا موقعہ دیا جائے۔ لیکن سرکاری اور قومی زبان اُردو ہو جو انگریزی کو رفتہ رفتہ ہٹا کر اِس کی جگہ لے لے۔ لیکن یہ تب ہی ہو سکتا ہے جب کہ لوگوں کے دلوں سے صوبائی اور لسانی تعصب دُور ہو جائے۔

ہمارے ملکی اور قومی اتّحاد کو پارہ پارہ کرنے والی ایک چیز سیاسی اختلافات بھی ہیں۔ سیاسی اختلافات کس مُلک میں نہیں ہوتے؟ لیکن وہاں پر اختلافات ذاتی دشمنی اور مخاصمت کی شکل کبھی بھی اختیار نہیں کرتے۔ ہمارے مُلک میں بدنصیبی سے جتنی سیاسی جماعتیں ہیں سب ایک دوسرے کی دشمن ہیں اور اِن کے لیڈر ہمیشہ ایک دوسرے سے دست بگریباں رہتے ہیں۔ اِنتخابات میں عناد و فساد کی یہ فضاء اور بھی گندی ہو جاتی ہے اور جو فریق ہار جاتا ہے وہ فریقِ ثانی کا مستقل دشمن بن جاتا ہے اور جب ایک وزارت برسرِ اقتدار آتی ہے تو مخالف پارٹی ذرا ذرا سی بات پر جا و بیجا پروپیگنڈا کر کے عوام کو اِس کے خلاف بھڑکاتی رہتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آئے دن نئی وزارتیں بنتی رہتی ہیں اور کسی کو بھی سکون واطمینان سے کام کرنے کا موقع نہیں ملتا۔ (یہ 1959ء سے پہلے کا ذکر ہے) اِس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ہمارے زعماء اور نام نہاد لیڈروں کی بھاری اکثریت خلوص وصداقت سے عاری اور ذاتی اقتدار کی طالب ہے اور اِن میں سے جو لوگ واقعی خلوص سے قوم کی خدمت کرنا چاہتے ہیں ان کی اِس خود پرست اکثریت کے سامنے کچھ پیش نہیں جاتی اور وہ کرسی وزارت حاصل کرنے کے بعد بھی قوم کی کوئی خاص خدمت نہیں کر سکتے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ہمارے عوام میں جہالت کی وجہ سے ابھی سیاسی شعور ہی پیدا نہیں ہوا اور وہ قوم و مُلک کے سچے خادموں

اور اقتدار پسند مفسدوں میں قطعاً امتیاز نہیں کر سکتے۔ اِن تمام مصیبتوں کا علاج صرف یہ ہے کہ عوام میں سیاسی شعور پیدا کیا جائے، لیکن یہ کام صرف وہ معدودے چند مقررین اور اخبارات کر سکتے ہیں، جنہوں نے سیاسی لیڈروں سے ذاتی منافع حاصل کرنے کے لیے اپنا ضمیر فروخت نہیں کیا ہے۔

رابطہ اور اطاعت:

جس قوم میں اتّحاد و یگانگت ہی نہ ہو اِس میں رابطہ و اطاعت یعنی تنظیم و ڈسپلن پیدا ہی نہیں ہوسکتا۔ اِسلامی رابطہ واتّحاد کی تربیت گاہیں ہماری مساجد ہیں لیکن جیسا کہ بیان ہو چکا ہے جبکہ مختلف فرقوں نے اپنی اپنی مساجد ہی الگ بنالی ہوں اور وہ ایک دوسرے کے ساتھ نماز پڑھنے کے بھی روا دار نہ ہوں بلکہ ایک دوسرے کا سر پھوڑنے کو تیّار رہتے ہوں تو رابطہ و اطاعت کے نشوونما پانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اِس لیے اِن دواُصولوں کی جو مٹی اِس وقت پلید ہو رہی ہے اِس کا ذکر تحصیلِ حاصل سمجھتے ہوئے عمل کا کچھ بیان کیا جاتا ہے۔

عمل:

عمل کی اصل محرّک خواہش ہے اور خواہشیں لاتعداد ہیں، اِس لیے صرف چند محرّکات عمل کا بیان کیا جاتا ہے۔

عمل کی سب سے پہلی محرّک بھوک پیاس اور سردی گرمی سے بچنے کی ضرورت ہے۔ اِس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے خدا اور رسولؐ نے سب سے زیادہ زور تجارت پر دیا ہے۔ رسول اللہؐ فرماتے ہیں کہ ''دس حصوں میں سے نو حصے رزق تجارت میں ہے''، اِسی لیے ہمارے اسلاف کسبِ معاش کی خاطر زیادہ تر تجارت ہی کرتے تھے اور سمندروں اور خشکی کے راستے معلومہ دُنیا کے آخری گوشوں تک جا پہنچے تھے۔

عمل کا دوسرا محرّک حصولِ علم ہے۔ علم سے مُراد کتابیں پڑھنا ہی نہیں بلکہ ملکوں اور

چیزوں کے حالات اور حقیقت معلوم کرنا بھی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ دُنیا میں سفر کرو اور دیکھو کہ آفرینش کی ابتدا کیوں کر ہوئی اور یہ بھی دیکھو کہ پہلی قوموں کا انجام کیا ہوا۔ رسول اللہؐ فرماتے ہیں کہ علم حاصل کرو خواہ وہ چین میں ہو، چنانچہ یہ اللہ اور رسولؐ کے فرمانبردار بندے محض حصولِ علم کے لیے ہزاروں میل سفر کرتے اور کسی تکلیف و مصیبت کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔

عمل کا تیسرا محرّک تبلیغِ علم ہے۔ طبع انسانی کا فطرتی تقاضہ ہے کہ جو کچھ وہ جانتا ہے، چاہتا ہے کہ دوسرے بھی جان لیں۔ چونکہ اسلام میں علم کا اصلی سرچشمہ قرآن اور رسولِ خدا کے ارشادات ہیں، اِس لیے بے شمار بزرگ دُور دراز ممالک میں پہنچ کر قرآن اور حدیث کی تبلیغ کرتے اور تہذیب اسلامی وہاں پھیلاتے تھے۔ ہندوستان، چین، ماچین، انڈونیشیا، افریقہ اور جنوبی یورپ کے بیشتر ممالک میں اِنہی بزرگوں کی تبلیغ سے اسلام نے فروغ پایا۔

عمل کا چوتھا محرّک قوم، تہذیب اور ناموس کا دفاع ہے، چنانچہ تاریخِ اسلام شاہد ہے کہ دُنیا میں جہاں کہیں ان کے تجّار اور مبلغین پر بے جا زیادتی یا ظلم و جور ہوا، مجاہدینِ اسلام نے وہیں پہنچ کر ناموسِ اسلام کی حفاظت کی۔

یہ تھی ہمارے اسلاف کی حالت کہ وہ مندرجہ بالا امور کو اللہ اور رسولؐ کا حکم سمجھ کر بجا لاتے تھے۔ آج یہ خیال کر کے تعجب ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں جب سفر و سیاحت کے لیے نہ گاڑیاں تھیں، نہ موٹریں، نہ دخانی جہاز تھے، نہ ہوائی طیارے، وہ کس طرح شام، ایران، عرب اور مصر وغیرہ سے نکل کر ناپیدا کنار سمندروں کے سینہ پر اپنے بادبانی جہاز اڑاتے اور بے برگ و گیاہ ریگستانوں اور پُر خوف و خطر کوہستانوں میں اونٹ اور گھوڑے دوڑاتے یورپ، افریقہ اور ایشیا کے ایک ایک شہر اور قصبہ تک جا پہنچتے تھے۔ الغرض یہ تھی ان کی قوّتِ عمل اور یہی تھا ان کی ترقی اور برتری کا راز۔

اب ہم بتاتے ہیں کہ ان محرّ کاتِ عمل میں سے پہلا محرّک یعنی حصولِ رزق اگرچہ سب سے قوی اور عام ہے لیکن باقی تین محرّ کات سے کہیں کمتر اور ادنیٰ ہے۔ یہ کام تو وحوش و طیور اور چوپائے بھی کر لیتے ہیں، پھر انسان میں اور ان میں کیا فرق ہے۔ انسان کی شرافت و فضیلت دوسری مخلوقات پر محض اِس لیے ہے کہ وہ عقل و علم سے اشیاء کی حقیقت معلوم کرتا، قدرت کے رازوں سے پردے ہٹاتا اور جو کچھ علم و فوائد حاصل کرتا ہے ان سے دوسروں کو بھی نفع پہنچاتا ہے۔

جو قومیں پہلے محرّک سے زندگی کی ضروریات حاصل کر کے مطمئن ہو جاتی ہیں، علم حاصل کرنے اور اس کو پھیلانے کی کوشش نہیں کرتیں، ان کی ترقی رُک جاتی ہے، پھر رفتہ رفتہ زوال ہوتا ہے اور آخر کار فنا ہو جاتی ہیں۔ آج کل کی متمدّن اقوام نے اس راز کو بہت اچھی طرح سمجھ لیا ہے اور اب بھی جب کہ پیٹ اور جسم کی ضروریات پوری کرنے کے لیے ان کے پاس دولت کے بے قیاس خزانے جمع ہو چکے ہیں اور علم و دانش کے ذریعہ قدرت کی بہت سی طاقتوں مثلاً بھاپ، بجلی، مائکروویوز اور ایٹمی طاقت پر اُن کا قبضہ اور تصرّف ہو چکا ہے، انہوں نے اپنے افراد کو متحرک اور مصروفِ عمل رکھنے کے لیے دوسرے اعلیٰ مقاصد پیدا کر لیے ہیں مثلاً چاند اور ستاروں تک پہنچنے کو اپنا مطمحِ نظر بنا لیا ہے، لیکن افسوس کہ مسلمانوں نے اس طرف توجہ نہیں کی۔ جب ان کے پاس شکمی اور جسمی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے کافی دولت جمع ہو گئی تو وہ ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ رہے اور عیش و عشرت کو اپنا مقصدِ آخر قرار دے کر مزید عمل کی ضرورت نہ سمجھی۔ اس تساہل اور بے عملی کا انجام یہ ہوا کہ آخر کار نہ صرف وہ دولت ختم ہوئی بلکہ عزّت و عظمت اور سیادت و قیادت بھی رخصت ہو گئی۔ یہاں تک کہ آج ملکی دفاع کا تو ذکر ہی کیا، شکمی اور جسمی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے بھی ہم دوسرے ملکوں کے محتاج اور دستِ نگر ہیں۔

سُستی، کاہلی، اور بے عملی کی یہ وباء عیاشی وفحاشی کی شکل میں بادشاہوں کے محلات سے شروع ہوکر اعلیٰ اور اوسط درجے کے طبقات کو تباہ کرتی ہوئی عوام تک جا پہنچی، جس سے پوری قوم مفلوج ہوکر رہ گئی۔ مختلف پیشے ذلیل اور حقیر سمجھے جانے لگے اور ہر طبقے میں اپنے سے اعلیٰ طبقے کے مقابلے میں احساس کمتری پیدا ہوگیا۔ غریب لوگ تو اپنا پیٹ بھرنے کے لیے کوئی نہ کوئی کام کرنے پر مجبور تھے لیکن اُمراء اور متوسط طبقے کے اشخاص تو خود اپنا ذاتی اور خانگی کام بھی اپنے ہاتھ سے کرنے کو باعثِ توہین سمجھنے لگے۔ ان خاندانوں کی خواتین اپنا کھانا خود پکانے، برتن مانجھنے، کپڑے سینے، اور دھونے اور دوسرے گھریلو کام کرنے کو ذلّت اور اپنی بدقسمتی خیال کرنے لگیں۔ چنانچہ نا کتخدا لڑکیوں کے لیے ایسی دعائیں زبان زدِ خاص و عام ہوگئیں جیسے کہ ''بیٹی خدا کرے ایسے گھر جائے جہاں ہل کر پانی نہ پینا پڑے'' ''سدا پلنگ پر بیٹھی کھائے'' گویا ہل کر پانی نہ پینا اور پلنگ پر بیٹھے بیٹھے کھانا کوئی بڑی ہی خوش قسمتی کی بات ہے، بیماروں، اپاہجوں اور مفلوجوں کا کام نہیں۔ یہی وہ لڑکیاں تھیں کہ جب شادی کے بعد انہیں خادمائیں میسر نہ آسکیں تو عمر بھر اپنی بدقسمتی پر آنسو بہاتی رہیں اور گھر کے ماحول کو ہمیشہ جہنّم بنائے رکھا۔ یہی دوشیزائیں تھیں کہ جب مائیں بنیں تو اپنے بچوں کو حصولِ تعلیم کے لیے بھی اپنے گاؤں یا قصبہ سے باہر بھیجنے کو مصیبت خیال کرتی تھیں۔ ذرا اِن ماؤں کا مقابلہ قرونِ اولیٰ کی اُن خواتین سے کیجئے جو میدان جنگ میں بھی اپنے مَردوں کے ساتھ رہتیں اور ان کی ہر خدمت بجالاتی تھیں اور جہاد کا نعرہ بلند ہوتے ہی اپنے جگر گوشوں کو خود بنا سجا کر میدانِ جنگ میں بھیجتیں اور جب وہ شہید ہوجاتے تو ساری عمر اس پر فخر کرتیں۔ ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا۔

ہمارے مَردوں کا حال ان عورتوں سے بھی بدتر تھا۔ یہ بھی اپنا کوئی کام اپنے ہاتھ سے نہ کرسکتے تھے، ہر بات میں خادموں کے دستِ نگر تھے۔ منہ دھونے، غسل کرنے، کپڑے

بدلنے حتیٰ کہ پانی پینے، کھانا کھانے بلکہ پاخانے میں لوٹا تک لے جانے کے لیے انہیں نوکروں کی ضرورت ہوتی تھی۔ اِن کے مشاغل شراب اور بھنگ پینا، افیم کھانا، چرس اور چنڈو کے دم لگانا، تاش، شطرنج اور چوسر کھیلنا، مرغ اور بٹیر لڑانا، پتنگیں اُڑانا اور ایسی ہی دوسری بیہودگیاں تھیں۔اس بے عملی کا ایک معمولی سا تصوّر مندرجہ ذیل واقعہ سے پیدا ہوسکتا ہے:۔

بہت عرصہ کی بات ہے کہ ایک نواب صاحب کے دولت کدے پر جانے کا اتفاق ہوا۔ گرمی کا موسم اور دن کے دس بجے کا وقت، نواب صاحب اپنے عالیشان محل کے ایک وسیع ہال میں تشریف فرما تھے۔ ہال کے دروازوں میں خس کی ٹٹیاں لگی ہوئی تھیں، پانی چھڑکا اور پنکھے کھینچے جارہے تھے (کیونکہ اس وقت تک بجلی کے پنکھے نہیں چلے تھے)۔ ہال کے بیچ میں ایک بڑے تخت پر چاندنی بچھی اور گاؤ تکیے لگے ہوئے تھے۔نواب صاحب ایک بہت ڈِھیلا تن زیب کا کرتا اور بڑے پائینچوں کا پاجامہ پہنے ایک گاؤ تکیے سے پیٹھ لگائے بیٹھے تھے۔تخت کے چاروں طرف کرسیاں پڑی تھیں، ہم لوگ ان پر بیٹھ گئے۔نواب صاحب نہایت ہی خوش اخلاقی سے پیش آئے اور خاطر تواضع میں بے انتہا مبالغہ برتا۔ہمیں بیٹھے ہوئے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ نواب صاحب نے یکا یک فرمایا۔"ارے کوئی ہے" چشم زدن میں کئی نوکر حضور حضور کہتے ہوئے آن کھڑے ہوئے۔نواب صاحب نے ایک نوکر کی طرف دیکھ کر نہایت ہی نرم اور دھیمی آواز سے کہا۔"ذرا کھجا دینا" نوکر آگے بڑھا اور نواب صاحب کے قریب آکر کھڑا ہوگیا۔نواب صاحب نے فرمایا "پیٹھ پر" نوکر نے نواب صاحب کے کرتے میں ہاتھ ڈال کر ان کی پیٹھ پر رکھا تو انہوں نے فرمایا۔"ذرا دہنے کو"۔"ذرا بائیں کو"۔"ذرا اُوپر کو"۔"ذرا اور اُوپر کو" اس طرح نوکر کو وہ صحیح جگہ معلوم ہوئی جہاں کھجانا تھا اور وہ کھجانے میں مصروف ہوگیا۔اس وقت تو اس بات کا احساس بھی نہیں ہوا، لیکن آج خیال آتا ہے کہ،

اللہ اکبر، کیا حالت تھی ہمارے اُمراء اور روساء کی سُستی اور کاہلی کی کہ وہ اپنا بدن تک کُھجانے کے لیے دوسروں کے محتاج تھے، پھر ایسی قوم تباہ نہ ہوتی تو اور کیا ہوتا۔

قوم کی یہ بے عملی موجودہ صدی کے رُبع اوّل تک یونہی رہی، اس کے بعد سے حالات کچھ سدھرنے شروع ہوئے۔ اِس تبدیلی کی وجہ پہلی عالمگیر جنگ، تحریک آزادی کا جوش و خروش، غربت وافلاس کی زیادتی اور انگریزی تعلیم کا بڑھتا ہوا رواج تھا جس سے ہمارے عوام وخواص کو عمل اور اپنا کام خود کرنے کا خیال پیدا ہوا، لیکن عملی قوّت جیسی کہ ایک زندہ قوم میں ہونی چاہیے، آج بھی موجود نہیں۔ ہمارے نوجوانوں میں بیشتر ایسے ہیں جو اپنی زندگی کا مقصد ہی اعلیٰ درجے کا کھانا، لباس، بنگلہ اور موٹر کاروں کو سمجھتے ہیں اور اِن میں سے اکثر یہ چیزیں حاصل کرنے کے لیے رشوت، جوئے، چور بازاری اور دوسرے ناپاک ذرائع سے بھی اجتناب نہیں کرتے۔ یہ لوگ زندگی کی کامیابی صرف اپنے ذاتی آرام وآسائش ہی کو سمجھتے ہیں، قومی فلاح و بہبود کا تصوّر بھی اِن کے دماغ میں نہیں ہے۔ یہ اتنا نہیں جانتے کہ قوم تباہ ہو جائے تو ہم بھی تباہی سے محفوظ نہیں رہ سکتے۔ بے عملی کا بیان ختم ہوا، اب ہم اپنے قومی زوال کی ایک اور وجہ بیان کرتے ہیں۔

دُنیا سے نفرت:

مسلمانوں کی تباہی اور زوال کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ وہ دُنیا سے متنفّر ہو گئے اور دنیاوی عزّت وعظمت اور حصولِ دولت وثروت کو بُرا سمجھنے لگے۔ اب آپ خود ہی سوچیں کہ جب آپ کسی چیز کے حصول کی خواہش اور کوشش ہی نہ کریں گے بلکہ اِس کو عیب سمجھیں گے تو وہ چیز خود بخود آپ کو کس طرح حاصل ہو جائے گی؟ بالکل یہی حال مسلمانوں کا ہوا اور وہ اِس طرح کہ دوسری اور تیسری صدی ہجری میں جب اسلامی فتوحات ایک طرف چین اور ہندوستان کی سرحدوں تک پہنچ گئیں اور دوسری طرف تمام شمالی افریقہ اور اسپین اِن کے

قبضہ میں آ گیا تو مال و دولت کی وہ بہتات ہوئی کہ غربت کا نام ونشان بھی نہ رہا،لیکن جب دولت آئی تو وہ اپنے تمام معائب بھی ساتھ لائی۔اب مسلمانوں میں مشقت اور جفاکشی کے بجائے عیش پسندی اور آرام طلبی کی بُری عادتیں پیدا ہونے لگیں۔ بادشاہوں نے میدان جنگ میں دادشجاعت دینے کے بجائے محلّات میں عیش وعشرت اورعیاشی بلکہ فحاشی کی زندگی اختیارکرلی۔مُلک کا اِنتظام اور عدالت کا کام وزیروں کے سپُرد کیا اور خود نازنینانِ حرم کی صحبتوں میں شرابِ ناب اور طاؤس و رباب کی رنگینیوں میں مست ومحو ہوکررہ گئے۔رفتہ رفتہ اُن کی تقلیداُن کے وُزراء اور اُمراء نے کی اور پھر یہ وبا نہ صرف عمال حکومت بلکہ رعیت کے عوام میں بھی پھیل گئی۔یادِخدا غائب ہوئی،خوفِ خدا جاتا رہااور بُرائیاں عام ہونے لگیں۔ اِس وقت علمائے اسلام اوراولیائے کرام نے ضرورت محسوس کی کہ دُنیا کی بُرائیاں بیان کی جائیں،چنانچہ خانقاہوں کے بوریوں اورمسجدوں کے منبروں سے یہ صدابلند ہوئی کہ دُنیا فانی اورناپائیدار ہے،ذلیل وخوار ہے،کُتیا اورمردار ہے اور اِس کا چاہنے والا کُتّا ہے،کافر ہے، مردود ہے،ملعون ہے۔ یہ وعظ موقع اور حالات کے لحاظ سے نہایت ضروری اور ناگزیر تھا لیکن کہنے والوں کی غرض صرف یہ تھی کہ مسلمان دنیاوی عیش وعشرت میں مبتلا ہوکر خدا کو نہ بھول جائیں اور تعلیمِ قرآن سے مُنہ نہ موڑ لیں۔ان کا مطلب یہ ہرگز نہ تھا کہ اسلام نے حصولِ دُنیا ہی کوحرام قرار دیا ہے۔لیکن جُوں جُوں زمانہ گزرتا گیا،واعظوں کا طرزِ خطابت اور سننے والوں کی ذہنیت بدلتی گئی۔نسلیں بدلتی رہیں اور ہر نسل کے لوگ بچپن ہی سے اِس کو سنتے رہے حتیٰ کہ تمام قوم کے دماغ میں یہ خیال راسخ ہوگیا کہ روپیہ پیسہ کمانا حرام اورشان و شوکت کے اسباب مہیا کرنا گناہ ہے۔نتیجہ یہ ہوا کہ قوائے عمل بیکاراور تمام مسلمان من حیث القوم مفلس ونادار ہوکررہ گئے۔قوم مفلس ونادار ہوگئی، جہانگیری وجہانبانی کے ولولے تو کجا، پیٹ بھرنے کے لیے محنت کرنا بھی مصیبت معلوم ہونے لگا۔لوگ غربت کی وجہ سے ایمان

بیچنے لگے لیکن وعظ جو ہزار بارہ سو برس پہلے شروع ہوا تھا اسی طرح رہا۔ آج بھی ہمارے علماء اور آئمہ وعظ و نصیحت کی مجالس اور مساجد جامعہ کے منبروں سے یہی کہتے ہوئے سنے جاتے ہیں کہ "اَلدُّنْیَا جِیْفَۃٌ وَّ طَالِبُھَا کِلَابٌ"

اب اگر ہم قرآن اور حدیث کی طرف رجوع کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ خدا اور رسولؐ نے تو کہیں بھی اکتسابِ دُنیا اور حصولِ حشمت و جاہ کو حرام نہیں کیا، چنانچہ اِس بات کے ثبوت میں قرآن سے چند آیات کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے:۔

(۱) لوگوں میں ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے رب ہم کو دُنیا اور آخرت دنوں میں بھلائی عطا فرما اور عذابِ دوزخ سے بچا۔ یہی لوگ ہیں جن کے لیے اِن کی محنت کا صلہ ہے اور اللہ تعالیٰ بہت جلد حساب لینے والا ہے۔ (البقرۃ ۲۰۱۔۲۰۲)

(۲) اور خوشنما بنائی گئی ہیں آدمیوں کے لیے مرغوب چیزوں کی محبت مثلاً عورتیں، بچے، سونے چاندی کے ڈھیر، عمدہ گھوڑے اور مویشی اور کھیتی باڑی اور یہی چیزیں سرمایہ حیاتِ دنیوی ہیں اور اللہ تعالیٰ کے پاس (اِس سے بھی) اچھا ٹھکانا ہے۔ (آل عمران ۱۴)

(۳) ہم نے آباد کیا تم کو زمین میں اور پیدا کیے اِس میں تمہارے لیے سامانِ زندگی۔ (اعراف ۱۰)

یہاں سامانِ زندگی سے مراد ہر وہ چیز ہے جو زمین سے حاصل ہو مثلاً ہر قسم کا غلہ، پھل، کپڑے بنانے کا سامان، ہر قسم کی دھاتیں اور معدنی اشیاء مثلاً لوہا، تانبا، چاندی، سونا، جواہرات، کوئلہ اور پٹرول وغیرہ۔

(۴) اے پیغمبر کہو کہ جو زینت کے سامان اور کھانے کی پاکیزہ چیزیں اللہ نے اپنے بندوں کے لیے پیدا کی ہیں اُن کو کس نے حرام کر دیا ہے۔ تم کہہ دو کہ جو لوگ حیاتِ دنیوی میں ایمان لائے قیامت کے دن یہ چیزیں خاص اِنہی کے لیے ہوں گی۔ (اعراف ۳۲)

اِس آیت کا مطلب یہ ہے کہ نعائمِ دُنیا اِس جہان میں تو کافروں اور مومنوں دونوں ہی کے لیے ہیں، لیکن آخرت میں صرف مومنوں کو ملیں گی، کفار کو نہیں۔

(۵) اور جو کچھ تجھ کو اللہ نے دیا ہے، اُس سے دارِ آخرت کی فکر کر اور اپنے دُنیا کے حصّہ کو مت بھول۔ (قصص ۷۵)

اِس آیت کا مطلب ہے کہ دُنیا ضرور پیدا کرو لیکن اِس طرح کام میں لاؤ کہ آخرت میں بھی سرخرو رہو۔ اللہ تعالیٰ نے اِس آیت میں صرف یہ کہہ کر ''کہ اپنے دُنیا کے حصّہ کو مت بھول'' مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت اور حصول کا ایک مبسوط قانون بیان کر دیا ہے۔ اِس کا یہ مطلب ہے کہ تمہارے جو دنیوی حقوق لوگوں پر واجب ہیں ان کو ضرور حاصل کر کے رہو بے جا لحاظ و مروّت یا سُستی و کاہلی کی وجہ سے اِن سے دستبردار نہ ہو۔ ظاہر ہے کہ جب چھوٹے چھوٹے حقوق کی طرف سے بے پروائی برت کر تم اِس بات کے عادی ہو جاؤ گے تو رفتہ رفتہ بڑی بڑی چیزیں حتیٰ کہ سلطنتیں بھی تمہارے ہاتھ سے نکل جائیں گی اور تمہیں احساس تک نہ ہوگا۔ ہندوستان میں مغل بادشاہوں نے یورپین اقوام کو ناجائز حقوق عطا کر کے نتیجہ دیکھ لیا۔ ترکی کی تباہی کا بڑا سبب یہی تھا کہ سلاطینِ ترکی نے یورپین اقوام کو اپنے مُلک اور دارلسلطنت میں اِن کے اپنے ڈاکخانے، تارگھر اور عدالتیں بنانے کی اجازت دے دی تھی۔ یہ کسی طرح بھی اِن غیر اقوام کا حق نہ تھا بلکہ ترکوں کا حق تھا۔ یہی حال احادیث کا ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ:

اَلْفَقْرُ سَوَادُ الْوَجْهِ فِی الدَّارَیْنِ

یعنی ''غربت دونوں جہان میں رسوائی کا موجب ہوتی ہے'' یہ بھی ارشاد ہوا ہے کہ

کَادُ الْفَقْرُ اَنْ یَّکُوْنَ کُفْرًا

یعنی ''افلاس کفر کا سبب ہوتا ہے''۔ حضرت عمرؓ ہمیشہ یہ دُعا مانگا کرتے تھے۔

اَللّٰھُمَّ تَنْزِعِ الدُّنْیَا مِنْ قَلْبِیْ وَلَا تَنْزِعْھَا مِنْ یَّدِیْ

یعنی ''اے اللہ میرے دل کو دُنیا سے خالی رکھ لیکن میرے ہاتھوں کو دُنیا سے خالی نہ رکھ''۔ اِن تمام آیات اور احادیث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ حصولِ دُنیا تو کسی طرح بھی منع نہیں لیکن دُنیا کی وجہ سے خدا کو بھول جانا یقیناً منع ہے اور یہی بات ہے جو حضرت مولانا رومؒ فرما گئے ہیں۔

اہلِ دُنیا کافرانِ مطلق اند
روز و شب در چق چق و در بق بق اند
چیست دُنیا از خُدا غافل بُدن
نے قُماش و نُقرہ و فرزند و زن

ہمارے زوال کی ایک اور بڑی وجہ عوام کی جہالت اور ہمارے خواص کی کم علمی اور اپنے فرائض کی طرف سے بے پروائی ہے۔ تفصیل اِس اجمال کی یہ ہے:

ہمارے عوام:

اِس وقت دُنیا میں مسلمانوں کی تعداد کم و بیش ساٹھ کروڑ ہے۔ اگر ان میں سے پڑھے لکھے لوگ چُنے جائیں تو شاید دو فیصدی بھی مشکل سے نکلیں گے اور ان میں سے بھی اکثر ایسے ہوں گے جو صرف معمولی شُد بُد رکھتے ہیں۔ یہ صورتِ حال بہت ہی مایوس کن ہے۔ اس جہالت کی وجہ سے قوم کا سوادِ اعظم بیکار ہو کر رہ گیا ہے۔ یہ لوگ نہ تو مذہب ہی کو جانتے ہیں نہ دُنیا کے حالات ہی سے باخبر ہیں۔ اِس لیے ہمیشہ غیروں کے ہاتھ بک جاتے ہیں اور مِلّت کی بہبود کا مطلق خیال نہیں کرتے۔

ہمارے علمائے دین:

ان میں تعدادِ کثیر ایسے لوگوں کی ہے جو گھر پر دو چار کتابیں پڑھ کر پہلے مولود خواں بنتے

ہیں۔ پھر وعظ و نصیحت کا پیشہ اختیار کر کے رفتہ رفتہ عالمِ دین مشہور ہو جاتے ہیں۔ یہ لوگ دین کے اسرار و غوامض تو کیا اُصول و فروع سے بھی واقف نہیں ہوتے، یہی وہ علماء ہیں جو لوگوں کو خوش کرنے کے لیے مزیدار چٹکلے، اشعار اور بے سروپا روایتیں اور حکایتیں بیان کر کے خراجِ تحسین وصول کرتے اور اپنی جیبیں بھرتے ہیں۔ ان کو ملّت کی فلاح و بہبود سے کوئی غرض نہیں، جس کا کھاتے ہیں اسی کا گاتے ہیں اور اسی کے ہاتھ اپنا ضمیر فروخت کر دیتے ہیں۔ اب رہے وہ بزرگ جو درحقیقت عالمِ دین ہیں تو ان میں یہ کمی ہے کہ وہ ان علومِ دنیوی سے بے بہرہ ہوتے ہیں جن میں کمال پیدا کیے بغیر آج کی دُنیا میں ترقی کرنا اور دوسری متمدّن اقوام کے دوش بدوش چلنا قطعاً ناممکن ہے۔ علاوہ ازیں علمائے کرام کی پوری عزّت و تکریم ملحوظ رکھتے ہوئے بھی ہم یہ کہنے کے لیے مجبور ہیں کہ ان بزرگوں کی اکثریت نے پچھلی کئی صدیوں سے اپنے فرائض کماحقّہٗ ادا نہیں کیے۔ نائب رسولؐ ہونے کی حیثیت سے ان کا فرض ہے کہ وہ عوام کو نہ صرف دین کی تعلیم دیں بلکہ ایسے ذرائع بھی بروئے کار لائیں کہ یہ تعلیم ان میں رائج اور راسخ ہو جائے۔ اگر علمائے دین اپنے فرائض کماحقّہٗ ادا کرتے تو آج ملّت کے عوام دین سے اس قدر بے خبر نہ ہوتے۔ دوسرے ممالک کی بابت تو ہم زیادہ نہیں جانتے لیکن ہندوستان اور پاکستان میں تو ہم نے بچشم خود دیکھا ہے کہ دیہات کے مسلمانوں کی عظیم اکثریت مذہب کی مبادیات سے بھی واقف نہیں شہر دہلی صدیوں تک مسلمانوں کا دارالحکومت رہا ہے، وہاں یہ حال ہے کہ دس میل دُور چلے جائیے تو دیہات میں کوئی نماز سے واقف ہے نہ روزے سے حتیٰ کہ ان کی وضع قطع، نام اور رسوم بھی ہندووانہ ہیں۔ اکثر دیہات میں نکاح کے وقت پہلے پنڈت جی ہندووانہ رسوم کے مطابق پھیرے ڈالتے ہیں پھر قاضی صاحب نکاح پڑھاتے ہیں۔ ایک دفعہ ہم میوات کے ایک بہت بڑے گاؤں میں مقیم تھے جہاں مسجد بھی تھی۔ ایک دن ایک میو نے دوسرے سے کہا کہ آج میرے

لڑکے کا عقیقہ ہے لیکن ملاّ دلّی چلا گیا ہے، اب بکرا کون کاٹے گا۔ اُس نے جواب دیا کہ ملاّ چُھری پڑھ کر فلاں شخص کے مکان میں رکھ گیا ہے وہاں سے لے کر تُو خود کاٹ لے۔ ہم نے پوچھا تو معلوم ہوا کہ ملاّ جی جانوروں کو ذبح کرنے کی اُجرت چار آنے فی جانور کے حساب سے وصول کرتے ہیں اِس لیے جب باہر جاتے ہیں تو چُھری پر تکبیر دم کر کے رکھ جاتے ہیں تا کہ لوگ ان کی غیر حاضری میں خود ہی جانوروں کو ذبح کر لیں اور ذبیحہ ناجائز نہ ہو۔ جب ملاّ جی واپس آتے ہیں تو جتنے جانور ان کی غیر حاضری میں ذبح ہوئے تھے، سب کی اُجرت ان کو دے دی جاتی ہے۔ دہلی سے مشرق کی طرف سینکڑوں میل تک ملکانے راجپوت آباد ہیں، ان کو نماز روزہ تو کیا کلمہ تک بھی نہیں آتا۔ تحریک آزادی کے زمانہ میں جب ہندوؤں نے شدھی کی مہم شروع کی تو اس علاقہ کے ہزارہا نام نہاد مسلمان چٹکی بجاتے آریہ ہو گئے۔

یہ تو تھا اس دہلی کے مضافات کا حال جو صدیوں تک علم دین کا گہوارہ اور علمائے دین کا مرکز رہی ہے۔ دُور افتادہ دیہات کی حالت اور بھی ابتر ہے، ہر جگہ اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جو نماز روزہ تو کیا رسولِ خداؐ کے نام مبارک سے بھی واقف نہیں۔ جنوبی ہند میں ایک مرتبہ ایسے علاقہ میں جانے کا اتفاق ہوا جہاں دس بارہ گاؤں مسلمانوں کے اکٹھے آباد تھے۔ دیکھا تو کسی گاؤں میں بھی مسجد نہ تھی۔ پوچھا، کیا آپ لوگ نماز نہیں پڑھتے؟ جواب ملا کیوں نہیں؟ ہر جمعرات کو پڑھتے ہیں۔ تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ ہر گاؤں کے باہر ایک زیارت یعنی کسی پیر کی قبر ہے وہاں ماتھا ٹیک آتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ ہمارے علمائے دین جن کا کام ہی تبلیغ و تلقینِ دین ہے، کیا یہ ان کا فرض نہ تھا کہ ان شعائرِ دین سے ناآشنا مسلمانوں کو تلقین کر کے پکا مسلمان بناتے۔ ہندوستان میں یہ فرض اب اور بھی شدید ہو گیا ہے، کیونکہ شدھی کی تحریک کی وجہ سے ان سب مسلمانوں کے مرتد ہو جانے کا سخت خطرہ ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس کام میں اب پہلے سے کہیں زیادہ دقتیں پیش آئیں گی۔ ہندوؤں کی طرف

سے ہر قسم کی رکاوٹیں اور دشواریاں پیدا کی جائیں گی اور بسا اوقات ہمارے مبلّغین کی جانوں تک کو خطرہ ہوگا لیکن قرآن تو یہی سکھاتا ہے کہ کوئی سخت سے سخت مشکل اور بڑے سے بڑا خطرہ بھی مومن کو اپنے فرائض کی بجا آوری سے باز نہیں رکھ سکتا۔ بات دراصل یہ ہے کہ اب تک ہمارے علمائے دین کی دینی خدمات اور سرگرمیاں صرف بڑے بڑے شہروں اور قصبات تک اِس لیے محدود رہیں کہ وہاں ہر قسم کا آرام ملتا اور ہر قسم کی سہولتیں میسر آتی ہیں اور دیہات میں ہر طرح کی تکلیف کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ لیکن اگر ہم یہ دیکھیں کہ عیسائی مشنوں کے پادری اور مبلغین کس طرح نہ صرف متمدّن ممالک کے دیہات بلکہ افریقہ اور امریکہ کے غیر آباد جنگلوں اور پرخطر بلکہ ناقابل گزر علاقوں میں پہنچ کر وہاں وحشی اور خونخوار قبائل میں بھی اپنے دین کی تبلیغ کرتے ہیں تو کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ ہمارے علمائے کرام اپنے متمدّن ممالک میں ایسا کیوں نہیں کرسکتے؟

پاکستان کا حال بھی اس لحاظ سے کچھ بہتر نہیں۔ مشرقی پاکستان، سندھ اور بلوچستانی دیہات کے مسلمان بھی دین سے اسی طرح اجنبی ہیں جس طرح ہندوستانی دیہات کے نام نہاد مسلمان۔ پنجاب کے دیہات کا حال نسبتاً بہتر ہے لیکن یہاں قبر پرستی اور پیر پرستی اس قدر شدت سے ہے کہ توحید پرستی کا دُور دُور تک پتہ بھی نہیں۔ سرحدی علاقہ کی بابت عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ یہاں کے باشندے بڑے پکّے اور جوشیلے مسلمان ہیں لیکن ہم نے خود ان علاقوں کا سفر کر کے دیکھا تو معلوم ہوا کہ بڑے بڑے شہروں اور قصبوں سے قطع نظر دیہات میں یہاں بھی معاملہ صفر ہی ہے۔ یہاں کے دیہات اور قبائلی علاقوں میں قبر پرستی اور پیر پرستی اس قدر زوروں پر ہے کہ بت پرستی کو بھی شرم آتی ہے۔ نماز یہاں کے باشندے بے شبہ کثرت سے پڑھتے ہیں، لیکن اول تو طہارت اسلامی سے قطعاً ناآشنا اور بے انتہا گندے ہیں، دوسرے اکثر نمازیوں کو الحمد یا کوئی دوسری سورت بھی یاد نہیں۔ قیام، رکوع،

اور سجود تو کر لیتے ہیں، لیکن ان میں پڑھتے کچھ بھی نہیں۔ علاوہ ازیں اخلاقِ اسلامی اور خلقِ محمدیؐ سے تو ان کو دُور کا واسطہ بھی نہیں۔ قتل و غارت، رہزنی اور ڈکیتی دن رات کی معمولی باتیں ہیں، لیکن غور سے دیکھا جائے تو یہ پٹھان اپنے تہوّر اور دوسری خداداد جسمانی اور ذہنی قابلیتوں کی وجہ سے ہر طرح اس کے اہل ہیں کہ اگر ان کو صحیح قسم کی دینی اور دنیوی تعلیم و تربیت دی جائے تو اسلام کی اتنی بڑی خدمت کر سکتے ہیں کہ ایک مرتبہ پھر دُنیا حیران رہ جائے گی۔ کیا ہماری حکومت صرف، لوہا، کوئلہ، گیس، پٹرول اور سونا چاندی کی کانیں ہی کھودتی رہے گی اور ان انمول جواہرات کی کان کی طرف کبھی توجہ نہ کرے گی، اگر اسلام کو سر بلند کرنا ہے تو اس طرف فوراً توجہ کرنی چاہیئے۔ سندھ اور بلوچستان کا حال ان سرحدی مسلمانوں سے بھی گیا گزرا ہے، مشرقی بنگال کے دیہاتی مسلمانوں کا حال بھی خراب ہے۔ دین سے ناواقفیت کے ساتھ یہاں معاشرت بھی ہندووانہ ہی ہے اندریں حالات ہم وطن عزیز کی بڑی بڑی جماعتوں اور ان کے محترم پیشواؤں کو بصد خلوص و احترام یاد دلاتے ہیں کہ حضرات آپ کا پہلا فرض سیاست نہیں بلکہ دین کی تبلیغ و اشاعت ہے۔ اس واسطے کچھ عرصہ کے لیے سیاسی سرگرمیاں کم کر کے اس طرف توجہ فرمائیں۔ پاکستان کے دُور افتادہ دیہات میں جا بجا اپنے مستقر قائم کریں اور وہاں کے نام نہاد مسلمانوں کو پکا مسلمان بنانے کا فرض بجا لائیں تا کہ آپ کا پاکستان واقعی معنوں میں پاک اور ایک اسلامی مُلک اور اسلامی اجتماعی قوّت کا خزینہ بن جائے۔ اگر آپ کو خدشہ ہے کہ اس طرح آپ کے سیاسی عزائم کو نقصان پہنچے گا تو یقین مانئے کہ ان علاقوں میں کچھ عرصہ کام کرنے کے بعد یہاں کے باشندے آپ کے اس قدر مطیع و مُنقاد ہو جائیں گے کہ انتخابات اور دوسرے سیاسی مقاصد کے لیے ہمیشہ آپ ہی کا ساتھ دیں گے اور اگر آپ کو خیال ہے کہ اتنے بڑے کام کے لیے روپیہ کہاں سے آئے گا تو بھی یقین رکھئے کہ قوم میں مخیّر اور ایثار کرنے والے حضرات کی کمی

نہیں، جب ان سے امداد طلب کریں گے تو ناکام واپس نہ آئیں گے، ہاں شرط یہ ہے کہ آپ کی تنظیم مکمّل اور لوگوں کا اعتماد آپ کو حاصل ہو۔

ہمارے علمائے دنیا:

علمائے دُنیا سے ہماری مراد ماڈرن تعلیم یافتہ گریجویٹ اور ڈاکٹر وغیرہ ہیں۔ یہ لوگ علمائے دین کے مقابلہ میں بیرونی دُنیا کے حالات خصوصاً ان قوّتوں سے بہت زیادہ واقف ہیں جو ہمارے معیشتی اور معاشرتی معاملات پر اثر انداز ہوتی ہیں۔لیکن افسوس کہ ان میں سے بہت زیادہ اصحاب دینی نظریات وحقائق سے قطعاً بے بہرہ ہیں اور ہمارے قومی امراض کا علاج نہیں کر سکتے۔ دنیاوی لحاظ سے بھی یہ ابھی تک اس قابل نہیں کہ مفید اختراعات اور ایجادات کے ذریعہ ہی اپنی قوم کو دوسری قوموں کے برابر لا کھڑا کریں۔ ان حضرات کی زیادہ تعداد سرکاری دفاتر میں مصروفِ کار رہے۔''مصروفِ کار'' شاید صحیح لفظ نہیں ''مصروفِ کارزار'' کہا جائے تو زیادہ موزوں ہوگا۔ان کی لیاقت اور وسیع الخیالی سے امید تھی کہ یہ حکومت کے دفتری ماحول کو زیادہ خوشگوار بنا کر گورنمنٹ کے کام کو آسانی سے چلانے میں مدد دیں گے اور دفاتر میں اسلامی یکجہتی، محبت و اخوت، مساوات، انصاف، تعاون، خدمتِ خلق اور قوّتِ عمل کے روح پرور جذبات پیدا کر کے عوام کو اپنی حکومت کا والہ وشیدا اور سچا خیر خواہ بنائیں گے۔لیکن حیف صد حیف کہ ان حضرات کی بھاری اکثریت باوجود اس قدر تعلیم یافتہ اور ''روشن خیال'' ہونے کے دفاتر میں اقربا پروری، علاقائی منافرت، اور صوبائی تعصب کی آگ بھڑکا کر وہاں کے ماحول کو گندہ سے گندہ تر بنانے میں منہمک ہے اور قوم کو طاقتور بنانے کی بجائے اور کمزور کر رہی ہے۔ان ماڈرن تعلیم یافتہ حضرات میں سے جو لوگ کالجوں اور سکولوں میں معلموں کے فرائض انجام دیتے ہیں، بڑا کام کر سکتے ہیں۔ آئندہ آنے والی نسلوں کا کردار اسلامی اور قومی سانچے میں ڈھالنے والے یہی لوگ ہیں۔ اگر یہ

چاہیں تو پچیس تیس برس میں سارے مُلک کی کایا پلٹ سکتی ہے۔ بچوں میں صحیح اسلامی اخلاق، اخوت و محبت، شجاعت اور اسلام و وطن پر مر مٹنے کا جذبہ پیدا کرنا ان معلمین کے لیے جس قدر آسان ہے کسی اور کے لیے ہرگز نہیں ہوسکتا۔ دیکھنا یہ ہے کہ وہ اپنے فرض کو محسوس کر کے ادا کرتے ہیں یا نہیں؟

ہمارے ادیب اور شاعر:

علماء اور معلمین کے بعد قومی کردار کی تعمیر و ترقی میں سب سے بڑا حصّہ ادیبوں اور شعراء کا ہوتا ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے اُردو ادب اور شاعری کی بُنیاد ہی اس وقت پڑی جب ہمارا تنزّل تخریب کی انتہائی گہرائیوں تک پہنچ چکا تھا۔ اِس لیے اس زمانہ کی نثر و نظم کے تمام ذخائر سے قنوطیت، بے عملی اور بازاری عشق بازی کے سوا اور کسی قسم کی تعلیم نہیں ملتی۔ الف لیلیٰ فسانۂ عجائب، آرائش محفل، گل بکاؤلی اور طلسم ہوشربا وغیرہ اور اس زمانے کے شعراء کا کلام پڑھنے کے بعد ذہن میں اس کے سوا کچھ نہیں آتا کہ کیمیا بنانی آجائے، کوئی خزانہ یا پارس پتھر مل جائے یا دستِ غیب کا کوئی عمل ہاتھ لگے۔ یہ نہیں تو کوئی جن پری یا ہمزاد ہی تابع ہوجائے جو سونے اور چاندی کے ڈھیر لا کر قدموں میں ڈال دے اور جب یہ دولتِ لازوال حاصل ہوجائے تو اس کو عیاشی اور اوباشی میں خرچ کر کے خوب لطفِ زندگی اٹھایا جائے۔ لیکن یہ حالت ہمیشہ نہ رہی، انیسویں صدی کے آخری رُبع میں سنجیدہ قسم کے ادب کی بُنیاد پڑی اور ایسے ادیب اور شاعر بھی پیدا ہوئے جنہوں نے اسلامی اخلاق کی تعلیم دے کر قوم کو صحیح معنوں میں مسلمان بنانا چاہا۔ ان لوگوں کا بہت کافی اثر ہوا، لیکن افسوس کہ ان کی تعداد بہت کم تھی اور وہ قوم کو من حیث الکل بیدار نہ کر سکے۔ آج بھی ہمارے ادیبوں اور شاعروں میں ایسے لوگوں کی تعداد انگلیوں پر گنی جاسکتی ہے جو اعلیٰ اور مفید قسم کا لٹریچر پیدا کر رہے ہیں اور ہمارے اسلامی اخلاق کو ابھارنے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ قوم کی

عام جہالت، پستیٔ اخلاق اور بدمذاقی کی وجہ سے اچھا لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی نہیں ہوتی اور جو لوگ ادنیٰ اور معمولی قسم کی کتابیں، ناول، افسانے، تمثیلیں وغیرہ لکھتے ہیں وہ بہت جلد کثیر مالی منافع حاصل کر لیتے ہیں۔ لیکن اس سے ہمارے اچھے ادیبوں کو ہمت نہ ہارنی چاہئے اور ایک اسلامی و قومی فرض سمجھ کر اپنا کام جاری رکھنا چاہئے۔ وہ وقت دُور نہیں جب اِن کو بھی اپنے ایثار و خدمت کا کافی سے زیادہ معاوضہ مل جائے گا۔ ادنیٰ قسم کے لکھنے والے بھی اگر خدا سے ڈریں تو اپنی تصانیف میں کوئی نہ کوئی پہلو ایسا رکھ سکتے ہیں جس سے اخلاقِ اسلامی کی تبلیغ ہو سکے۔ فلم ساز کمپنیاں اس لحاظ سے بہت قابلِ قدر خدمت کر سکتی ہیں، لیکن اب تک بہت ہی کم فلم ایسے بنائے گئے ہیں جن سے اخلاق، اخوت و محبت اور قوم پروری کے جذبات پروان چڑھ سکتے ہیں، یہ کرنے کا کام ہے، فلم ساز کمپنیوں کو بہت جلد اس طرف توجہ کرنی چاہئے۔

ہمارے صوفی:

صوفیائے کرام اور مشائخِ عظام کا فرض اور کام صرف یہ تھا کہ سچے طالبوں کو اللہ کا راستہ بتائیں، یعنی غیب کی جن باتوں پر ہمارے عقائد کی بُنیاد قائم ہے ان کی معرفت حاصل کرنے کے طریقے سکھائیں تاکہ ان کا ایمان کامِل اور اُن کا اخلاق مکمّل ہو جائے، یہ کام صرف دو تین صدی ہجری تک تو رسولِ خداؐ کی تعلیم کے مطابق ہوتا رہا، لیکن بعد میں دین کی ظاہری تعلیم کی طرح اس میں بھی خرابیاں پیدا ہونے لگیں۔ ان صوفیوں نے اُن بزرگانِ دین کی قبروں کو بھی مسجود بنا دیا جنہوں نے اپنی تمام عمر توحید کے مواعظ میں صرف کی تھی۔ انہوں نے خود ان بزرگوں کی قبروں پر سجدے کیے اور اپنے مریدوں سے خود اپنے آپ کو سجدے کرائے۔ ان لوگوں نے اپنے مریدوں کو یہ سبق پڑھایا کہ یہ مرنے والے بزرگ زندگی میں بھی قادر، قیوم اور قاضی الحاجات تھے اور اب مرنے کے بعد بھی خدا کی طرح حاضر و ناظر

قادر و قیوم اور قاضی الحاجات ہیں۔ انہوں نے اپنے متعلق بھی یہی کہا کہ ہم جو چاہیں کر سکتے ہیں، تقدیریں بدل سکتے ہیں اور جس کو چاہیں بنا اور بگاڑ سکتے ہیں۔ اب حال یہ ہے کہ توحید کا وعظ کہنے والے اور حکمت و معرفت کی باتیں بتانے والے ناپید ہیں اور جو ہیں وہ بھی ابنائے زمانہ کی ناقدری کے سبب گوشوں میں چھپے گمنامی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ عوام ان کی بات بھی نہیں پوچھتے۔ اب تو عوام نجومیوں، رمّالوں، پامسٹوں اور گنڈے تعویذ کرنے والے عاملوں ہی کو اولیاء اللہ سمجھتے ہیں یا پھر اُن لوگوں کو جن کی بابت یقین کیا جاتا ہے کہ ان کے تابع کوئی موکل، روح، ہمزاد یا جنّ ہے جو بیٹھے بیٹھے دُور دراز جگہوں سے چیزیں منگا دیتے ہیں، کچھ خبریں بتا دیتے ہیں یا مریضوں کا علاج کرتے ہیں۔ یہ نجومی، رمّال، پامسٹ اور عامل وغیرہ دین یا تصوّف کی الف بے تے سے بھی واقف نہیں ہوتے، اِس لیے نہ تو خود شعارِ دین کی پابندی کرتے ہیں نہ دوسروں کو تلقین کر سکتے ہیں۔ صرف اپنی جیبیں بھرتے اور مسلمانوں کا ایمان و اخلاق خراب کرتے رہتے ہیں۔ ان کے علاوہ کچھ اور لوگ بھی ہیں جو فقیر اور بزرگ سمجھے جاتے ہیں اور ملنگ یا قلندر وغیرہ کہلاتے ہیں۔ یہ لوگ شریعت کے مطلق پابند نہیں ہوتے بلکہ بھنگ اور چنڈو وغیرہ پیتے اور چرس کے دم لگا کر ہو حق مچاتے رہتے ہیں۔ ان میں بعض آدمی ایسے بھی ہوتے ہیں جن سے کبھی کبھی خوارق عادات یعنی کرامات بھی ظاہر ہو جاتی ہیں، ان خوارق عادات کی وجہ سے ایک طرف تو لوگ ان کی بزرگی کے قائل ہو جاتے ہیں دوسری طرف ان کی غیر شرعی زندگی کو دیکھ کر یہ رائے قائم کر لیتے ہیں کہ بزرگی حاصل کرنے کے لیے شریعت کی پابندی کچھ ضروری نہیں۔ یہی لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ شریعت اور چیز ہے اور طریقت و معرفت اور شے۔ اس عقیدے سے ملّتِ اسلامیہ کو سخت نقصان پہنچا ہے اور پہنچ رہا ہے، اِس لیے ہم یہ بات اچھی طرح واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ اس قسم کے غیر شرعی فقیروں کا فقر، فقرِ محمدیؐ نہیں ہوتا بلکہ یہ لوگ ہندوؤں کے یوگ وغیرہ کی

مشقیں کر کے یہ قوّتیں حاصل کر لیتے ہیں جن کو روحانی قوّت سمجھا جاتا ہے۔

یاد رکھیئے اور اچھی طرح یاد رکھیئے کہ کچھ غیر معمولی روحانی طاقتیں حاصل کرنے کے علوم ہر قوم اور ہر مذہب حتّٰی کہ افریقہ کے وحشی قبائل میں بھی موجود ہیں اور ہزار ہا سال سے چلے آتے ہیں، ان سے اسلامی فقر یا تصوّف کو دُور کا واسطہ بھی نہیں۔ فقرِ محمدیؐ تو وہ ہے جو صرف رسول اللہؐ کے نقشِ قدم پر چل کر اور شریعت کی پوری پابندی کر کے حاصل ہوتا ہے۔ یہاں آپ کے دل میں یہ سوال پیدا ہوگا کہ پھر ہم میں اور ان میں کیا فرق ہے اور ہمارے فقر کو ان غیر مسلموں کے فقر پر کیا فضیلت حاصل ہے؟ اس سوال کا پورا جواب تو ہم آگے دیں گے۔ یہاں صرف یہ بتا دیتے ہیں کہ غیر مسلم فقیروں کی انتہائی معراج عملی سلوک کے صرف اس مقام تک ہے جس کو اصطلاح تصوّف میں ''ھُو'' کہتے ہیں اور جہاں عالمِ مثال ختم ہوتا ہے۔ لیکن مسلمان اولیاء اللہ کی پرواز اس سے بہت آگے عالمِ اَمر کے دوسرے طبقات حتیٰ کہ عرش کبریا تک ہے، جہاں ان کو ذات باری تعالیٰ کا صحیح عرفان حاصل ہوتا اور توحید خالص کے معنی سمجھ میں آتے ہیں۔ علاوہ ازیں غیر مسلم اقوام کے تصوّف کی انتہا صرف کرامات دکھانا ہے جس سے بنی نوع انسان کو کوئی خاص فائدہ نہیں ہوتا ہے اور ہوتا بھی ہے تو بہت معمولی، ہاں کرامات دکھانے والوں کو البتہ یہ فائدہ ہوتا ہے کہ وہ عوام میں مشہور ہو جاتے ہیں اور خوب پُجتے ہیں۔ لیکن عوام کو اس سے یہ نقصان پہنچتا ہے کہ وہ صراط المستقیم سے ہٹ جاتے ہیں اور خدا کو بھول کر ان کراماتیوں کی پرستش کرنے لگتے ہیں، اسی لیے اسلامی تصوّف کا مقصد کرامات دکھانا نہیں بلکہ آدمی میں ایمانِ کامِل پیدا کر کے اس کو ''انسان'' بنانا اور اس تعلیمِ الٰہی پر چلانا ہے، جس پر چل کر پوری نوع انسان دین و دُنیا دونوں کی فلاح حاصل کر سکتی ہے۔ اس بات سے ظاہر ہو جائے گا کہ اسلامی تصوّف کا دائرہ افادیت کتنا وسیع اور کس قدر عالمگیر ہے۔ یہاں آپ کے دل میں پھر یہ سوال پیدا ہوگا کہ اگر یہ بات ہے تو پھر

ہمارے بڑے بڑے اولیاء اللہ نے کرامتیں کیوں دکھائیں۔ جواب یہ ہے کہ انہوں نے کرامتیں مسلمانوں کو ہرگز نہیں دکھائیں بلکہ غیر مسلموں کو دکھائیں تاکہ انہیں معلوم ہو جائے کہ یہ قوّتیں صرف انہیں کے جوگیوں اور راہبوں کے لیے مخصوص نہیں بلکہ مسلمان بزرگوں میں بدرجۂ اولیٰ موجود ہیں اور یہ دیکھ کر وہ ایمان لے آئیں۔ یاد رکھئے کہ رسول اللہؐ سے معجزات کبھی کسی مسلمان نے طلب نہیں کیے بلکہ ہمیشہ کفار ہی نے طلب کیے تھے۔ اسی طرح اولیاء کی کرامات بھی مسلمانوں کے لیے نہیں صرف غیر مسلموں کو مسلمان بنانے کے لیے ہوتی ہیں۔

ملنگوں، قلندروں اور غیر شرعی فقیروں کے علاوہ ایسے صوفی، بزرگ اور پیر بھی بکثرت ہیں جو تصوّف کے مستند خاندانوں کے طریقوں سے سلوک طے کرتے اور اپنی مُراد کو پہنچتے ہیں، لیکن آج کل ان میں بھی تعداد کثیر ان صوفیوں کی ہے جو مسلمانوں کو توحید کا سبق نہیں بلکہ شرک کی تعلیم دیتے ہیں۔ خاص خاص سچے اور اچھے بزرگوں کو چھوڑ کر عام حالت یہ ہے کہ ان پیروں کی بڑی بڑی بارگاہیں ہیں جہاں بادشاہی شان وشوکت بھی ماند نظر آتی ہے۔ ان پیروں کے رعب اور دبدبے کا یہ عالم ہوتا ہے کہ بات کرنا تو بڑی بات ہے، لوگ آنکھ اٹھا کر بھی ان کو نہیں دیکھ سکتے، اس طرح بیٹھے رہتے ہیں جیسے نماز میں بیٹھتے ہیں۔ اکثر پیر صاحبان اپنے آپ کو سجدے بھی کراتے ہیں، یہاں طریقت ومعرفت کی کوئی تعلیم نہیں دی جاتی۔ مریدوں کو اتنے لمبے لمبے اوراد اور وظیفے بتا دیئے جاتے ہیں کہ اگر وہ ان کو پورا کریں تو روزی کمانے کا وقت بھی نہیں مل سکتا۔ آج کل کے تصوّف کا سب سے بڑا کارنامہ اور مظاہرہ سالانہ عرس ہیں۔ ان عرسوں میں کیا ہوتا ہے؟ معدودے چند مزارات کو چھوڑ کر باقی ہر جگہ نذرانے، مٹھائیاں اور چادریں وغیرہ چڑھائی جاتی ہیں، عرضیاں گزارنی اور منتیں مانی جاتی ہیں، سجدے کیے جاتے ہیں، رنڈیاں اور قوال گاتے بجاتے اور لوگ مزے اڑاتے

ہیں۔اس میں شبہ نہیں کہ ہمارے اکثر و بیشتر اولیائے عظام نے گانا اور قوالیاں سنی تھیں، لیکن انہوں نے سماع کے کچھ قواعد مقرّر کر رکھے تھے مثلاً محافلِ سماع ایک خاص مکان اور ایسے مطہر اور پاک ماحول میں منعقد کی جاتی تھیں جہان اہلِ دل اور صاحبِ حال بزرگوں کا موجود ہونا لازمی تھا۔قوال اور گویے بھی تعلیم یافتہ اور اہلِ دل ہوتے تھے۔ان محفلوں میں حمد، نعت، منقبتیں اور ایسی غزلیں، نظمیں اور گیت گائے جاتے تھے جنہیں سُن کر سامعین کے دل میں اللہ اور رسولؐ کے عشق کی آگ بھڑک اٹھتی تھی۔اس قسم کی محافلِ سماع سے یقیناً فائدہ ہوتا تھا اور اب بھی ہوتا ہے لیکن اب ایسی محفلیں شاذ و نادر ہی ہوتی ہیں۔اب تو حالت یہ ہے کہ جس کا جی چاہا اسی نے کھلے میدان میں یا سڑک کنارے ایک شامیانہ کھڑا کیا اور محفل سماع منعقد کر لی۔ان محفلوں میں صاحبِ حال سامعین ہوتے ہیں نہ اہلِ دل قوال۔اہلِ دل ہونا تو بہت بڑی بات ہے، ان ڈوموں اور قوالوں کو تو پاکی اور ناپاکی کا لحاظ بھی نہیں ہوتا، پھر چیزیں وہ گائی جاتی ہیں جن میں حُبِّ خدا کا سوز ہوتا ہے نہ عشقِ رسولؐ کا گداز، حرارت توحید کا جلال ہوتا ہے نہ نور رسالت کا جمال۔عام طور پر جن بزرگوں کی یادگار میں یہ عرس منایا جاتا ہے ان کی ذات کو خدا اور ان کے آستانہ کو کعبہ سے بھی بڑھا دیا جاتا ہے۔الغرض یہ عرس کیا ہوتے ہیں، تبلیغ شرک وکفر کے ریڈیو اسٹیشن ہوتے ہیں۔اگر ہمارے پیرزادگان اور سجادہ نشین صاحبان چاہیں تو ان عرسوں میں توحید و رسالت، اخلاقِ محمدیؐ اور بزرگانِ دین کے کردار ہائے بلند پر تقریریں کرا کے مسلمانوں کو بے قیاس فائدہ پہنچا سکتے ہیں۔خدا جانے وہ وقت کب آئے گا۔

ہمارے اُمراء:

ہمارے اُمراء کے اخلاق و اطوار میں پہلے کی نسبت نمایاں فرق ہوتا جا رہا ہے۔قوّتِ عمل بھی بڑھ رہی ہے۔عوام کی ہمدردی اور قومی ترقی کے لیے ایثار و قربانی کا خیال بھی پیدا

ہورہا ہے لیکن اچھے لوگوں کی تعداد ابھی تک اس قدر قلیل ہے کہ قوم کو اجتماعی حیثیت سے کوئی معتد بہ فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ عام طور پر یہ لوگ دولت کو صرف اپنے ذاتی آرام و راحت پر خرچ کرنا ہی مقصد حیات جانتے ہیں۔ اکثر ایسے ہیں کہ دولت کمانے کے کسی نازیبا اور ناجائز وسیلے کو اختیار کر لینے میں انہیں کوئی باک نہیں، وہ ذخیرہ اندوزی ہو یا چور بازاری، رشوت ستانی ہو یا جعلسازی۔ سب سے بڑا عیب ان میں یہ ہے کہ دولت و ثروت کے نشہ میں خدا اور اپنی موت کو بھی بالکل بُھلا بیٹھتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی طرف کبھی غور نہیں کرتے کہ ''دیکھنا یہ مال و دولت تم کو ہماری یاد سے غافل نہ کر دے'' اللہ کی یاد سے غافل ہونے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے، ان کے اعمال اور اخلاق خراب ہو جاتے ہیں۔ ان کو سکون و اطمینان کبھی میسّر نہیں آتا اور باوجود دولت کی فراوانی کے ہمیشہ پریشان خاطر رہتے ہیں۔ یاد رکھئے کہ سکون و اطمینان اور مُسرّتِ حقیقی دولت سے نہیں بلکہ نیکی سے حاصل ہوتی ہے ایک اور بڑا عیب ان میں یہ ہے کہ یہ غریب مسلمانوں بلکہ اپنے غریب رشتہ داروں تک کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں اور اُن سے سیدھے منہ بات کرنا بھی کسرِ شان سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ غریب طبقہ بھی ان امیروں کو حقیر اور ذلیل سمجھتا ہے اور دل سے اُن کی مطلق کوئی عزت نہیں کرتا۔ اس طرح طبقاتی نفرت کی بُنیاد پڑتی اور کمیونزم کے خیالات ترقی پاتے ہیں۔ اگر یہ اُمراء غریب لوگوں سے عزت کے ساتھ پیش آئیں اور جب موقع ملے محبت اور عزت کے لہجہ میں بات چیت کریں تو حالات بہت کچھ سدھر سکتے ہیں۔ اُمراء کو یاد رکھنا چاہئے اس میں ان کا ایک پیسہ بھی خرچ نہیں ہوتا، صرف شیریں زبانی سے لوگوں میں ہر دلعزیزی حاصل ہوسکتی ہے۔ ''اے امیرو! آپ کے غریب بھائی آپ سے صرف یہ چاہتے ہیں کہ آپ اُن سے محبت اور عزت سے پیش آیا کریں اس کے سوا اور کچھ نہیں''۔

ہمارے حُکّام:

حُکّام اپنی قوم کے معمار ہی نہیں محافظ، چوکیدار اور خادم بھی ہوتے ہیں، بلکہ حقیقی معنوں

میں ''خادمانِ قوم'' یہی لوگ ہیں، کیونکہ ان کا رزق ہی خدمتِ قوم پر منحصر ہے۔ لیکن مسلمانوں میں تو بہت ہی کم افسر ایسے ہیں جو اپنے آپ کو قوم کا خادم سمجھتے ہوں۔ عام طور پر تو یہ عوام کو اپنی رعایا اور اپنے آپ کو ان کا مالک ہی جانتے ہیں۔ یہ خیال مطلق العنان بادشاہوں کے زمانہ میں پیدا ہوا تھا لیکن اب تک موجود ہے، حالانکہ اب جمہوری حکومت ہے۔ ہمارے حُکّام کو چاہئے کہ بہت جلد اس نظریہ کی اصلاح کرلیں۔ حُکّام کا فرض یہ ہے کہ جو کام ان کے سپُرد ہو اسے محنت اور دیانت سے انجام دیں اور اپنے فرائض منصبی کو جس کی وجہ سے انہیں روٹی بھی ملتی ہے اور عزّت بھی، دردِ سر نہ جانیں۔ یہ ایک سچا واقعہ ہے کہ ایک مقدمے کے سلسلہ میں بحالیات کے ایک بہت بڑے افسر نے ایک مہاجر کو اس کی الاٹ شدہ جائیداد سے محروم کر کے وہی جائیداد ایک مقامی آدمی کو الاٹ کر دی، اِس پر جب مہاجر نے عرض کیا کہ جناب تو پھر میں کہاں جاؤں، اور کیا کھاؤں تو ان افسر صاحب نے بہ صد جاہ وجلال انگریزی میں فرمایا کہ ''یو گو ٹو ہیل، یو آر ناٹ مائی ہیڈک۔ مائی ہیڈک آر دوز ہو ہیو سیٹلڈ ہیئر''، یعنی ''تم جاؤ جہنم میں تم میرا دردِ سر نہیں ہو، میرا دردِ سر تو وہ لوگ ہیں جو یہاں آباد ہوئے ہیں'' ملاحظہ فرمایا آپ نے یہ شخص جس کام کی روٹی کھاتا تھا اور جس کی وجہ سے اس کی تمام عزت تھی اسی کو دردِ سر سمجھتا تھا۔

ایک ایسا ہی واقعہ خود ہم کو پیش آیا۔ واقعہ یہ ہے کہ ستمبر ۱۹۴۷ء میں جب دہلی میں مسلمانوں کا قتل عام ہو رہا تھا تو ایک دن ہمارے ہندو ہمسایوں نے ہم سے کہا کہ آپ آج رات ہونے سے پہلے پہلے یہاں سے تشریف لے جائیں ورنہ رات کو آپ کے مکان پر حملہ ہو جائے گا، فیصلہ ہو چکا ہے۔ جس وقت یہ نوٹس ملا شام کے چار بجے تھے۔ سخت پریشانی تھی کہ کہاں جائیں اور کیونکر جائیں۔ پورے گھر کو اٹھا کر لے جانا مذاق تو نہ تھا، کئی تانگوں کی ضرورت تھی مگر تانگہ سو سو روپیہ میں بھی نہ ملتا تھا۔ اسی پریشانی میں یکایک خیال آیا کہ ہمارے

ایک بیس سالہ پرانے دوست جو کبھی کلرک تھے، ٹرانزٹ آفس میں افسر لگے ہوئے ہیں۔ ہم نے ایک بچے کو رقعہ دے کر موٹر سائیکل پر ان کے پاس بھیجا اور اپنی پریشانی اور حملہ کی خبر کا حال لکھ کر استدعا کی کہ ٹرک بھیج دیجیے تا کہ ہم گھر بار سمیت ٹرانزٹ آفس پہنچ جائیں۔ ہم پورے یقین کے ساتھ ٹرک کی آمد کے منتظر تھے کہ بچہ بے نیلِ مرام واپس آیا اور کہا کہ انہوں نے فرمایا ہے کہ ''ہم ٹرک صرف مُردہ لاشوں کو ڈھونے کے لیے بھیجتے ہیں زندوں کو لانے کے لیے نہیں'' یہ جواب سُن کر سنّاٹا آ گیا۔ ہمارے ہندو پڑوسیوں کو جب یہ معلوم ہوا تو انہوں نے آدھ گھنٹے کے اندر اندر ہمارے لیے ٹرک کا بندوبست کر دیا اور ہم بخیریت ٹرانزٹ آفس پہنچ گئے۔ دوسرے دن ہم ان افسر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے تو ہم نے دیکھا کہ جو شخص بھی کسی کام کے لیے ان صاحب کے پاس آتا تھا اسے وہ یہی جواب دیتے تھے کہ ''تم میرے دردِسر میں اضافہ کر رہے ہو'' تعجب ہے کہ یہ لوگ جس کام کی روٹی کھاتے ہیں اسی کو دردِسر بتاتے ہیں اور بے شرمی یہ کہ اس سے مستعفی بھی نہیں ہوتے۔ ایسے افسروں سے کیا امید کی جا سکتی ہے کہ خلقِ خُدا کی خدمت کریں گے۔ یہی لوگ عوام کو بدظن کرتے اور حکومت کی کمزوری کا باعث ہوتے ہیں۔

ہمارے حُکّام اور عمّال کا ایک فرض یہ بھی ہے کہ اہلِ معاملہ کے ساتھ عزت اور نرمی سے پیش آئیں اس میں شک نہیں کہ ''سرخ فیتے'' کی لعنت کے سبب معمولی سے معمولی کام بھی زیادہ سے زیادہ دیر میں ختم ہوتا ہے، لیکن اس میں کارکنانِ دفتر اور افسران متعلقہ کی سُستی، بے پروائی اور بسا اوقات نا اہلی کو بھی بڑا دخل ہوتا ہے۔ غضب خدا کا ہمارے پاکستان میں فوجداری مقدمات بھی تین تین اور چار چار برس میں ختم ہوتے ہیں اور لوگوں کے جائز مطالبات برسوں بھی ادا نہیں کیے جاتے۔ سب کچھ ہو جاتا ہے تو اکثر آڈٹ والے اپنی نالائقی یا کارکردگی دکھانے کی وجہ سے خوامخواہ کے فضول اعتراضات کر کے ادائیگی کو تعویق میں

ڈالے رکھتے ہیں۔ کچھ تعجب نہیں کہ بعض معاملات میں ادائیگی کا فیصلہ اس وقت ہوتا ہو جب کہ مطالبہ کرنے والا اس دُنیا ہی سے کوچ کر جاتا ہو۔

یہ حالات نہایت ہی شرمناک ہیں۔ حکومت کو لازم ہے کہ اپنی ہر دلعزیزی قائم رکھنے کے لیے ایسے افسروں اور عمّال کو سخت سزائیں دے۔ اگر وہ ایسا کرنے کی مجاز نہیں ہے تو اسمبلی کے ممبروں کو چاہیئے کہ اس کے لیے قانون وضع کریں۔ اور کاموں میں دیر ہو جائے تو پبلک برداشت کر سکتی ہے مگر عدالتی مقدمات اور مطالباتِ زر کی ادائیگی میں تعویق کو کسی طرح بھی برداشت نہیں کیا جا سکتا اور جو لوگ اس کا شکار ہوتے ہیں وہ ہر وقت اور ہر جگہ حکومت کو بدنام کرتے پھرتے ہیں۔ امید واثق ہے کہ ہماری حکومت خود اپنی بھلائی کی خاطر اس طرف توجہ کرے گی۔ ہمارے افسران اور حُکّام کے اور بھی بہت سے فرائض ہیں لیکن بخوف طوالت ان سب کو حذف کر کے اب ہم کچھ حال زوالِ ملّت کے خارجی اسباب کا بیان کرتے ہیں۔

زوالِ ملّت کے خارجی اسباب:

پہلی وجہ: حضرت عثمانؓ کی شہادت تھی۔ منافقین اور دشمنان اسلام کی یہ پہلی کامیاب کوشش اور پہلی چنگاری تھی جو اسلامی خرمنِ اتّحاد میں ڈالی گئی۔

دوسری وجہ: حضرت علیؓ سے حضرت عائشہؓ اور حضرت امیر معاویہؓ کی جنگیں تھیں، یہ تیل کا پہلا قطرہ تھا جو اس چنگاری کو بھڑکانے کے لیے ڈالا گیا۔

تیسری وجہ: حضرت امام حسینؓ کی شہادت تھی۔ یہ تھی منافقین کی آخری اور کامیاب کوشش اس آگ کو شعلۂ جوّالہ بنانے کی، جس نے مسلمانوں کے اتّحاد کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جلا کر خاک سیاہ کر دیا۔

چوتھی وجہ: تھی اسپین کی سلطنتِ اسلامیہ کا زوال۔ اگر چہ یہ زوال حقیقتاً مسلمانوں کی

اپنی کمزوریوں سے ہوا لیکن اسپین کی عیسائی ریاستوں اور شاہ فرڈینیڈ کی کوششیں بھی اس کا سبب تھیں۔ اسپین کے زوال سے مسلمانوں کے اقتدار کو بڑا دھچکا لگا اور عیسائی دُنیا کے دل سے ان کا رعب و وقار بالکل جاتا رہا۔

پانچویں وجہ: صلیبی جنگیں تھیں۔ یہ جنگیں ۱۰۹۶ء سے شروع ہو کر کم و بیش دو سو برس تک جاری رہیں۔ اگرچہ ان جنگوں کا نتیجہ عیسائیوں کے خلاف نکلا، یعنی بیت المقدس مسلمانوں کے پاس رہا اور آخری جنگ میں شام کا وہ بچا کھچا علاقہ بھی مسلمانوں نے چھین لیا جو اس وقت تک عیسائیوں کے قبضہ میں تھا، لیکن نفسیاتی طور پر مسلمانوں کو جو نقصان اور عیسائیوں کو جو فائدہ ان جنگوں سے ہوا وہ شاید کسی طرح بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ مسلمانوں کو نقصان یہ ہوا کہ وہ دشمن کی طرف سے بے فکر ہو کر آپس کی خانہ جنگیوں میں مبتلا ہو گئے۔ عیسائیوں کو فائدہ یہ پہنچا کہ دو سو برس کے متواتر پروپیگنڈے کی وجہ سے تمام عیسائی ممالک آپس کی تمام دشمنیاں بھول کر مسلمانوں کے خلاف متحد ہو گئے۔ ان میں مذہبی جوش کے ساتھ ساتھ اپنی کمتری کا احساس اور مسلمانوں کے مقابلہ میں ترقی کا جذبہ اُبھر آیا۔ علاوہ ازیں وہ لڑائی کے نئے نئے طریقے اور بہترین قسم کا سامانِ حرب بھی بنانا سیکھ گئے مثلاً محاصرے کی نئی ترکیبیں، توپ خانہ کا استعمال، سرنگیں اڑانا، منجنیقیں استعمال کرنا، انہوں نے مسلمانوں سے انہیں جنگوں میں سیکھا، پھر لڑائی اور سفر سے جو تجربہ حاصل ہوتا ہے وہ مزید برآں تھا۔ تجارت ہمیشہ لڑائی کے پیچھے پیچھے چلتی ہے، چنانچہ اب یہ لوگ تجارت کے لیے دُور دراز ملکوں تک پہنچنے لگے اور حق تو یہ ہے کہ یہی باتیں آخر میں مشرقی علوم کے حصول، امریکہ کی دریافت، غیر ملکی فتوحات اور موجودہ ترقی کا سبب بنیں۔

چھٹی وجہ: امریکہ کی دریافت تھی۔ امریکہ کی دریافت کے وقت سلطنتِ ترکی اور دوسری مسلمان ریاستیں یورپین اقوام سے اتنی زیادہ طاقتور تھیں کہ چاہتیں تو امریکہ پر قبضہ کر

سکتی تھیں۔ اگر یہ ہوا ہوتا تو آج دُنیا کا نقشہ ہی کچھ اور ہوتا، لیکن اس زمانے کے مسلمان حکمران عیش وعشرت اور آپس کی خانہ جنگیوں میں اس بُری طرح مُبتلا تھے کہ انہیں اس کا خیال بھی نہ آیا، نہ ان کو خُدا اور رسولؐ کے یہ احکام یاد رہے کہ دُنیا میں سفر کر کے اپنا رزق اور علم حاصل کرو اور خُدا کی بتائی ہوئی تہذیب پسماندہ ملکوں میں پھیلاؤ۔ مسلمانوں کی اِس غفلت کا نتیجہ یہ ہوا کہ فرنگی قوموں نے امریکہ سے بے قیاس دولت حاصل کی جس کے حصول کی کوشش میں اِن کو بے انتہا تجربہ اور علم بھی حاصل ہوا اور امریکہ کی زمین نے ایک نئی قوم کو جنم دیا جو آج ترقی وتمدن کے آسمان پر آفتاب بن کر چمک رہی ہے۔

ساتویں وجہ: یہ تھی کہ واسکوڈے گاما نے افریقہ کے گرد گھوم کر ہندوستان اور مشرقِ وسطیٰ تک پہنچنے کا سمندری راستہ دریافت کر لیا جسکی وجہ سے یورپ اور مشرقی ممالک کے درمیان براہِ راست تجارت شروع ہوگئی۔ اس سے پہلے تجّار تمام سامان تجارت، شام، فلسطین اور مصر کے راستے لاتے اور لے جاتے تھے۔ اب تجارت کا راستہ بدل جانے کی وجہ سے عرب ممالک ان مالی فوائد سے محروم ہو گئے جو ان کے تموّل کا سبب تھے۔

آٹھویں وجہ: انگریزوں اور فرانسیسیوں کا خروج اور ہندوستان میں سلطنتِ مغلیہ کی تباہی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مسلمان بادشاہ اور اُمراء عیش وعشرت کے نشہ میں چُور آپس کی خانہ جنگیوں میں مبتلا تھے۔ مسلمان تجّار کا دیوالیہ نکل چکا تھا۔ مسلمان علماء کا سرمایہ علم صرف خاص مذہبی علوم یعنی تفسیر اور حدیث وفقہ کی لفظی موشگافیوں تک محدود ہو کر رہ گیا تھا اور وہ حالاتِ زمانہ اور علومِ مروجہ سے بے خبر فرقہ وارانہ بحث مباحثوں اور ایک دوسرے کی تذلیل وتکفیر میں مشغول تھے۔ دوسری طرف فرنگی اقوام میں حصولِ دولت و جہانگیری کی تڑپ، نئے نئے علوم وایجادات کے آغاز اور ان تھک قوتِ عمل کی وجہ سے نئی زندگی کا سورج طلوع ہو رہا تھا۔ چنانچہ اِن قوموں نے پہلے تو مسلمان سلاطین کی خوشامد درآمد کر کے

ان سے تجارتی مراعات حاصل کیں پھر ان کی کمزوری اور بے خبری سے فائدہ اٹھا کر رفتہ رفتہ ان کی سلطنتوں کے کھنڈرات پر اپنے محل تعمیر کر لیے۔

ہندوستان پر قبضہ کے لیے انگریز اور فرانسیسی دونوں ہی کوشاں تھے۔ لیکن انگریز جو زیادہ مکّار اور دغا باز تھا کامیاب ہوا۔ اس نے پہلے تو بے انتہا سادگی اور تملق و چاپلوسی سے تجارتی مراعات حاصل کیں، پھر جابجا اپنی تجارتی کوٹھیاں بنا کر ان کی حفاظت کے بہانے سے ہر جگہ اپنی فوجیں کھڑی کر لیں۔ اس کے بعد اس نے نہایت چالاکی اور مکّاری سے ہندو اور مسلمان ریاستوں کو آپس میں لڑانا شروع کیا اور ہر فتحیاب ریاست سے اپنا نذرانہ اور شکرانہ وصول کر کے خوب طاقت پیدا کر لی۔ اب وہ سلطنتِ مغلیہ کو تباہ کرنے کے لیے تیار تھا۔ لیکن اس کے لیے بھی اس نے فنِ حرب سے زیادہ اپنی مکّاری سے کام لیا اور مسلمان نوابوں اور سالاروں کو رشوتیں دے دے کر شاہانِ وقت کا باغی بنا دیا، یہاں تک کہ یہ بادشاہ کمزور ہوتے ہوتے دہلی کے لال قلعہ میں مقید ہو گئے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں یہ قید و بند بھی ختم ہوئی۔ سلطنتِ مغلیہ کا آخری تاجدار بہادر شاہ جلاوطن کر کے رنگون بھیج دیا گیا اور انگریز بلا شرکتِ غیرے ہندوستان کے حکمران بن گئے۔ انگریز نے ہندوستان کے مسلمانوں کو تباہ کرنے میں جس مکّاری، دغابازی، چالاکی اور ہوشیاری سے کام لیا اور جو ظلم و ستم توڑے ان کا حال صفحاتِ تاریخ سے معلوم کیا جا سکتا ہے، یہاں اس بیان کی گنجائش نہیں۔

نویں وجہ: سلطنتِ ترکی کی تباہی تھی۔ ترکی کو تباہ کرنے کے لیے انگریز نے دوسری پالیسی اختیار کی۔ ایک طرف اپنی چالاکیوں اور ریشہ دوانیوں سے مصر کو ترکی سے الگ کرایا، دوسری طرف روسیوں، فرانسیسیوں اور دیگر فرنگی اقوام کا ایک متحدّہ محاذ قائم کر کے ان تمام ممالک میں ترکوں کے خلاف بغاوتیں کرائیں جو دریائے ڈینیوب کے جنوب میں مشرق سے مغرب تک ترکوں کے قبضہ میں تھے۔ پھر سب دولِ یورپ کی پنچائتیں اور کانفرنسیں کرا

کرا کے ان کو آزاد کرا دیا۔ جب ترکی اس حد تک کمزور ہو گیا تو آخری ضرب پہلی جنگ عظیم میں لگائی، یعنی عربوں کے غدار اُمراء کو طرح طرح کا لالچ دے کر ترکوں کے خلاف بغاوت کرا دی اور اس طرح تمام عربی ممالک ترکی سے الگ ہو گئے۔ انگریز کی کوشش تو یہ تھی کہ ترکی کا وجود بھی باقی نہ رہے، لیکن اللہ نے ایک مردِ مجاہد پیدا کیا جس کا نام مصطفےٰ کمال پاشا تھا، جس نے ترکی کو مرنے سے بچا لیا، موجودہ ترکی اسی مجاہد کے خون پسینے کی یادگار ہے۔

سب سے بڑا نقصان جو انگریز نے اپنے اقتدار اور پروپیگنڈا سے ملّتِ اسلامیہ کو پہنچایا وہ یہ تھا کہ مسلمانوں کے دل سے وحدتِ اسلامیہ کے ملی جذبہ کو فنا کر کے وطنی قومیت کا جذبہ پیدا کر دیا، یہاں تک کہ حالاتِ زمانہ سے بے خبر بھولے بھالے علمائے کرام بھی یہ کہنے لگے کہ قومیں ادیان سے نہیں بلکہ اوطان سے بنتی ہیں۔ اب حال یہ ہے کہ ہر مُلک کا مسلمان دوسرے مُلک کے مسلمان کو غیر اور اجنبی خیال کرتا ہے۔

دسویں وجہ: ہندو کی ترقی اور اسلام دشمنی تھی۔ ہندو اسی وقت سے مسلمانوں کے دشمن تھے جب سے انہوں نے ہندوستان پر قبضہ کیا۔ یہ قبضہ اگرچہ مسلمان ممالک یعنی افغانستان، مکران اور عراق کی سرحدوں پر ہندوؤں کی روزانہ دستبرد اور لوٹ مار کی وجہ سے مجبوراً کرنا پڑا تھا لیکن باوجود ازیں ہندوؤں کی مسلمان دشمنی ایک فطری امر تھا جس کے لیے انہیں موردِ الزام نہیں ٹھہرایا جا سکتا، چنانچہ ایک ہزار برس گزر جانے پر بھی ان کا یہ جذبہ کم نہ ہو سکا۔ جب مسلمانوں کی حکومت طاقتور ہوتی، ہندو دبے رہتے لیکن جہاں ذرا سی کمزوری پیدا ہوتی وہ بغاوتیں کرنے لگتے۔ صدیاں گزرتی گئیں اور مسلمانوں کی اسلامی حکومتیں بدلتی رہیں، یہاں تک کہ ۱۵۵۶ء میں جلال الدین محمد اکبر ہندوستان کے تختِ سلطنت پر متمکن ہوا۔ یہ بادشاہ علم سے بالکل بے بہرہ، مذہب سے قطعاً نا آشنا، عیش و عشرت کا بے انتہا دلدادہ لیکن غضب کا بہادر اور عقل مند تھا۔ اس نے ہندوؤں کی اکثریت اور مُلک کی بے پناہ وسعت کو دیکھتے

ہوئے ہندوؤں کو دبا کر حکومت کرنے کے بجائے ان کو اپنے ساتھ ملا کر اور اپنا بنا کر حکومت کرنے کی پالیسی اختیار کی۔ اس نے صرف دنیوی مراتب کے لحاظ سے ہی ہندوؤں کو مسلمانوں کے برابر کا درجہ نہیں دیا بلکہ ان سے بیاہ شادیاں کر کے معاشرت میں بھی ان کے برابر لا کھڑا کیا۔ یہی نہیں بلکہ اس نے ہندوؤں کی بیشمار مذہبی کتب کا ترجمہ فارسی میں کرایا۔ خود ان کے مذہبی اور صوفیانہ عقائد کو سراہا اور مذہبِ اسلام کو چھوڑ کر ایک نیا مذہب ایجاد کیا جس کا نام دینِ الٰہی رکھا۔ اس مذہب کی بابت دعویٰ کیا جاتا تھا کہ تمام مذاہب کی اچھی اچھی باتیں اس میں اکٹھی کر دی گئی ہیں۔ گو بظاہر وہ تمام مذاہب کو ایک آنکھ سے دیکھنے کا دعویٰ کرتا تھا لیکن درحقیقت شعائرِ اسلام کی کھلے بندوں تحقیر کرتا اور علمائے کرام کا برسرِ عام مذاق اڑاتا تھا۔ ان سب باتوں کا نفسیاتی نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوؤں کے دل میں مسلمانوں کی دنیوی، دینی اور روحانی فضیلت کا جو خیال اور رعب بیٹھا ہوا تھا، زائل ہو گیا۔ یہی نہیں بلکہ خود مسلمانوں کے دل میں اپنی فضیلت کا جو یقین و احساس تھا رفتہ رفتہ وہ بھی جاتا رہا اور اس طرح کوئی نفسیاتی مہیّج یا سبب باقی نہ رہا جس کی بنا پر وہ ہندوؤں کو دبائے رکھنے اور ان پر حکومت کرنے کے لیے جدوجہد جاری رکھ سکتے۔

اکبر کی قائم کی ہوئی یہ طاقت شاہجہان کے وقت تک تو قائم رہی لیکن جب اورنگ زیب عالمگیر نے مذہبِ اسلام کی طرف زیادہ رغبت ظاہر کی تو ہندوؤں میں بغاوت کے شعلے بھڑکنے لگے۔ جنوب اور وسطِ ہند میں مرہٹے اور شمال مغرب میں سکھ اسی وقت کی پیداوار ہیں، اورنگ زیب کے بعد سلطنتِ مغلیہ کمزور ہوئی تو ہندوؤں کی دیرینہ کوششیں بارآور ہو گئیں۔ جنوبی اور وسطی ہند کے اکثر علاقوں پر مرہٹوں نے اور شمال مغربی صوبوں میں سکھوں نے اپنی حکومتیں قائم کر لیں۔ انگریز بھی اس وقت تک کافی طاقت حاصل کر چکا تھا، اس نے مشرق کی طرف قبضہ جمایا اور ہندو مسلم دشمنی اور مسلمان اُمراء کی بددیانتی اور بے

ایمانی سے فائدہ اٹھایا اور رفتہ رفتہ سارے ہندوستان کو ہڑپ کر گیا۔ اس نے اپنی حکومت کی بُنیاد ''لڑاؤ اور حکومت کرو'' کے اُصول پر رکھی اور آخر وقت تک اس پر قائم رہا۔ اس کے لیے وہ ایک طرف صوبہ وارانہ تعصب اور دوسری طرف ہندو مسلم جذبۂ منافرت کی آگ کو ہمیشہ بھڑکاتا رہا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد عرصۂ دراز تک انگریز حُکام مسلمانوں پر ظلم و ستم اور ہندوؤں پر عنایت و شفقت کرتے رہے۔ انگریز ادیبوں اور سیاستدانوں نے مسلمانوں کے خلاف خوب پروپیگنڈہ کیا اور تعلیم کے انچارج انگریز افسروں نے اسکولوں اور کالجوں میں ایسے نصاب رائج کیے جن میں مسلمان بادشاہوں کو ڈاکو، غاصب اور بزورِ شمشیر ہندوؤں کو مسلمان بنانے کا مرتکب ثابت کیا گیا۔ حتیٰ کہ چلتے وقت پنجاب اور بنگال کی تقسیم سے پاکستان کو کمزور اور بھارت کو طاقتور بنانے کی پوری کوشش کی اور آخر میں کشمیر بھی ہندوؤں کے حوالے کر گیا جہاں پچاسی فیصد آبادی مسلمانوں کی تھی۔ الغرض اس طرح انگریز کی زیرِ سر پرستی بھارت کی وہ نام نہاد لادینی حکومت قائم ہوئی جس کی بُنیاد ہی اسلام سے نفرت اور مسلمانوں سے دشمنی پر قائم ہوئی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انگریز ہندوستان میں آیا ہی اس نیت سے تھا کہ یہاں کی حکومت مسلمانوں سے چھین کر ہندوؤں کو دے جائے۔

آخری زمانہ میں سب سے پہلی تحریک جو ہندوؤں کی ترقی کا باعث ہوئی، انگریزی تعلیم کے حصول کی تحریک تھی۔ مسلمانوں کی حکومت میں انہیں خوب تجربہ ہو گیا تھا کہ خوش حالی اور عزت انہی کو ملتی ہے جو حکومت وقت کی زبان سیکھتے ہیں اور اس میں مہارت حاصل کر لیتے ہیں، اِس لیے انگریز کے آتے ہی انہوں نے انگریزی تعلیم حاصل کرنا شروع کر دی اور تھوڑے ہی عرصہ میں تمام محکموں میں ماتحت عہدوں پر قبضہ کر لیا۔ بڑے عہدوں پر قبضہ کرنے کے لیے دولت مند ہندو انگلستان پہنچے اور وہاں سے مختلف علوم کی اعلیٰ ڈگریاں لے کر آئے۔ ان لوگوں نے صرف عہدے ہی حاصل نہ کیے بلکہ ہندوؤں میں تعلیم کو عام کرنے

کے لیے اپنی زندگیاں وقف کردیں۔ ہزارہا ایسے آدمی تھے جنہیں ہزار بارہ سو تنخواہ ماہوار با آسانی مل سکتی تھی، لیکن انہوں نے کالج اور سکول قائم کیے اور ان میں مرتے وقت تک پچاس پچاس روپیہ ماہوار تنخواہ پر پڑھاتے رہے۔ دوسری طرف گُروکلوں میں مذہبی تعلیم بھی اسی زور و شور سے جاری تھی۔ آپ کو معلوم ہے اس وقت مسلمان کیا کر رہے تھے؟ اسلامی حکومت تو ختم ہو چکی تھی، عوام پر صرف علمائے کرام کا اثر تھا اور علمائے کرام نے فتویٰ دے دیا تھا کہ انگریزی پڑھنا کفر اور پڑھنے والا کافر ہے۔

بہ بیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا

جن کے مذہب میں سمندر پار جانا منع تھا وہ دھڑا دھڑ انگلستان اور یورپ جا رہے تھے اور جن کے رسولؐ نے یہ حکم دیا تھا کہ ''علم حاصل کرو خواہ وہ چین ہی میں کیوں نہ ہو'' اُن کے علماءکرام انگریزی تعلیم حاصل کرنے کو کفر بتا رہے تھے۔ اس کی وجہ کیا تھی؟ علمائے کرام دُنیا کے حالات سے قطعاً بے خبر اور دنیاوی علوم سے بالکل بے بہرہ تھے۔

الغرض پچاس ساٹھ برس مغربی علوم حاصل کرنے کے بعد ہندوؤں کی آنکھیں کھل گئیں۔ مغربی تعلیم نے ان میں وہ دانش پیدا کر دی جو علم کا یقینی نتیجہ ہوتی ہے۔ ان کو معلوم ہو گیا کہ دُنیا کس رخ جا رہی ہے؟ اس دنیا میں طاقت کس چیز کا نام ہے؟ اور وہ کس طرح حاصل ہوتی ہے؟۔ انگریز کی مادّی، اقتصادی اور فوجی طاقت کتنی ہے اور اس طاقت کا اصل راز یعنی اُن کا سیاسی اور اخلاقی نظام اور عقائد کیا ہیں؟ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ ان کو خود اپنی حیثیت اور طاقت کا علم بھی حاصل ہو گیا۔ مغربی تعلیم نے ان کو جرأت و بے باکی اور ایثار و قربانی کی روح پرور صفات سے آراستہ کیا۔ دولت پہلے ہی سے موجود تھی، اب اس کا خرچ کرنا بھی آ گیا۔ قوّتِ برداشت چھ سو سال تک مسلمانوں کی حکومت میں رہ کر پہلے ہی حاصل ہو چکی تھی، اب صرف ایک بات رہ گئی تھی کہ وہ اپنے بے شمار مذہبی فرقوں اور مختلف

عقائد کی وجہ سے کسی ایک مرکز کے گرد اکٹھے نہ ہو سکتے تھے یہ کمی انگریز نے پوری کر دی اور مسلمانوں سے نفرت کا ایک ایسا مرکز عطا کر دیا، جس پر ہر عقیدے اور ہر خیال کے ہندو متحد ہو گئے۔ انگریز مسلمانوں کے خلاف ان کے اس اتّحاد سے بہت خوش تھا اور ہر ممکن ذریعہ سے اس کو اور زیادہ قوی کرنے میں مدد دے رہا تھا۔ ہاں وہ خوش تھا! اور اس خوشی میں یہ بھی بھول گیا تھا کہ اس اتّحاد سے جو طاقت پیدا ہو گی، وہ خود اس کے خلاف بھی استعمال ہو سکے گی۔

جنگ آزادی کا پروگرام بناتے وقت ہندوؤں نے دو فریقوں کو پیشِ نظر رکھا۔ ان میں سے ایک انگریز تھا، دوسرا مسلمان تھا۔ انگریز اِس لیے کہ اس سے آزادی لینی تھی، مسلمان اِس لیے کہ وہ شروع ہی سے متحدّہ ہندو طاقت کا ٹارگٹ تھا۔ علاوہ ازیں اس سے یہ بھی ڈر تھا کہ انگریز سے نہ مل جائے۔ یا انگریز کے رخصت ہونے پر خود ہندوستان پر قبضہ نہ کر لے۔ جنگ کے دو طریقے ممکن تھے، ایک مسلح بغاوت دوسرا سیاسی لڑائی۔ مسلح بغاوت میں کامیابی کا کوئی امکان نہ تھا، اِس لیے دوسرا طریقہ اختیار کیا گیا۔ انگریز کی سیاسی طاقت کا مرکز انگلستان کی رائے عامّہ اور پارلیمنٹ تھی، اِس لیے ضروری ہوا کہ رائے عامّہ کو اپنے حق میں متاثر کر کے پارلیمنٹ میں کسی سیاسی جماعت کی حمایت حاصل کی جائے۔ اس کے لیے نظرِ انتخاب لیبر پارٹی پر پڑی جو اس وقت بالکل نوخیز اور ترقی کے لیے ہر مدد کی احتیاج مند تھی چنانچہ پروپیگنڈے پر بے شمار روپیہ خرچ کر کے نہ صرف انگلستان بلکہ امریکہ اور روس کی رائے عامّہ پر بھی کامیاب اثر ڈالا گیا اور درمے قدمے سخنے جیسے بھی بن پڑا لیبر پارٹی سے ساز باز کر کے اس کو بھی اپنا بنا لیا گیا۔ یہ پارٹی بہت ہی وفادار نکلی اور آخری فتح صرف اسی کی مدد سے نصیب ہوئی۔

جنگ آزادی سے پہلے مسلمانوں کی حالت یہ تھی کہ پہلی جنگ عظیم میں سلطنتِ ترکی اور اس کے ساتھ ہی خلافت کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ مسلمانانِ ہند کے جذبات سوڈا واٹر کی طرح اُبل

رہے تھے۔تمام مُلک میں خلافت کمیٹیاں قائم ہو چکی تھیں۔معلوم ہوتا تھا کہ سب مسلمان سر بکف ہو کر میدان جہاد میں کود پڑیں گے اور انگریزوں کو مار مار کر ہندوستان سے نکال دیں گے،مگر یہ جو کچھ تھا محض مذہبی جوش کی وجہ سے تھا۔سیاسی سنجیدگی اور غور و فکر کا اس تحریک میں نام و نشان بھی نہ تھا۔ برخلاف ازیں ہندوؤں میں آل انڈیا کانگرس جیسی منظّم جماعت سال ہا سال سے کام کر رہی تھی لیکن نہ تو اسے عوام کی قیادت حاصل تھی نہ ہندوؤں میں حصولِ آزادی کے لیے کوئی جوش عمل موجود تھا۔فوج اور پولیس کی گولیوں کے مقابلہ میں کھلی لڑائی لڑنے کے تو خیال سے بھی ان کا دم نکلتا تھا،صرف یہی ایک چیز نہ تھی اور سب کچھ موجود تھا۔ دولت اور ایثار کا مادّہ بھی تھا،علم بھی تھا اور آدمی بھی مسلمانوں سے کہیں زیادہ تھے۔ ہندو لیڈر ان حالات سے خوب واقف تھے،انہوں نے سوچا کہ اس وقت مسلمانوں کی اس عارضی تنظیم اور جوش سے فائدہ اٹھانے اور ان کے تعاون اور مثال سے ہندوؤں میں جانبازی اور سرفروشی کا جذبہ پیدا کرنے کا بڑا اچھا موقعہ موجود ہے، چنانچہ انہوں نے تحریک خلافت کے لیڈروں کے سامنے یہ تجویز پیش کر دی کہ ’’انڈین نیشنل کانگرس خلافت اور ترکی کے معاملہ میں مسلمانوں کے مطالبات کی پوری تائید کرے گی بشرطیکہ وہ مادرِ وطن کی آزادی حاصل کرنے کی کوششوں میں کانگرس کا ساتھ دیں‘‘، دیکھنے اور کہنے کو یہ نہایت معقول اور معصوم سا فقرہ ہے، لیکن سیاسی ڈپلومیسی اور حکمت و دانش کی جو ایٹمی طاقت اس میں چھپی ہوئی ہے اس کو اور اس کے دُور رس نتائج کو مسلمانوں کے سیدھے سادے لیکن پُر خلوص و پُر دیانت لیڈر کہاں سمجھ اور جان سکتے تھے۔ اس فقرہ کا صاف اور سیدھا مطلب یہ تھا کہ انگریز کی طاقت کا جزوِ اعظم ہندوستان ہے، اگر اس کو ہندوستان سے نکال دیا جائے تو تمام اسلامی ممالک جو اُس کے بوٹ تلے دم توڑ رہے ہیں خود بخود آزاد اور طاقتور ہو جائیں گے. چنانچہ مسلمانوں نے کانگرس کی یہ پیشکش منظور کر لی اور بھاری اکثریت کے ساتھ حصولِ آزادی کی جدو جہد میں ہندوؤں کے

ساتھ شامل ہو گئے۔ ''شامل ہو گئے'' غلط ہے، صحیح یہ ہے کہ حصولِ آزادی کی جدوجہد میں ہندوؤں کی قیادت کرنے لگے۔ یہ تو تھے اس فقرے کے صاف اور سیدھے معنی لیکن جب اس پر عمل ہوا تو نتیجہ کیا نکلا، اسی سے ہندوؤں کی سیاسی قابلیت اور مسلمانوں کی نااہلیت کا ثبوت ملتا ہے۔

ہندو لیڈر جانتے تھے کہ ہندوؤں میں گولیوں کے سامنے آکر لڑنے کا حوصلہ نہیں، اِس لیے انہوں نے اس تحریک کا نام ہی ''عدمِ تعاون غیر متشدد'' رکھا۔ اس کا نفسیاتی اثر یہ ہوا کہ ہندو یہ سمجھ کر کہ اس تحریک میں جان جانے کا کوئی امکان نہیں زیادہ سے زیادہ جیل جانا پڑے گا، آگے بڑھے اور مسلمانوں کے دوش بدوش کام کرنے لگے۔ ظاہر ہے کہ کوئی تحریک آزادی خون بہائے بغیر کامیاب نہیں ہوسکتی، اس تحریک کا حشر بھی یہی ہوا کہ آخر میں خوب گولیاں چلیں، بم برسے، لاشیں گریں، خون بہے اور جیل خانے ٹھساٹھس بھر گئے۔ لیکن چونکہ یہ سب کچھ رفتہ رفتہ ہوا، مسلمانوں کی معیت میں آہستہ آہستہ ہندوؤں کا ڈر نکلتا گیا اور آخر میں وہ بھی بے خوف ہو کر جانیں دینے لگے، حتیٰ کہ ان کو مسلمانوں کی معیت کی کوئی ضرورت نہ رہی۔ دوسری طرف یہ ہوا کہ خلافت کا جُوا ترکوں نے اپنی گردن سے خود اتار کر پھینک دیا، اِس لیے مسلمانانِ ہند کے دل سے رفتہ رفتہ خلافت کی بحالی کا جذبہ زائل اور صرف وطنی آزادی کا خیال راسخ ہوتا گیا، حتیٰ کہ آخر میں تحریک خلافت ختم ہوگئی اور اس سے جو تنظیم اور طاقت پیدا ہوئی تھی اس کا سارا فائدہ کانگرس یا بالفاظِ دگر ہندوؤں کو پہنچا۔ یہ مسلمانوں کی بہت بڑی غلطی تھی، انہیں اپنی منظّم طاقت کو اس طرح کانگرس میں مدغم نہیں کرنا چاہیے تھا بلکہ خلافت یا کسی اور نام سے بحال اور زندہ رکھتے ہوئے ایک نمایاں اور الگ جماعت کی حیثیت سے کانگرس کا ساتھ دینا چاہیے تھا۔

اب یہ حالت تھی کہ مسلمان کانگرس کی پالیسی کے مطابق ہندوؤں کی قیادت میں جنگِ

آزادی لڑ رہے تھے۔ انہوں نے ہندوؤں کو بڑا بھائی مان لیا تھا اور سمجھ رہے تھے کہ جنگ کے خاتمے پر ہمارے ساتھ ہر لحاظ سے برادرانہ اور مساویانہ سلوک کیا جائے گا۔ یہ بھی ان کی سادہ لوحی تھی، وہ اتنا نہیں سوچ سکتے تھے کہ قوموں کی ہزار ہا سالہ ذہنیت دو دن میں نہیں بدلا کرتی۔ وہ اتنا نہیں جانتے تھے کہ ویدوں کی تہذیب، منو کے قانون اور چانکیہ جیسے سیاستدانوں کی تعلیم سے ہندوؤں کی جو ذہنیت پختہ ہوچکی ہے، اس میں مسلمانوں یا کسی اور غیر ہندو کے لیے مساوات اور عزت کا کوئی درجہ نہیں ہے۔ عقیدۂ تناسخ کا ماحصل یہ ہے کہ انسان جو نیکی بدی کرتا ہے ایک بندھے ہوئے قدرتی قانون کے مطابق اس کی جزا سزا ضرور ملتی ہے، اس کے گناہوں کو خدا بھی معاف نہیں کرسکتا۔ منوشاستر کے مطابق جاتی کے صرف چار وَرن ہیں، پانچواں طبقہ کیسے ایجاد کیا جاسکتا ہے۔ چانکیہ کے ارتھ شاستر کی تعلیم کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر تمہارا دشمن تم پر غالب آجائے تو اس کی اتنی خدمت و خوشامد کرو کہ تمہاری دشمنی کا خیال اُس کے دل سے نکل جائے اور وہ تم پر اعتماد کرنے لگے، لیکن تم اس کی طرف سے کبھی غافل نہ ہو، جب بھی موقع ملے نیست و نابود کردو۔ اب آپ ہی بتائیے کہ جس قوم کے مذہبی اور سیاسی عقائد یہ ہوں، اس میں عفو و کرم کا مادّہ کہاں ہوسکتا ہے، وہ دوسروں سے کس طرح مساوات کا سلوک کرسکتی ہے، وہ کس طرح اپنے دشمنوں کو معاف کرسکتی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ بہت سے کانگرسی ہندو صدق دل سے مسلمانوں کو اپنا بھائی سمجھتے اور ان کے ساتھ ہر لحاظ سے مساوات اور عزت کا سلوک کرنے کو تیار تھے لیکن ان کی تعداد اس قدر کم تھی کہ بعض اوقات انہیں خود اپنی عزت بچانی بھی مشکل ہوجاتی تھی، چنانچہ جب یہ لوگ جیلوں میں چلے گئے، تو میدان صاف تھا۔ اب ہندو مہاسبھا کی باری تھی، وہ پوری طاقت سے اٹھی اور تمام ہندوستان میں مسلمانوں کے خلاف مخالفت اور دشمنی کا طوفان برپا کردیا۔ تمام مُلک کے ہندوؤں کا سنگھٹن کیا گیا، شدھی شروع ہوئی اور مسلمانوں سے صاف کہہ دیا

گیا کہ جو باہر سے آئے ہیں وہ واپس چلے جائیں، جن کے باپ دادا یہیں مسلمان ہوئے تھے وہ پھر ہندو ہو جائیں، دن رات کے پروپیگنڈے سے انگریز کی پیدا کی ہوئی نفرت ہزاروں گنا بڑھا دی گئی اور اس بات کی عملی تیاری ہونے لگی کہ انگریز کے رخصت ہوتے ہی ممکن ہو تو مسلمانوں کو بالکل ختم کر دیا جائے ورنہ اس قدر کچل دیا جائے کہ ان کا ہونا نہ ہونا برابر ہو جائے۔ اس تحریک میں دس بیس فیصد نہیں بلکہ نوے پچانوے فیصدی ہندو شریک تھے، کانگرسی ہندوؤں کی بھاری اکثریت بھی انہی لوگوں کے ساتھ تھی۔

کئی سال بعد جب ہندو اور کانگرسی مسلمان لیڈر جیلوں سے باہر آئے تو معاملہ ہی دگرگوں تھا۔ ہندو مسلم اتحّاد پارہ پارہ ہو چکا تھا اور دونوں قوموں کے دلوں میں نفرت اور دشمنی کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ مسلمان رفتہ رفتہ کانگرس سے الگ ہونے لگے اور آخر میں بہت سے سر برآوردہ لیڈر بھی کانگرس سے الگ ہو گئے۔ اب چونکہ کانگرس ایک آل انڈیا قومی جماعت کہلاتی تھی، اِس لیے انگلستان کی پبلک اور پارلیمنٹ کے سامنے اپنی اس حیثیت کو برقرار رکھنے کے لیے ضروری تھا کہ کچھ مسلمانوں کو کانگرس میں ضرور رکھا جائے۔ اِس لیے کانگرسی لیڈروں نے دوسری چال چلی اور روپیہ کے بل پر مسلمانوں کو خریدنا شروع کر دیا۔ مسلمانوں کی جہالت، غربت اور افلاس کے پیشِ نظر یہ کچھ بھی مشکل نہ تھا۔ سینکڑوں ایسے لوگ جن کا ذریعہ معاش ہی کچھ نہ تھا، لیکن جاہل مسلمان پبلک کے جذبات کو برانگیختہ کرنے کے لیے تقریریں خوب کر سکتے تھے، کانگرس کے تنخواہ دار کارکن بن گئے اور آخر تک وفادار رہے۔ لیکن کچھ ایسے سر برآوردہ عمائد بھی تھے جو روپیہ کے لیے کانگرس کے ساتھ نہ تھے بلکہ صدق دل سے ان کا عقیدہ ہی یہ تھا کہ مسلمانوں کی بہتری کانگرس کا ساتھ دینے ہی میں ہے۔ بہرحال اس حکمتِ عملی سے ہندوؤں کو دوہرا فائدہ پہنچا، ایک طرف تو وہ یہ دعویٰ کرنے کے قابل رہے کہ آل انڈیا نیشنل کانگرس ہی صرف ہندوستان کی واحد قومی اور نمائندہ جماعت

ہے، دوسری طرف وہ خود ہندوستانی مسلمانوں میں پھوٹ ڈلوانے اوراس طاقت کوٹکڑے ٹکڑے کرنے میں کامیاب ہوگئے جوکبھی خلافت کمیٹی کی شکل میں منظّم ہوگئی تھی اوراس طرح انہوں نے بزعمِ خوداس خطرہ عظیم کا بہت کچھ سدِّباب کردیا جوسالہاسال سےان کے خوابوں کی دُنیاپر کابوس بن کر چھایاہواتھا کہ انگریز کے رخصت ہونے پرکہیں ہندوستانی مسلمان اور سرحدی پٹھان ان کو پھر غلام نہ بنالیں۔اس خطرے کا قلع قمع کرنے کے لیے انہوں نے صرف اس حکمتِ عملی پرہی اکتفانہیں کیا بلکہ اورتدابیربھی اختیارکیں جن کا بیان آگے کیا جاتا ہے۔

زیادہ خطرہ سرحدی پٹھانوں سے تھا، اِس لیے زیادہ توجہ انہی کی طرف مبذول کی گئی۔ ان کی ذہنیت اور طاقت کا جائزہ لینے پرمعلوم ہوا کہ ان میں انتہائی جہالت اورغربت دو خامیاں ایسی ہیں جن کی وجہ سےان کامسخّر کرلینا کچھ بھی مشکل نہیں۔چنانچہ ان خامیوں سے پورافائدہ اٹھایا گیااورزیادہ عرصہ نہ گزرنے پایاتھا کہ ان شیروں کوسنہری روپہلی زنجیروں میں جکڑ کر کانگرس کی گاڑی میں سب سے آگے جوت دیا گیا۔پٹھانوں کومطیع کرنے میں دو باتوں سے خاص طور پرمدد ملی، اول یہ کہ انگریزچونکہ قبائیلوں سے ہمیشہ برسرِ جنگ رہتا تھا اور کانگرس آزادی حاصل کرنے کے لیے انگریزوں سے جنگ کررہی تھی، اِس لیے اس سیدھی سادی مخلوق کے دماغ میں یہ خیال پیدا کردینا کچھ بھی مشکل نہ تھا کہ کانگرس کے سوا اورجتنی بھی جماعتیں ہیں وہ سب انگریز کی پٹھو ہیں اورمُلک کی غدار ہیں، دوسری بات یہ تھی کہ سرحدی علاقے میں ہندوؤں کی آبادی چودہ پندرہ فیصد سے زیادہ نہ تھی۔ اِس لیے وہ ہمیشہ مسلمانوں کی خوشنودی کا خیال رکھتے تھےاورسرحدی پٹھان اپنی بے انتہا بے خبری اور لاعلمی کی وجہ سے ہندوستان میں ہندوؤں کی طاقت اورمسلم کش ذہنیت سے قطعاً ناواقف تھے۔ان کی سمجھ میں یہ بات کسی طرح بھی نہ آسکتی تھی کہ انگریزوں کے رخصت ہونے کے

بعد ہندواں پر من مانی حکومت کریں گے یا کسی قسم کا نقصان پہنچا سکیں گے۔ الغرض سرحدی پٹھانوں کو اس طرح مسخّر کیا گیا۔ اب رہ گئے ہندوستانی مسلمان، ان کو زیر کرنے کے لیے یہ تدبیر کی گئی کہ جس قدر حصولِ آزادی کا یقین ہوتا گیا، ہندو اسی قدر سنگھٹنی جماعتوں کی تربیت اور تنظیم کو زیادہ قوی کرتے گئے۔ ہر شہر اور قصبہ میں اکھاڑے قائم کر دئے گئے اور کشتی، گتکا، پھری، بنوٹ وغیرہ سکھانے کا باقاعدہ انتظام کیا گیا، حتیٰ کہ حصولِ آزادی سے دو سال پہلے یعنی ۱۹۴۵ء میں یہ تحریک اس قدر منظّم اور عام ہوگئی کہ ہندوستان کے طول وعرض میں ہندو نوجوان ہزاروں کی تعداد میں علی الصبح شہروں اور قصبوں کے باہر اکٹھے ہوکر فوجی ڈرل کرتے اور لکڑی کے ڈنڈوں سے ان کو تلوار اور بندوق چلانے کی مشق کرائی جاتی۔ ہر دوسرے تیسرے دن کوئی سیٹھ موٹر میں آتا اور ہزار دو ہزار کی تھیلی انعام میں دے جاتا۔ ہر ہندو محلّہ میں تلوار، بندوق، پستول اور بموں کے ذخائر اکٹھے کیے جاتے اور خفیہ جلسوں میں جنگ کے پروگرام بنائے اور طریقہ ہائے کار بتائے جاتے تھے۔ اس تحریک کو صرف ہندو لیڈروں اور امیروں ہی کی نہیں بلکہ راجوں مہاراجوں کی مدد بھی حاصل تھی۔ ان سب باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ تقسیم ہند کے وقت یعنی اگست ۱۹۴۷ء میں ہندو ہر جگہ جنگ کے لیے تیار اور مسلمان شیخی اور غفلت کے نشہ میں سرشار تھے۔ چنانچہ دہلی، مشرقی پنجاب اور یوپی کے مغربی اضلاع میں جو قیامت برپا ہوئی، اس کے آگے چنگیز، تیمور، نادر شاہ اور ۱۸۵۷ء کے مظالم بھی افسانہ بن کر رہ گئے۔ ایک کروڑ سے زیادہ مسلمان خانماں برباد ہوئے، لاکھوں عورتوں کی آبروریزی کی گئی، لاکھوں اغواء کر لی گئیں اور تین لاکھ سے زیادہ مسلمان قتل کر دیئے گئے۔ یہ سب کچھ کس نے کیا؟ اس ہندو نے جو چیونٹی کو مارنا بھی پاپ بتاتا اور ہر وقت اورنگ زیب کے ظلم وستم کا رونا رویا کرتا تھا۔

اب سوال یہ ہے کہ جب یہ سب کچھ ہو رہا تھا تو مسلمان کیا کر رہے تھے؟ اس کا جواب

صرف دو لفظوں میں یہ ہے کہ ''وہ اس وقت بھی آپس میں لڑ رہے تھے'' کچھ ظاہر طور پر کانگرس کے ساتھ تھے، کچھ خفیہ طور پر جاسوسی کی خدمت بجا لا رہے تھے۔ لیکن جب ہندوؤں کی سیاسی چالیں اور عزائم بے نقاب ہو گئے تو کچھ مسلمانوں کو ہوش آیا۔ آل مسلم پارٹیز کانفرنس بلائی گئی اور قوم کی قیادت کا کام ایسے نازک مرحلے پر مسلم لیگ کو سپُرد کر کے قائداعظم محمد علی جناحؒ کو اس ڈوبتے ہوئے بیڑے کا ناخدا مقرّر کر دیا گیا۔ مسلم لیگ نے بہت جلد طاقت حاصل کر لی اور مسلمانوں کے لیے ایک الگ وطن کا مطالبہ کیا۔ ساری دُنیا خلاف تھی لیکن اتّحاد میں بڑی طاقت ہے۔ مسلمانوں کے لیے اس عارضی اتّحاد اور قائداعظم کے بے پایاں خلوص، ایثار اور فولادی کردار کی وجہ سے پاکستان مل گیا۔ یقین تھا کہ پورا پنجاب اور بنگال پاکستان میں شامل ہو گا، لیکن رسوائے عالم اور اسلام دشمن لارڈ ماؤنٹ بیٹن بقول خود پنڈت جواہر لال نہرو کا پرسنل فرینڈ تھا۔ اس دوستی کی وجہ سے اس نے انصاف کا خون کیا اور پنجاب اور بنگال کو (جو خالص مسلم اکثریت کے صوبے تھے) کاٹ کر ان کے آدھے جسم پاکستان کے حوالے کر دیئے، جو کسر رہ گئی تھی وہ مسٹر ریڈ کلف نے پوری کر دی جو دونوں ملکوں کی سرحد مقرّر کرنے آیا تھا، اس نے گورداسپور کا ضلع جو تقریباً سارے کا سارا مسلمان تھا، ہندوستان کو دے دیا تاکہ کشمیر میں جانے کا اسے راستہ مل جائے۔

حق یہ ہے کہ ہندوؤں کی عاجزی و مسکینی اور خاطر و خدمت گزاری کی عادت نے انہیں ہر جگہ کامیاب کیا اور مسلمانوں کے غرور، نخوت، اکڑفوں، شیخی اور خود پسندی (جس کو وہ خود داری کہتے ہیں) نے ان کو ہر جگہ خسارے میں رکھا۔

ہندوؤں کی سیاست میں خاص بات یاد رکھنے کی یہ ہے کہ ان میں علمی، معاشرتی، مذہبی اور سیاسی جتنی بھی جماعتیں تھیں، مقصد سب کا ایک لیکن طریقہ کار سب کا الگ الگ تھا۔ اور اعلیٰ سیاست کا یہی سب سے مفید اور زرین اُصول ہے۔ فائدہ اس سے یہ ہوتا ہے کہ دشمن کا

دھیان کئی طرف بٹا رہتا ہے۔ دوسرے یہ کہ جب ایک جماعت ناکام ہو جاتی تو دوسری کام شروع کر دیتی ہے اوراس طرح سب مل جل کرآگے ہی بڑھتی رہتی ہیں اورتحریک رکنے نہیں پاتی۔ مثال کے طور پر کانگرس بظاہر مسلمانوں کی خیرخواہ اور دوست جماعت تھی اور ہندو مہاسبھا کُھلّم کُھلاّ ان کی جانی دشمن۔ کانگرس نے دوستی کے پردے میں مسلمانوں کو اپنے ساتھ ملا کر ان کی اجتماعی طاقت کو کم کیا اور مہاسبھا نے تلوار کے زور سے انہیں خاک وخون میں ملایا۔ اگر تمام ہندو جماعتیں ہی کھلم کھلا خلاف ہو جاتیں تو یقیناً مسلمان بھی مایوس ہو کر سب کے سب متحد ہو جاتے، لیکن کانگرس اور دوسری ''بظاہر مسلمان دوست'' جماعتوں کی وجہ سے وہ ایسا نہیں کر سکے۔ کانگرس کا مقصد یہ تھا کہ سوراج ملنے کے بعد مسلمانوں پر رزق کے دروازے بند کر کے ان کو رفتہ رفتہ نیست و نابود کیا جائے۔ مہاسبھا اور سنگھٹنی جماعتوں کا اُصول یہ تھا کہ ان کو طاقت اور تلوار کے زور سے ختم کر دیا جائے۔ مسلمان اپنی جہالت اور اپنی بے علمی کی وجہ سے ان چالوں کو سمجھ ہی نہ سکے اور آخر وقت تک آپس میں لڑتے رہے۔

اب آپ اچھی طرح سمجھ گئے ہوں گے کہ ہندوؤں کی مسلمان دشمنی کوئی عارضی شے یا پانی کا بلبلہ نہیں ہے کہ سر اٹھایا اور بیٹھ گیا، بلکہ ایک جیتی جاگتی حقیقت اور ایک فطرتی جذبہ ہے جو ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد سے شروع ہوا اور آج تک علیٰ حالہٖ قائم ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ ہندوؤں نے مسلمانوں کی حکومت کو بخوشی کبھی بھی قبول نہ کیا اور جب کبھی بھی ان کی طاقت کو کمزور ہوتے دیکھا تو اسے مٹانے کو تیار ہو گئے۔ شہنشاہ اورنگ زیب کی وفات کے بعد جو طوائف الملو کی پھیلی، اس سے انہوں نے پورا فائدہ اٹھایا اور پچاس برس بھی نہ گزرنے پائے تھے کہ مرہٹوں نے جنوبی اور وسطی ہند کے بہت سے علاقوں پر قبضہ کر کے خود دہلی پر قبضہ کر لیا۔ اگر احمد شاہ ابدالی پانی پت کی تیسری لڑائی میں ان کا مکمّل استیصال نہ کر دیتا تو سلطنتِ اسلامیہ کا چراغ تو اسی وقت گُل ہو چکا تھا۔ ہندو پانی پت کی شکست کے بعد بھی

خاموش بیٹھنے والے نہ تھے لیکن اُسی زمانہ میں انگریز آن دھمکا اور ہندو حکومت کا خواب شرمندہ تعبیر نہ ہوسکا۔ انگریزی حکومت کے زمانے میں بھی ہندو کی مسلمان دشمنی میں کوئی فرق نہ آیا بلکہ وہ پہلے سے بھی زیادہ ہوگئی، صرف اتنا ہوا کہ اظہارِ خصومت کے طریقے بدل گئے۔ پہلے حکومت اسلامی کو مٹانے کی کوششیں تھیں، اب خود مسلمانانِ ہند کو مٹانے کا تہیہ کرلیا گیا۔ دراصل ہندو اپنی مذہبی اور سماجی نفسیات اور افتاد کی وجہ سے کبھی یہ سوچ ہی نہیں سکتا کہ خدا کی وسیع زمین پر سوائے برہمن، کھشتری، اور ویش کے اور بھی کسی کو فارغ البالی اور خوشحالی سے رہنے کا حق حاصل ہے۔ اِس لیے اس نے فیصلہ کرلیا کہ مسلمانوں کو ہندوستان میں رہنا ہے تو شودر بن کر رہیں ورنہ جہاں سے آئے تھے وہاں چلے جائیں۔

اس فیصلہ کو قوّت سے فعل میں لانے کے لیے ہر طرف سے مسلمانوں پر رزق کے دروازے بند کرنے کی مساعی شروع کردی گئیں۔ حصولِ رزق کے چار ہی راستے ہیں۔ زراعت، تجارت، صنعت و حرفت اور ملازمت، چنانچہ ان چاروں راستوں پر قبضہ کرنے کی ٹھان لی گئی۔ ۱۸۵۷ء کی تباہی کے بعد بھی کم از کم شمالی ہند میں مسلمان زمیندار اسّی فیصدی زرعی زمینوں کے مالک تھے، لیکن وہ ایک حکمران طبقے سے تعلق اور معیارِ زندگی بلند رکھتے تھے۔ نوّابیاں اور مناصب چھن جانے کے بعد صرف زمینوں کی آمدنی ان کے شاہانہ اخراجات کے لیے کافی نہ ہوسکی اور تھوڑے ہی عرصے میں قرضہ اور سود در سود کے چکّر میں تمام زمینیں ہندو بنیوں کے ہاتھ بیع یا رہن ہوگئیں۔ تجارت میں یہ ہوا کہ اول اپنی تجارت کو فروغ دینے کے لیے انگریز نے مسلمان تاجروں کو تباہ کیا، پھر جو باقی بچے ان کو ہندوؤں نے مقابلہ کرکے تباہ کردیا۔ ہندو نیتاؤں نے ہندوؤں کو ترغیب دی کہ مسلمانوں سے کوئی چیز نہ خریدیں اور ان کا مکمّل بائیکاٹ کردیں۔ اس تحریک سے مسلمان تاجروں کو سخت نقصان پہنچا لیکن یہ فائدہ بھی ہوا کہ مسلمانوں نے بھی ہندوؤں کا مقاطعہ کردیا اور بہت سی چیزوں کی تجارت جس کے واحد اجارہ دار اس وقت تک ہندو تھے خود شروع کردی، مسلمان حلوائی

خصوصاً اسی وقت کی یادگار ہیں۔ صنعت و حرفت بھی زیادہ تر مسلمانوں کے ہاتھ میں تھی، لیکن ہندوؤں نے بڑی بڑی فیکٹریاں وغیرہ قائم کرلیں اور مسلمانوں کے ہاتھ میں سوائے چھوٹی چھوٹی دستکاریوں کے اور کچھ باقی نہ رہا۔ اب رہ گئی ملازمت، اُس کا حشر یہ ہوا کہ ہندوؤں نے تو انگریز کے آتے ہی انگریزی تعلیم شروع کردی تھی۔ مسلمانوں نے برس ہا برس ادھر توجہ ہی نہ کی، بعد میں جب انگریزی پڑھ لکھ کر دفاتر کا رخ کیا تو ہر جگہ ہندو کا قبضہ اور ہر دفتر کے دروازے کو اپنے لیے بند پایا۔ ان واقعات اور خصوصاً سرکاری دفاتر میں ہندوؤں کی اجارہ داری اور تعصب نے انگریزی تعلیم یافتہ مسلمانوں کی آنکھیں کھول دیں اور وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ آزادی ملنے کے بعد (جس کے آثار اب نظر آنے لگے تھے) مسلمانوں کا کیا حشر ہوگا۔ یہی خیال ہندوستان میں ایک آزاد اسلامی ریاست کے قیام کی تجویز کا باعث ہوا اور آخر کار سخت جدوجہد کے بعد پاکستان وجود میں آیا۔

اب اگر مسلمان یہ سمجھتا ہے کہ پاکستان بننے کے بعد ہندوؤں کے دل سے مسلمانوں کی دشمنی کا جذبہ ختم ہو گیا ہے تو وہ سخت غلطی پر ہیں۔ ہندو کسی حال میں بھی بھارت ماتا کے ٹکڑے کیے جانے پر راضی نہ تھے، مگر دو وجوہات سے مجبوراً انہوں نے یہ بات مان لی۔ اول یہ کہ وہ ہر قیمت پر آزادی حاصل کرنے کے درپے تھے، دوسرے ان کو یقین تھا کہ مسلمان غربت، کم علمی اور باہمی جھگڑوں کی وجہ سے پاکستان کو قائم نہ رکھ سکیں گے اور آخر کار کسی نہ کسی وقت یہ ٹکڑا پھر بھارت ماتا کے جسم میں جوڑ دیا جائے گا۔ مگر خدا کا شکر ہے ان کی یہ آرزو پوری نہ ہوئی اور مسلمانوں نے باوجود اپنی کمزوریوں کے ایک ایسی حکومت قائم کرلی جس کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کے لیے بھی بار بار سوچنا پڑتا ہے، مگر باوجود اس کے انہوں نے اپنی معاندانہ مساعی میں اب بھی کوئی کمی نہیں کی ہے۔ اب ان کی کوشش یہ ہے کہ پاکستان کو کمزور سے کمزور تر بنایا جائے۔ اس کے لیے ایک طرف تو وہ دن رات اپنی فوجی قوّت بڑھانے

میں مشغول ہیں، دوسری طرف مغربی ملکوں سے ساز باز کر رہے ہیں، تیسری طرف بیرونی دُنیا خصوصاً اسلامی ممالک میں ہمارے خلاف نفرت کے بیج بو رہے ہیں، چوتھی طرف ہمارے دریاؤں کا رخ پھیر رہے ہیں تا کہ ہماری زمین ہمیں اناج دینے سے انکار کر دے، پانچویں طرف اپنے جاسوسوں یعنی غدار اور قوم فروش مسلمانوں کی جیبیں سیم و زر سے بھر کر ہمارے مُلک میں فرقہ وارانہ اور علاقائی منافرت کی آگ بھڑکا رہے ہیں[1]، خصوصاً مشرقی پاکستان میں چند آسانیوں کی وجہ سے ہندوؤں کی یہ سازشیں زیادہ منظّم اور زیادہ وسیع پیمانے پر جاری ہیں، چھٹی طرف اپنی تمام طاقت اس بات پر صرف کر رہے ہیں کہ مغربی اور مشرقی پاکستان کو کسی طرح سیاسی طور پر الگ کر کے پاکستان کے دو ٹکڑے کر دیں اور جب یہ ہو جائے تو مشرقی پاکستان پر پولیس ایکشن کے ذریعہ قابض ہو جائیں اور پھر مغربی پاکستان کی طرف توجہ کریں۔ الغرض شش جہت سے ہمیں گھیر رکھا ہے، لیکن اس پر بھی ہمارے عوام تو کیا بہت سے زعماء اور لیڈر بھی کانوں میں تیل ڈالے بیٹھے ہیں اور ذاتی اقتدار کے نشہ میں مدہوش کرسیاں توڑنے میں مشغول ہیں۔ ان کو یہ باتیں سنائی جائیں تو کہتے ہیں کہ ہندوؤں کی یہ مجال نہیں کہ ہماری طرف نظر اٹھا کر دیکھیں۔ کوئی کہتا ہے کہ کانگرس اور اس کی حکومت مسلمانوں اور پاکستان کی ہرگز دشمن نہیں۔ کوئی صاحب فرماتے ہیں کہ اب یو۔ این۔ او برسرِ اقتدار ہے، اس کے ہوتے کسی کی طاقت نہیں کہ ہم پر حملہ کر دے، ہم کہتے ہیں کہ یہ باتیں یا تو بزدلی ہے یا خود فریبی۔ یہ انڈین نیشنل کانگرس اور اس کی حکومت وہی تو ہے جس نے 1947ء میں تین لاکھ مسلمانوں کو قتل اور ایک کروڑ کو بے خانماں کرایا، حیدر آباد کی اسلامی

---

(۱) خواجہ عبدالحکیم انصاریؒ نے یہ کتاب ۱۹۵۷ء میں تحریر فرمائی۔ آپ نے بر بنائے بصیرت مشرقی پاکستان کے بارے میں جن خدشات کا اظہار فرمایا وہ حرف بحرف درست ثابت ہوئے۔ افسوس کے ہمارے عمائدین نے اصلاحِ احوال کے لیے مناسب اقدام نہ کیے اور ہندوستان ۱۹۷۱ء میں اپنے عزائم کے مطابق بنگلہ دیش بنانے میں کامیاب ہو گیا۔

سلطنت کو ختم کیا، مناوادر اور جونا گڑھ کو ہضم کرگئی، آدھا کشمیر نگل لیا اور باقی آدھے کو نگلنے کی فکر میں ہے اور یہ یو۔ این۔ او بھی تو وہی ہے جو سب کچھ دیکھتی رہی اور ٹُس سے مَس نہ ہوئی۔ اور چلئے ہم مان لیتے ہیں کہ کانگرسی حکومت اور کانگرس کے ارکان سبھی مسلمانوں کے واقعی بڑے پکّے دوست اور پاکستان کے بڑے خیر خواہ ہیں پھر بھی خدا را ہمیں یہ تو بتائیے کہ ان باتوں پر اعتبار کرکے غافل بیٹھے رہنا اور دفاع کی مکمّل تیاری نہ کرنا کہاں کی سیاست اور دانشمندی ہے۔

یاد رکھئے دنیائے سیاست میں کمزوری سب سے بڑا قصور اور غفلت سب سے بڑا گناہ ہے، جس کی سزا تباہی کے سوا اور کچھ نہیں۔ علاوہ ازیں اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ ہندوستان میں ہمیشہ آپ کی اس مسلمان دوست کانگرس ہی کی حکومت رہے گی اور آپ کی دشمنِ جان جَن سنگھ کبھی برسرِ اقتدار نہ آئے گی، پھر اس وقت آپ کیا کریں گے؟ اِس لیے ہندوستان اور دوسرے تمام ممالک سے بے شُبہ دوستانہ تعلقات رکھئے لیکن اپنی دفاعی طاقت کو مکمّل کیے بغیر چین سے نہ بیٹھئے، ہمارے اس بیان کی صداقت ستمبر 1965ء کی سترہ روزہ جنگ سے ثابت ہوچکی ہے، بلکہ یہ حقیقت بھی اچھی طرح واضح ہوگئی ہے کہ خواہ صدیاں گزر جائیں ہندو پاکستان کو مٹانے کی ناپاک کوششوں سے ہرگز باز نہ آئیں گے، اِس لیے مسلمانوں کو چاہیے کہ اپنے دفاع کو مضبوط سے مضبوط تر بنائیں اور باہمی اتّحاد اور جہاد کے جذبہ کو دن دونی رات چوگنی ترقی دینے میں کبھی کوتاہی نہ کریں۔ دُنیا کی تمام اسلامی سلطنتوں پر بھی مذہباً یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ پاکستان کو جو مشرق میں مکہ معظّمہ اور مدینہ منوّرہ کے دفاع کی پہلی لائن ہے، زیادہ سے زیادہ طاقتور بنانے میں کسی قربانی سے بھی دریغ نہ کریں۔

اب کچھ حال مذہبِ اسلام کے عقائد، عبادات، معاملات اور روحانیات کا سنئے اور

دیکھئے کہ قرآن کی تعلیم پر عمل کرنے سے دُنیا اور آخرت دونوں میں راحت و آرام اور کامرانی کس طرح حاصل ہوسکتی ہے۔

مذہبِ اسلام

مذہبِ اسلام مشتمل ہے تین حِصّوں پر اوّل عقائد، دوسرے عبادات، تیسرے معاملات۔ یہ تینوں آپس میں اس طرح مربوط اور پیوستہ ہیں جیسے ایک مشین کے پُرزے کہ ایک پُرزہ بھی بیکار ہوجائے تو ساری مشین چلنے سے رُک جاتی ہے۔اسی طرح اگر اسلام کے ان تینوں حصوں میں سے کسی ایک پر بھی عمل میں کوتاہی ہو تو مذہب میں خلل آجاتا ہے اور یہ کوتاہ اعمالی اگر قوم کی اکثریت سے سرزد ہو تو ساری قوم تباہ ہوجاتی ہے۔اس بات کو اللہ تعالیٰ یوں بیان فرماتا ہے:۔

اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ فَمَا جَزَاءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ

(البقرۃ:۸۵)

یعنی ’’کیا تم قرآن کی بعض باتوں کو تو مانتے ہو اور بعض کو نہیں مانتے، جو ایسا کرتا ہے اس کی جزاء اس کے سوا کچھ نہیں کہ دُنیا کی زندگی میں اس کی رسوائی ہو اور آخرت میں ایسے لوگ سخت عذاب کی طرف پھیر دیئے جائیں گے‘‘۔

اس کا صاف مطلب یہی ہے کہ اگر تم قرآن کی ہر بات پر یقین اور عمل کروگے تو فلاح پاؤ گے ورنہ دُنیا اور آخرت دونوں میں ذلیل ہوگے۔اب چونکہ مسلمان ہونے کے لیے سب سے پہلی چیز عقائد پر ایمان لانا ہے، اِس لیے لازم ہوا کہ سب سے پہلے بُنیاد یعنی عقائد کو محکم سے محکم تر بنایا جائے، جتنے یہ عقائد محکم ہوں گے، اتنی ہی ہماری عبادات پُر خلوص

اور با اثر ہوں گی اور اتنے ہی ہمارے معاملات صالح اور مفید ہوں گے۔ ہمارے زوال کی سب سے پہلی اور سب سے بڑی وجہ یہی ہے کہ عقائد یعنی بُنیاد ہی محکم نہیں۔ یہ عقائد کیا ہیں؟ سنئے!

عقائد:

مذہبِ اسلام میں داخل ہونے کے لیے مندرجہ ذیل عقائد پر ایمان لانا پہلی شرط ہے:۔

۱۔ اللہ کی موجودگی اور ذات و صفات میں ہر لحاظ سے اُس کی یکتائی پر۔

۲۔ فرشتوں پر۔

۳۔ وحی کے ذریعہ نازل ہونے والی کتابوں پر۔

۴۔ تمام رسولوں پر۔

۵۔ قیامت کے دن پر۔

۶۔ اس بات پر کہ خیر و شر کے تمام اندازے اللہ ہی کی طرف سے ہیں۔

۷۔ موت کے بعد زندگی پر۔

چونکہ یہ تمام باتیں قرآن میں موجود ہیں، اِس لیے اگر ہم یوں کہیں کہ مسلمان ہونے کے لیے صرف تین باتوں پر ایمان لانا ضروری ہے تو غلط نہ ہوگا۔ وہ تین باتیں یہ ہیں:۔

۱۔ اللہ کی وحدانیت:۔

یعنی یہ کہ اللہ تعالیٰ ذات و صفات میں ہر لحاظ سے یکتا اور بیمثل ہے۔

۲۔ محمدؐ کی رسالت:۔

یعنی یہ کہ محمدؐ اللہ تعالیٰ کے سچّے اور آخری رسول ہیں۔

۳۔ قرآن کی صداقت:۔

یعنی یہ کہ قرآن جیسا کہ حضور محمد رسول اللہؐ پر وحی کے ذریعہ نازل ہوا تھا بالکل ویسا ہی بغیر ایک حرف یا زیر و زبر کی کمی بیشی کے اس وقت بھی موجود ہے اور اس کے ہر حکم پر خواہ امر ہو یا نہی، پوری طرح عمل کرنا ہی عین اسلام ہے۔

اب غور طلب بات یہ ہے کہ یہ تینوں باتیں غیب سے تعلق رکھتی ہیں، یعنی حواسِ ظاہری سے معلوم و متحقق نہیں ہوسکتیں۔ اللہ تعالیٰ غیب میں ہے، حواسِ ظاہری سے معلوم نہیں کیا جا سکتا۔ محمدؐ اگرچہ بصورت بشر دُنیا میں تشریف لائے لیکن آپ کے رسول ہونے کا ذریعہ یعنی وحی غیب سے تعلق رکھتی ہے۔ اسی طرح قرآن اگرچہ کتاب کی شکل میں ہمارے پاس ہے لیکن اس کے نزول کا ذریعہ یعنی جبریل علیہ السلام بھی غیب ہی میں ہے۔ اس کے علاوہ قرآن میں اور بھی کئی چیزیں بیان کی گئی ہیں جو حواسِ ظاہری سے معلوم نہیں ہوسکتیں مثلاً فرشتے، دوزخ، جنت، لوحِ محفوظ وغیرہ وغیرہ۔

تو گویا مسلمان ہونے کے لیے سب سے پہلی چیز ''ایمان بالغیب'' ہے، یعنی اللہ تعالیٰ ہم سے یہ چاہتا ہے کہ ہم بغیر کسی دلیل و حجت کے ان چیزوں پر یقینِ کامِل پیدا کرلیں۔ یہ درجہ ایمان کا بہت ہی بڑا ہے، کیونکہ بغیر دلیل کے ان باتوں کو مان لینا محمد رسول اللہؐ کی سچائی کی تصدیق کرنا ہے۔ ہم نہیں جانتے کہ اللہ کیا ہے، کیسا ہے، کہاں ہے، ہے بھی یا نہیں؟ لیکن محمدؐ کو ہم ضرور جانتے ہیں کہ وہ سچے تھے، امین تھے، معصوم تھے، جب وہ کہتے ہیں کہ اللہ موجود ہے تو پھر ہم کو کسی اور حجّت یا دلیل کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ لیکن یاد رکھنا چاہئے کہ اور چیزوں کی طرح ایمان کے بھی مختلف درجے ہیں۔ ایک شخص محض دھوکہ دینے کی غرض سے کہہ دیتا ہے کہ میں اللہ اور محمد رسول اللہؐ پر ایمان لایا تو وہ منافق ہے، لیکن ایک اور شخص سچ مچ مسلمان ہونے کی نیّت سے کلمہ پڑھتا ہے اور سچے دل سے کہتا ہے کہ ''میں ایمان لایا اللہ

اوراس کے رسولوں اور کتابوں پر'' وغیرہ وغیرہ، مگراس کواپنے الفاظ پر اعلیٰ درجہ کا یقین نہیں ہوتا، وہ شخص بے شبہ ''مسلمان ہے'' لیکن ''مومن'' نہیں۔ مومن صرف وہ ہے جس کو یقینِ کامِل حاصل ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ آج کل لاکھوں مسلمانوں میں سے شاید ایک دو ہی ہوں گے جو مومن کہلانے کے مستحق ہوں گے، برخلاف اس کے قرنِ اوّل کے عربوں میں اسّی نوّے فیصد پکے مسلمان اور رسول اکرمؐ کے اصحاب کبار میں سو فیصدی مومن کامِل تھے۔ اُن کے اخلاق بھی کامِل تھے، اللہ پر ان کا بھروسہ اور قرآن پر ان کا عمل بھی کامِل تھا، یہی وجہ تھی کہ وہ جس طرف قدم اٹھاتے تے کامیاب ہوتے تھے۔ زندگی کا کوئی شعبہ اور گوشہ ایسا نہ تھا جس میں ان کی ترقی فقید المثال نہ ہو، یہی وہ مبارک جماعت تھی جس کے ساٹھ ساٹھ آدمی ساٹھ ساٹھ ہزار کفار کو میدان جنگ میں شکست دے دیا کرتے تھے۔ آج مغربیت زدہ مسلمان ان حقیقتوں کو تقلیدِ یورپ کی وجہ سے جھوٹا سمجھتے اور مذاق اڑاتے ہیں، مگر وہ معذور اور قابلِ معافی ہیں۔ وہ ایمان کی طاقت اور نصرت خداوندی کی قوّت سے نا آشنا ہیں اور محض اس واسطے نا آشنا ہیں کہ ان کے دلوں میں ایمان نہیں ہے، وہ صرف مسلمان ہیں مومن نہیں ہیں بلکہ بہت سے تو شاید مسلمان بھی نہیں۔

یہ ہم نہیں کہہ رہے ہیں اللہ تعالیٰ بھی یہی فرماتا ہے، قرآن میں ہے:۔

قَالَتِ الْاَعْرَابُ آمَنَّا قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ (الحجرات:۱۴)

یعنی ''اعراب نے کہا کہ ہم ایمان لے آئے (تو اللہ نے رسول اللہ سے فرمایا اے محمدؐ) ان سے کہہ دو کہ تم ایمان نہیں لائے بلکہ تم کہو کہ ہم اسلام لے آئے۔ ابھی ایمان تمہارے دِلوں میں داخل نہیں ہوا''

یعنی مومن تم اس وقت کہلاؤ گے جب ایمان تمہارے دلوں میں گھر کرلے گا۔

اس آیت سے ثابت ہو گیا کہ ملّتِ اسلامیہ کے دو حصے ہیں، ایک مسلمان، دوسرے مومن۔ اب سوال یہ ہے کہ ایمان کیا ہے؟ اس کی پہچان کیا ہے؟ اور وہ کس طرح حاصل کیا جا سکتا ہے؟ پہلے سوال کا جواب دیا جا چکا ہے، دوسرے کا جواب یہ ہے کہ مومن وہ ہے جو اللہ کے سوا نہ تو کسی سے ڈرتا ہو، نہ کسی سے توقع رکھتا ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مومن کی تعریف یہ بھی کی ہے کہ جب وہ عبادت کر رہا ہو تو وہ یہ محسوس کرے کہ وہ اللہ کو دیکھ رہا ہے یا پھر بدرجۂ اقل یہ کہ اللہ اس کو دیکھ رہا ہے۔ تیسرے سوال کا جواب کہ ایسا ایمان کس طرح حاصل ہو سکتا ہے بہت تفصیل طلب ہے، اِس لیے ہم صفحات ذیل میں کسی قدر شرح و بَسط کے ساتھ اس کا جواب دینے کی کوشش کریں گے۔ **وَمَاتوفِيقِی اِلَّا بِاللّٰه**

ایمان محکم کس طرح پیدا ہوتا ہے؟

ذہنی لحاظ سے ہر قوم کے تین حصے کیے جا سکتے ہیں ادنیٰ، اوسط اور اعلیٰ۔ ان میں سے ادنیٰ طبقے کے لوگ عوام کہلاتے ہیں اور ہر قوم کا بڑا حصہ اُنہی پر مشتمل ہوتا ہے، ان میں تلاش وتحقیق کا مادّہ بالکل نہیں ہوتا۔ یہ صرف مقلد اور لکیر کے فقیر ہوتے ہیں جیسا کسی سے سُن لیتے ہیں یا اپنے آباؤ اجداد کو کرتا دیکھتے ہیں، اسی کو اختیار کر لیتے ہیں۔ عام مسلمانوں کا بھی یہی حال ہے، اللہ، رسول یا دین کے بارے میں جو کچھ باپ دادا سے سنا وہی ان کا سرمایہ عقائد واعمال ہے۔ اُن کو خیال بھی نہیں آتا کہ اللہ کیا ہے، کیسا ہے، کہاں ہے؟ اور اس کی موجودگی کا ثبوت کیا ہے؟ اس قسم کے سوالات ہزاروں میں سے ایک دو کے دل میں پیدا ہوتے ہیں مگر وہ لوگ بھی معمولی قسم کی دلیلوں سے مطمئن ہو جاتے ہیں، مثلاً جب ان سے کہا جائے کہ دُنیا میں کوئی ایسی چیز بتا سکتے ہو جس کو کسی نے نہ بنایا ہو خود بخود پیدا ہو گئی ہو، تو وہ یہی جواب

دیں گے کہ نہیں۔ اب ان سے کہا جائے کہ پھر یہ کائنات یعنی کرۂ زمین، آسمان، چاند، سورج، ستارے وغیرہ خود بخود کس طرح پیدا ہو سکتے ہیں؟ ثابت ہوا کہ ان کا بنانے والا بھی کوئی ضرور ہے۔ اس دلیل سے ان کی تسلّی ہو جاتی ہے، لیکن کچھ خاص لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو ذرا آگے سوچتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ جب ہر چیز کا کوئی بنانے والا ضرور ہوتا ہے تو پھر اللہ کا پیدا کرنے والا بھی ضرور ہونا چاہیئے۔ یہیں سے منطق، فلسفہ اور علم کلام کی کبھی ختم نہ ہونے والی بحثیں شروع ہو جاتی ہیں۔ ان کا نتیجہ ہمیشہ یہ ہوتا ہے کہ جو زیادہ تعلیم یافتہ اور لسّان ہو وہ مدمقابل کو خاموش کر دیتا ہے، گو اس کی تسلّی نہ بھی کر سکے۔ لیکن ان بحثوں سے یہ فائدہ بھی ہوتا ہے کہ اللہ اور غیب کی دوسری چیزوں کے متعلق تلاش و جستجو بڑھتی چلی جاتی ہے اور ہر طالب اپنی طلب اور علم و عقل کے مطابق کسی نہ کسی مقام پر مطمئن ہو جاتا ہے یا انکار کر دیتا ہے۔

ان ہزارہا طالبوں میں دو چار ایسے بھی ہوتے ہیں جو کسی استدلالِ عقلی سے مطمئن نہیں ہوتے بلکہ آنکھوں سے دیکھ کر ماننا چاہتے ہیں۔ یہ دو قسم کے ہوتے ہیں، ایک وہ جو محض ضد اور تعصب کی وجہ سے قائل ہونا ہی نہیں چاہتے، دوسرے وہ جو واقعی دل سے معرفت یا دیدارِ باری تعالیٰ کے متمنّی ہوتے ہیں۔ وہ یہ جاننے کے لیے بھی بے تاب ہوتے ہیں کہ مادّے کے ان کثیف پردوں میں جو عالمِ لطیف مستور ہے وہ کیسا ہے؟ انسان کیا ہے؟ روح کیا ہے؟ فرشتے کیا ہیں؟ دوزخ جنت کی حقیقت کیا ہے؟ یہی ہیں وہ مبارک لوگ کہ جب اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو اولیاء اللہ کے لقب سے ملقّب ہوتے ہیں۔ ان پر وہ حقیقت کبریٰ بے نقاب ہو جاتی ہے جس کو معلوم کرنے کے لیے دنیا بھر کے فلاسفر اور سائنسدان مادّی ظلمات کے اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارتے مارتے فنا ہو گئے اور نامراد رہے۔

لیکن معرفت اور اس سے بھی بڑھ کر رویتِ باری تعالیٰ کا حصول کوئی مذاق یا دل لگی نہیں ہے تا ہم یہ محال بھی نہیں۔ قرآن کریم میں رویتِ باری تعالیٰ کے متعلق بہت سی آیتیں ہیں، ان میں کچھ ایسی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ رویت قیامت میں ہو گی لیکن کچھ ایسی بھی ہیں جن میں قیامت کا کوئی ذکر بظاہر نہیں ہے۔ اس وجہ سے مسلمانوں میں اس مسئلہ پر بھی کافی بحث مباحثہ رہا ہے اور اب بھی ہوتا رہتا ہے۔ ایک گروہ کہتا ہے کہ رؤیت قیامت میں ہو گی، دوسرا کہتا ہے کہ مرنے کے بعد ہی ہو جائے گی، تیسرا گروہ جس میں عام طور پر صوفیاء اور اولیائے کرام شامل ہیں، دعویٰ کرتا ہے کہ رویتِ باری تعالیٰ اسی زندگی میں میسّر آ سکتی ہے اور جس کو یہاں میسّر نہ آئی اسے آخرت میں بھی میسّر نہ آئے گی۔ ان کی ایک دلیل تو یہ ہے کہ معرفت اور دیدارِ باری تعالیٰ کی خواہش بھوک اور پیاس کی طرح ایک فطرتی اور جبلّی خواہش ہے خواہ لاکھوں میں سے صرف ایک دو آدمیوں کے دل میں ہی کیوں نہ ہو اور مشاہدہ کہتا ہے کہ جتنی جبلّی خواہشات قدرت نے پیدا کی ہیں، اُن سب کی تسکین کا سامان ضرور پیدا کیا ہے، مثلاً بھوک اور پیاس پیدا کی ہیں تو ان کی تسکین کے لیے طرح طرح کے ماکولات اور مشروبات پیدا کر دیئے ہیں، یہی حال دوسری شہوات و خواہشات کا ہے، پھر یہ کس طرح ممکن ہے کہ اللہ نے اپنے دیدار اور عرفان کی خواہش تو کسی انسان کے دل میں فطرتاً رکھ دی ہو لیکن اس کی تسکین کا سامان اور حصول کے ذرائع پیدا نہ کیے ہوں۔ دوسرے یہ بزرگ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جو قرآن میں فرمایا ہے:

وَمَنْ كَانَ فِي هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى وَاَضَلُّ سَبِيْلًا (الاسراء ۷۲)

یعنی ''جو یہاں اندھا ہے وہ آخرت میں بھی اندھا ہوگا''۔ اس کا مطلب سوائے اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ جس نے یہاں اللہ کو نہیں دیکھا وہ وہاں بھی نہ دیکھے گا، پھر قرآن

کریم میں یہ بھی ہے کہ

فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ (الحج ۴۶)

یعنی ''اُن کی ظاہری آنکھیں اندھی نہیں ہوں گی بلکہ ان کے سینوں میں جو دل ہیں وہ اندھے ہوں گے'' اور ظاہر ہے کہ یہ آنکھیں اللہ کی صفاتی شانوں مثلاً نور وغیرہ ہی کو دیکھ سکتی ہیں اُس کی ذات تو صرف دل کی آنکھوں ہی سے نظر آسکتی ہے۔ اِن آیات کے علاوہ ایک جگہ یوں بھی ارشاد ہوتا ہے کہ

وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيَامَةِ اَعْمٰى (طٰہٰ ۱۲۴)

یعنی ''جس نے اعراض کیا میری یاد سے یقیناً اس کے واسطے (روحانی) معیشت کی تنگی ہے اور قیامت کے دن ہم اس کو اندھا اٹھائیں گے'' یعنی وہ ہمارے دیدار سے محروم رہے گا۔ اس آیت میں یہ بھی بتا دیا گیا ہے کہ دیدارِ الٰہی حاصل کرنے کا ذریعہ یادِ الٰہی ہے۔ الغرض ان آیات پر غور کیا جائے تو یہی سمجھ میں آتا ہے کہ جو لوگ اللہ کو یہاں نہیں دیکھیں گے آخرت میں بھی نہ دیکھیں گے یا بہ زبانِ حاضرہ یوں کہیئے کہ جن کو یہاں بصیرت باطنی حاصل نہیں ہوگی وہ آخرت میں بھی اس سے محروم رہیں گے کیونکہ ''دنیا آخرت کی کھیتی ہے'' جو بیج یہاں بوؤ گے اسی کے پھل وہاں کھاؤ گے۔ جو لوگ اس دُنیا میں رویتِ باری تعالیٰ کے قائل نہیں وہ کہتے ہیں کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو باوجود درخواست کے یہاں رویت میسّر نہ آئی تو کسی غیر پیغمبر کو کس طرح آسکتی ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ وادیٔ طویٰ میں جو آگ موسیٰ علیہ السلام کو دکھائی دی تھی اور اس میں سے آواز آئی تھی کہ ''میں تیرا رب ہوں'' اور ''میں ہی ہوں اللہ'' تو کیا یہ دیدارِ الٰہی نہ تھا، لیکن اس طرح اللہ کو دیکھ کر جب ایک عرصہ

بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پھر درخواست کی کہ اے اللہ میں تجھ کو دیکھنا چاہتا ہوں، تو جواب ملا ''تو نہیں دیکھ سکتا'' اور جب زیادہ ضد کی تو طور کا واقعہ پیش آیا۔ اب سوال یہ ہے کہ پہلے تو بغیر کسی سوال بلکہ بغیر کسی خواہش کے خود اپنا جلوہ دکھایا اور دوسری مرتبہ بار ہا درخواست کرنے پر انکار کر دیا۔ اس کی کیا وجہ تھی؟ تو وجہ اس کی یہ ہے کہ پہلی مرتبہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان مادّی آنکھوں سے اللہ کو بصورت نور دیکھا تھا۔ دوسری مرتبہ جو درخواست کی تھی تو وہ اللہ کی ذاتِ بے رنگ و بو کو انہی مادّی آنکھوں سے دیکھنے کے لیے تھی اور یہ بات ممکن نہیں، اِس لیے انکار کر دیا گیا یا معاملہ کو خوبصورتی سے ٹال دیا گیا۔ بہر حال ہم اس بات پر زیادہ بحث نہیں کرنا چاہتے بلکہ وہ طریقے بیان کرتے ہیں جن سے بفضلِ خدا اُس کا دیدار میسّر آ سکتا ہے۔ مگر یہ جو کچھ ہم لکھ رہے ہیں صرف اہلِ طلب کے لیے ہے۔

اب جاننا چاہئے کہ عرفان یا لِقائے باری تعالیٰ کے ذریعہ ایمانِ کامل پیدا کرنے کا سوال سامنے آتے ہی ہم اپنے آپ کو ایک ایسے علم سے دوچار پاتے ہیں جس کا نام تصوّف ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ابتداء میں کئی صدیوں تک جب حکومت کے نشہ اور دولت کی بہتات سے عامّۃ المسلمین کے صراط المستقیم سے بھٹک جانے کا خطرہ لاحق تھا، تصوّف اور صوفیائے کرام نے ان کو راہِ راست پر قائم رکھنے میں بڑا حصّہ لیا، لیکن اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ آخری صدیوں میں مسخ شدہ تصوّف اور علم سے بے بہرہ صوفیوں کی لایعنی اور خلافِ قرآن تعلیم سے جو نقصانِ عظیم ملّتِ اسلامیہ کو تصوّف سے پہنچا ہے وہ اور کسی بات سے نہیں پہنچا۔ اس امرِ واقعہ کے پیشِ نظر نہایت ہی ضروری ہے کہ آئندہ صفحات میں اس علم کا کسی قدر واضح بیان کیا جائے۔ اسی ضمن میں ایمانِ کامل پیدا کرنے اور رویت و معرفتِ باری تعالیٰ حاصل کرنے کے طریقوں کا بیان بھی اپنی اپنی جگہ پر آ جائے گا۔

تصوُّف

تصوُّف نے پہلے مسلمانوں کے عقائد اور پھر اعمال پر اس قدر اثر ڈالا ہے کہ آج غالباً ایک فردِ واحد بھی خواہ وہ تصوُّف کا قائل اور معتقد ہو یا نہ ہو، ایسا نہیں جو اس سے بالواسطہ یا بلاواسطہ متاثر نہ ہوا ہو۔ لیکن لطف یہ ہے کہ نہ تو قرآن میں لفظ تصوُّف کا کہیں نام و نشان ہے نہ حدیث میں کہیں تصوُّف کی مُروّجہ تعلیم کا ذکر آیا ہے۔ پھر یہ کہاں سے نمودار ہوا اور کیونکر ہمارے عقائد و اعمال پر اس طرح چھا گیا کہ خود قرآنی تعلیم بھی غائب ہوگئی۔ اور یہ ہے کیا؟

جس کسی نے تصوُّف کی تحقیق پر قلم اٹھایا اس نے اس کی وجہ تسمیہ کی چھان بین پر صفحے کے صفحے کالے کر دیئے۔ ہم اس کو بیکار سمجھتے ہیں۔ وجہ تسمیہ کچھ بھی ہو ہم کو تو یہ دیکھنا چاہیئے کہ اس علم کا موضوع کیا ہے۔ چنانچہ جو شخص تصوُّف کی مُبادیات سے بھی واقف ہے وہ خوب جانتا ہے کہ اس علم کا موضوع بالکل وہی ہے جو فلسفہ کا ہے۔ یعنی حقیقت کا معلوم کرنا یا یہ جاننا کہ مادّہ کیا ہے؟ روح کیا ہے؟ انسان کیا ہے؟ عقل اور نفس کیا ہیں؟ مرنے کے بعد روح بھی مر جاتی ہے یا باقی رہتی ہے؟ جنّت اور دوزخ وغیرہ ہیں بھی یا نہیں اور ہیں تو ان کی حقیقت کیا ہے؟ ان سب کا بنانے والا کوئی ہے یا نہیں؟ ہے تو کیسا ہے؟ کہاں ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔

اب فلسفہ و تصوُّف میں فرق یہ ہے کہ فلسفہ میں ان باتوں کو جاننے کی کوشش بذریعہ عقل یعنی صحیح منطقی استدلال اور استنباطِ نتائج سے کی جاتی ہے۔ لیکن تصوُّف میں یہ کوشش چند ایسی

مشقوں اور اعمال سے ہوتی ہے جن سے کچھ باطنی حواس اور روحانی قوّتیں جاگ اٹھتی ہیں اور مقاصد مطلوبہ کے حصول میں مدد دیتی ہیں۔ ان مشقوں اور اعمال کا ذکر کرنے سے پہلے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ قرآن میں بھی اس علم کا ذکر ہے یا نہیں؟ اس میں شک نہیں کہ قرآن میں لفظ تصوّف کہیں بھی موجود نہیں بلکہ سرکارِ دو عالمؐ کی وفات کے بعد تقریباً پونے دو سو برس تک اسلامی تاریخ یا کسی اور کتاب میں بھی یہ لفظ نہیں پایا جاتا۔ لیکن قرآن میں کئی جگہ ایک اور لفظ آیا ہے جس کا موضوع بالکل وہی ہے جو تصوُّف کا ہے۔ یہ لفظ ''حکمت'' ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔

کَمَآ اَرْسَلْنَا فِیْکُمْ رَسُوْلاً مِّنْکُمْ یَتْلُوْا عَلَیْکُمْ اٰیَاتِنَا وَیُزَکِّیْکُمْ وَیُعَلِّمُکُمُ الْکِتَابَ وَالْحِکْمَةَ وَیُعَلِّمُکُمْ مَّا لَمْ تَکُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ

(البقرہ ۱۵۱)

یعنی ''ہم نے تم ہی میں سے تمہاری طرف ایک رسول بھیجا جو تم کو ہماری آیتیں پڑھ کر سناتا اور پاکیزہ بناتا ہے اور سکھاتا ہے تم کو کتاب اور حکمت اور وہ باتیں جو تم نہیں جانتے تھے''۔ اس آیت کے علاوہ بالکل یہی بات ''آلِ عمران'' اور ''سورۂ جمعہ'' میں بھی ارشاد ہوئی ہے۔ اِن آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اکرمؐ پہلے تو قرآن کی آیات پڑھ کر سُناتے اور پھر سکھاتے تھے یعنی نمونہ دے کر بتاتے یا توضیح کر کے سمجھاتے تھے، مثلاً نماز کا حکم آیا تو پڑھ کر دکھائی اور دوسرے احکام آئے تو وضاحت کر کے بتائے اور حضورؐ کا یہ قول اور فعل حدیث کہلاتا ہے۔ ان باتوں کے علاوہ حضورؐ ایک اور چیز بھی سکھاتے تھے اور وہ تھی حکمت، اب ''حکمت'' کا ترجمہ مترجمین نے کہیں کام کی بات کیا ہے، کہیں عقل کی اور کہیں سمجھ کی، لیکن الحمدللہ کہ آج اُردو زبان ایضاحِ بیان میں اتنی بلندی تک پہنچ گئی ہے کہ اہلِ علم کو لفظ

''حکمت'' کا صحیح مفہوم سمجھنے میں کوئی غلطی نہ ہوگی۔ اِن آیات کے علاوہ لفظ ''حکمت'' قرآن میں اور بھی کئی جگہ آیا ہے۔

یُؤْتِی الْحِکْمَۃَ مَنْ یَّشَآءُ وَمَنْ یُّؤْتَ الْحِکْمَۃَ فَقَدْ اُوْتِیَ خَیْرًا کَثِیْرًا وَمَا یَذَّکَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ (البقرۃ:۲۶۹)

یعنی ''اللہ تعالیٰ حکمت عطا کرتا ہے جس کو چاہتا ہے اور جس کو حکمت عطا کی گئی اس کو خیرِ کثیر عطا کی گئی اور یہ حکمت کی باتیں کوئی نہیں سمجھ سکتا لیکن وہ جو دانشمند ہیں''۔

اس آیت سے ثابت ہوا کہ

(۱) حکمت اللہ تعالیٰ ہر ایک کو نہیں بلکہ جس کو چاہتا ہے اس کو سکھاتا ہے، یعنی یہ کسبی نہیں بلکہ محض وہبی ہے مطلب یہ کہ

ایں سعادت بزورِ بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

(۲) حکمت کوئی معمولی چیز نہیں بلکہ خیرِ کثیر ہے۔

(۳) حکمت ہر خاص و عام کے لیے نہیں بلکہ صرف ان خاص الخاص لوگوں کے لیے ہے جو انتہائی دانش مند ہوں۔

حکمت کا ترجمہ فلسفہ بھی کیا جاسکتا ہے لیکن جو لوگ فلسفہ یعنی استدلال عقلی سے ''حقیقت'' کو معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں وہ دو طرح کے ہوتے ہیں، ایک وہ جو آخر میں اللہ یعنی ایک واجب الوجود کو مان لیتے ہیں اور دوسرے وہ جو اللہ سے منکر ہو جاتے ہیں اور صرف مادّہ ہی کو ازلی ابدی تسلیم کرتے ہیں۔ اس سے ثابت ہوا کہ قرآن میں لفظ ''حکمت'' فلسفہ کے معنی میں ہرگز نہیں آیا کیونکہ اللہ تعالیٰ رسول اکرمؐ کے ذریعہ اپنے بندوں کو

ایسی تعلیم ہرگز نہیں دے سکتا جس سے کچھ لوگ منکر بھی ہو سکیں، لہٰذا حکمت کے معنی سوائے اس علم کے اور کچھ نہیں جس کو تصوُّف کہا جاتا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ تعلیم خفیہ طور پر کیوں دی جاتی ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ تعلیم خفیہ طور پر ہرگز نہیں دی جاتی بلکہ صرف خاص خاص لوگوں کو دی جاتی ہے، عوام کو نہیں۔ اس کی وجہ جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے، یہ ہے کہ اس علم کی طلب اور اس کے حصول کی استعداد صرف خواص میں ہوتی ہے۔ عوام میں نہ اس کی طلب ہوتی ہے نہ اُن کی عقل میں یہ باتیں آسکتی ہیں۔ یہ علم لطائفِ غیبی اور کوائفِ باطنی سے متعلق ہے جو حواسِ ظاہری سے معلوم و متحقق نہیں ہو سکتے، اِس لیے اُن کا اظہار الفاظ میں ممکن نہیں، صرف کر کے دیکھنے سے معلوم ہو سکتے ہیں۔ کوائف وحقائقِ روحانی کا بیان تو بڑی بات ہے جو مادّی اشیاء ہم دن رات دیکھتے ہیں اور استعمال کرتے ہیں وہ بھی آپ الفاظ میں بیان نہیں کر سکتے مثلاً سفید، سرخ، نیلا، پیلا یا کسی اور قسم کا رنگ ہرگز الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا، صرف سامنے رکھ کر دکھایا جا سکتا ہے یا مثال دے کر بیان کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح کسی چیز کی خوشبو یا بدبو ہرگز الفاظ میں بیان نہیں کی جا سکتی صرف سُنگھا کر بتائی جا سکتی ہے۔ کیا کوئی بڑے سے بڑا انشاء پرداز گلاب کی خوشبو کو الفاظ میں اس طرح بیان کر سکتا ہے کہ جس نے کبھی گلاب نہ سونگھا ہو، اس کی ناک میں گلاب کی خوشبو آنے لگے۔

مختصر یہ کہ لطائفِ غیبی اور کوائف وحقائقِ روحانی کو الفاظ میں بیان کرنے سے عوام میں سخت غلطیوں کا پیدا ہونا یقینی ہے، اِس لیے یہ تعلیم صرف خواص ہی کو دی گئی، عوام نے اس پر یہ کہنا شروع کر دیا کہ یہ تعلیم خفیہ ہے۔ ہمارے اس بیان کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ جب سے سچے اولیاء اللہ، تعلیم یافتہ متصوفین یا نا اہل صوفیوں نے ان باتوں کو بیان کرنا یا کتابوں

میں لکھنا شروع کر دیا، اسی دن سے عوام کے عقائد خراب اور اعمال مسخ ہونے لگے اور ملّتِ اسلامیہ کو بجائے فائدے کے سخت نقصان پہنچا، مثلاً حضرت محی الدین ابن عربیؒ نے جب مسئلہ وحدت الوجود یعنی ہمہ اوست کے مسئلہ کو فتوحاتِ مکیّہ اور فصوص الحکم میں تحریر کر دیا تو اسی وقت سے عوام میں یہ خیال پیدا ہونا شروع ہو گیا کہ ہر چیز خدا ہے اور جب بعد کی نسلوں کے دماغ میں یہ خیال مُرتسم ہو گیا تو خدا کا خوف جاتا رہا، گناہوں پر جسارت پیدا ہوئی، توحیدِ خالص کی قوّت جو بُنیادتھی تمام ترقی کی، منہدم ہو گئی، حدودِ شرعیہ تارِ عنکبوت کی طرح توڑ ڈالی گئیں اور نوبت بداعمالیوں اور کفر والحاد تک پہنچی۔ مزید برآں یہ کہ ان بداعمالیوں کے عامِل اور تلقینِ کفر والحاد کے قائل چونکہ صوفی اور ولی سمجھے جاتے تھے، اِس لیے عوام کا ان عقائدِ باطلہ کو مان کر صحیح اسلام سے منہ پھیر لینا کون سی تعجب کی بات تھی۔

ایک طرف تو یہ لوگ تھے، دوسری طرف کچھ مسلمان ایسے بھی تھے جو ان باتوں سے متنفر ہو کر سرے سے روحانیت ہی کے منکر ہو گئے اور بجا طور پر ہو گئے۔ اگر یہ لوگ ایسا نہ کرتے اور علمائے ظاہر کی تعلیم اس قدر عام اور شدید نہ ہوتی تو آج روئے زمین پر جو یہ نام نہاد مسلمان نظر آتے ہیں، یہ بھی دکھائی نہ دیتے اور کفر والحاد، شرک، قبر پرستی، پیر پرستی بلکہ با قاعدہ بت پرستی کے سوا کچھ بھی باقی نہ رہ گیا ہوتا۔

اس میں شک نہیں کہ حضرت محی الدین ابن عربیؒ اپنے زمانہ کے بہت بڑے بزرگ اور ولی اللہ تھے، لیکن انہوں نے ''منزل'' کو ''مقام'' اور ''کیفیت'' کو ''حقیقت'' سمجھ لیا اور آگے جانے کی ہمت نہ کی، اس پر غضب یہ کیا کہ جس کیفیت کو حقیقت سمجھے تھے اسے قلم بند کر دیا۔ عوام یا وہ صوفی جو اس مقام تک بھی کبھی نہ پہنچ سکے جہاں وحدت الوجود کی کیفیت حقیقت بن کر سامنے آتی ہے، ابن عربیؒ کی تحریر کا حقیقی مطلب خاک سمجھتے۔ مگر انہوں نے

اس خیال سے کہ ابن عربیؒ بہت بڑے عالم اور ولی اللہ ہیں، ان کی باتوں کے ظاہری مطلب کو صحیح مان لیا اور اپنے جاہل مریدوں کے سامنے بیان کرنا شروع کر دیا، نتیجہ وہ نکلا جو سامنے ہے۔ وحدت الوجود اصل میں ویدانت کا فلسفہ ہے، اسلامی توحید سے اسے دُور کا واسطہ بھی نہیں۔ ہندوؤں کے رشی اور مُنی روحانی ترقی کے جس آخری نُقطہ تک پہنچے وہ یہی مقام تھا جہاں وحدتُ الوجود کی کیفیت طاری ہوتی ہے۔ انہوں نے اسی کو حقیقت اور انتہا تصوّر کیا اور اسی پر اپنے فلسفے کی بُنیاد رکھی، حالانکہ حقیقتِ کبریٰ یعنی ذاتِ بحت کی وہ حقیقت جہاں کوئی صفت موجود نہیں، اس مقام سے کہیں آگے ہے جہاں وحدتُ الوجود کی کیفیت طاری ہوتی ہے اور یہی ''حکمتِ اسلامی'' کی فضیلت ہے کہ مسلمان اولیاء وہاں پہنچتے ہیں جہاں دوسرے ادیان کا کوئی بزرگ بھی نہ پہنچ سکا، اور وہیں پہنچ کر معلوم ہوتا ہے کہ ''توحیدِ خالص'' کیا ہے۔ وحدتُ الوجود کا مفصّل بیان آگے کیا جائے گا۔

ہر مسلمان کو یاد رکھنا چاہیئے کہ کوئی ولی اللہ خواہ کتنا ہی بڑا ہو، اگر ایسی بات کہے جو وحی یعنی قرآن کے خلاف ہو تو اس بات کو ماننے سے فوراً انکار کر دینا چاہیئے۔ یہی نہیں بلکہ اگر اس ولی کی ولایت ہی سے انکار کر دیا جائے تو بھی دین میں ذرّہ برابر خلل نہیں آتا کیونکہ اولیاء کی ولایت کو ماننا اُصولِ دین میں نہیں ہے۔ لیکن یہ بھی کسی طرح جائز نہیں کہ ایسے اولیاء کی شان میں گستاخی کی جائے یا نازیبا اور ناشائستہ الفاظ ان کے لیے استعمال کیے جائیں۔ ایسے موقعہ پر یقین کر لینا چاہیئے کہ جو کچھ اس بزرگ نے سمجھا یا دیکھا ہے قابلِ فہم الفاظ میں بیان نہیں کر سکا۔

اسی طرح ان نام نہاد صوفیوں کا ایک اور عقیدہ ہے جو عوام میں بھی بے حد سرایت کر گیا ہے، یعنی لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ شریعت اور چیز ہے اور طریقت و حقیقت اور شے۔ یہ لوگ اس

بات کے قائل ہیں کہ بہت سے اولیاء اللہ ایک ایسے مقام تک پہنچ جاتے ہیں جہاں نہ تو عبادتِ ظاہری کی ضرورت رہتی ہے، نہ کسی گناہ کا عذاب ہوتا ہے اور نعوذ باللہ یہی تعلیم تھی جو رسول اللہؐ خفیہ طور پر دیا کرتے تھے، یعنی حضورؐ کا ظاہر کچھ اور تھا اور باطن کچھ اور۔ استغفر اللہ، استغفر اللہ۔ حضورؐ کی ذاتِ اقدس اور آپ کی دیانت و صداقت پر اس سے بڑا بہتان اور کیا ہوسکتا ہے۔ خیال تو کیجیے جس قوم کا حصّہ کثیر اپنے ہادی کی بابت یہ ذلیل عقیدہ رکھتا ہو وہ قوم تباہ و برباد اور رُسوا نہ ہو تو اور کیا ہو۔ دراصل مسلمانوں میں جھوٹ اور ریا کاری عام ہونے کی سب سے بڑی نفسیاتی وجہ ہی یہ عقیدہ ہے۔ جب وہ یقین رکھتے ہوں کہ نعوذ باللہ خود رسول اللہؐ کا ظاہر کچھ تھا اور باطن کچھ، تو وہ خود ایسا کیوں نہ کریں گے۔ ''یہ لوگ مانتے اور کرتے کچھ ہیں مگر بتاتے اور کہتے کچھ اور''۔ اس بات سے اُن کے کردار کی فولادیت ختم اور جذبۂ صداقت فنا ہوکر کذب و ریا کاری پیدا ہوجاتی ہے۔ ہم نے بے شمار جاہل صوفیوں یا بالفاظ صحیح تصوّف کے جھوٹے دعویداروں کو ایسی باتیں کہتے ہوئے بگوشِ خود سنا ہے۔ ایسے فقیر تو ہر جگہ بے شمار ملیں گے جو نماز نہیں پڑھتے، بھنگ پیتے، چرس کا دم لگاتے اور ان کے علاوہ اور بہت سی باتیں خلافِ شرع کرتے ہیں۔ لیکن ہم نے ایک ایسے پیر صاحب کو بھی دیکھا جو کسی مُرید کو بیعت کرتے وقت اس سے یہ عہد لیتے تھے کہ ''میں نماز کبھی نہیں پڑھوں گا''۔ لُطف یہ ہے کہ باوجود اس کے لوگ ان کو بہت بڑا ولی اللہ مانتے تھے اور ایک دُنیا میں ان کی کرامتوں کی دھوم تھی، اب فرمائیے اس کے بعد باقی ہی کیا رہ جاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ شریعت میں بُنیادی چیز عقائد ہیں اور وہ سب کے سب غیب سے متعلق ہیں۔ ان غیبی حقائق کی معرفت حاصل کرنے کے جو طریقے سرکارِ دو عالمؐ نے تلقین فرمائے ہیں ان کا نام طریقت (یعنی راستہ) ہے اور ان پر عمل کرنے کے بعد جو علم حاصل

ہوتا ہے اس کا نام حقیقت ہے۔ اب آپ ہی فیصلہ کریں کہ شریعت، طریقت اور حقیقت ایک دوسرے کے خلاف یا متضاد کیسے ہوگئیں۔

یہ سچ ہے کہ عوام کے لیے صرف شریعت ہی ہے، ان کو طریقت یا حقیقت کی پیچیدہ راہوں میں داخل ہونے کی ضرورت نہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ خاصانِ خدا میں شامل ہونے یا کامِل ہوجانے کے بعد شریعت کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔ شریعت کا پابند ''مسلمان'' کہلاتا ہے اور جب تک کوئی شخص مسلمان نہ بن جائے مومن یا مومنِ کامِل کیسے بن سکتا ہے۔ شریعت ملّت کے خواص اور عوام کا قانون زندگی ہے، یہی ملّت کا سوادِ اعظم ہیں۔ اگر یہ شریعت کے پابند یعنی پکے مسلمان نہ ہوں تو مٹھی بھر اولیاء اللہ کرہی کیا سکتے ہیں، اِس لیے سب سے پہلے اور سب سے آخر ہر حالت میں ہر شخص کے لیے شریعت کی پابندی لازم ہے۔

شریعت کیا ہے؟ ایک سیدھی سادی راہ، طہارت و پاکیزگی، پانچ وقت کی نماز، رمضان کے روزے، روپیہ ہو تو حج اور زکوٰۃ اور جب تحفظ و بقائے ملّت کے لیے ضرورت پڑے تو جہاد۔ اس کے علاوہ قرآن کے بتائے ہوئے اوامر و نواہی پر عمل، اپنے عزیز و اقارب اور اہلِ دُنیا کے ساتھ تمام معاملات میں وہ سلوک جو اللہ اور رسولؐ نے بتایا ہے۔ شریعت کی غایت کیا ہے؟ یہ کہ مسلم عوام دُنیا میں عزت و شرافت اور امن و امان کی زندگی بسر کرنا سیکھیں، تمدن میں ترقی کریں اور اسلامی تعلیم و تہذیب دُنیا بھر میں پھیلائیں اور مرنے کے بعد جنت میں جائیں۔ اب غور کیجئے کہ کیا یہ باتیں کچھ کم وقیع اور کچھ کم ضروری ہیں۔ مگر افسوس کہ ہم ان پر تو پورا عمل نہیں کرتے طریقت و معرفت حاصل کرنے کے لیے نکل کھڑے ہوتے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ خدا تو ملتا نہیں، دُنیا بھی برباد ہوجاتی ہے۔ اس کے بعد

تصوّف کی جھوٹی سچی کچھ باتیں جو کان میں پڑ جاتی ہیں ان کو ذریعہ معاش بنا لیا جاتا ہے اور عوام کا ایمان خراب کیا جاتا ہے۔

اب ہم حکمتِ قرآن کا بیان کرتے ہیں، لیکن آئندہ اس کتاب میں تصوّف کی بجائے حکمت وعرفان اور صوفی کی بجائے سالک وعارف وغیرہ جیسی اصطلاحیں استعمال کی جائیں گی کیونکہ تصوّف اس زمانہ میں جس قدر بدنام ہو چکا ہے اس کے پیشِ نظر یہ لفظ استعمال کرنا اچھا نہیں معلوم ہوتا۔

حکمت

جن طریقوں سے حضور سرورِ کائناتؐ نے اپنے خاص خاص صحابیوں کو حکمت کی تعلیم دی وہ اس قدر سادہ، آسان اور سہل العمل ہیں جیسا کہ خود دینِ اسلام۔ نہ ان میں بھوک اور پیاس سے نفس کو ہلاک کرنا ہے، نہ متواتر روزے رکھنا یا فاقے کرنا، نہ عیسائیوں اور ہندوؤں کی طرح ترکِ دُنیا کر کے جنگلوں اور خانقاہوں میں گوشہ نشین ہونا، نہ صوف کے کپڑے پہننا یا ننگا رہنا، نہ بدن کے بعض اعضاء کو سُکھا لینا، نہ حبسِ دم کرنا یا نماز معکوس پڑھنا، یعنی الٹے لٹک کر عبادت کرنا وغیرہ وغیرہ۔ باوجود اس کے یہ طریقے دوسری تمام قوموں کے طریقوں سے کہیں زیادہ مؤثر ہیں۔ ان پر عمل کرنے سے برسوں کا راستہ مہینوں اور مہینوں کا سلوک دنوں میں طے ہوتا ہے اور وہ روحانی قوّت اور دولتِ سرمدی حاصل ہوتی ہے جو دوسرے طریقوں سے کسی طرح بھی حاصل نہیں ہوسکتی، یعنی قُرب اور مشاہدۂ ذات باری تعالیٰ۔ اس سے زیادہ اسلام کی فضلیت کا ثبوت اور کیا ہوسکتا ہے۔ ان طریقوں کا ذکر ہم سلوک کے بیان میں کریں گے، اس سے پہلے دو اور باتوں کا بیان کر دینا ضروری ہے، یہ دو باتیں ہیں طلب اور بیعت۔ ان کا مفصل حال سنئے۔

طلبِ صادق:

یہ ہے کہ طالب کے دل میں ایسی بے چینی ہو کہ نہ کھانے پینے میں لذت آئے نہ سونے میں نہ کسی اور شغل میں۔ ہر وقت یہ خواہش قلب و ذہن پر مسلط رہے کہ گوہرِ مقصود ہاتھ آئے اور کوئی ایسا استاد ملے جو حکمت سکھائے، یہ طلب وہبی ہوتی ہے لیکن بظاہر اس کے پیدا

ہونے کے اسباب یہ ہوتے ہیں:۔

۱۔ ایسے لوگوں کی صحبت جہاں اللہ، رسول کریمؐ، اور بزرگوں کا ذکر رہتا ہو۔

۲۔ بزرگوں کی کرامتوں کے حالات سننا۔

۳۔ سیر وسلوک کی کتابیں پڑھنا۔

۴۔ کسی سچے ولی کی صحبت میسر آجانا۔

۵۔ کسی بزرگ کی کوئی کرامت خود دیکھنا۔

یہ چند باتیں جتنی زیادہ میسر آئیں گی اتنی ہی طلب زیادہ ہوگی۔

بیعت یا شاگردی:

جب طلب پختہ ہو جائے تو ضرورت ہوتی ہے ایک ایسے بزرگ کی جو حکمت سکھائے، ایسے بزرگ پہلے زمانے میں بھی مشکل سے ملتے تھے آج کل تو بہت ہی کمیاب ہیں اور ایک ناتجربہ کار طالب کے لیے سچے اور جھوٹے کی تمیز کرنا تو بہت ہی مشکل ہے۔ اِس لیے ہم مرشد کے انتخاب کا طریقہ بتاتے ہیں۔

جب تم کسی بزرگ کا ذکر سنو تو نکتہ چینی، عیب جوئی یا آزمائش کے خیال سے نہیں بلکہ ارادت اور ادب کے ساتھ ان کے پاس جاؤ اور اکثر جاتے رہو اور یہ دیکھو کہ اُن کی مجلس میں کس قسم کے لوگ رہتے ہیں ثقہ، سنجیدہ اور تعلیم یافتہ یا بازاری اور جاہل۔ یہ بھی دیکھو کہ اُن بزرگ کا اخلاق کیسا ہے، ہنس مکھ اور خوش مزاج یا درشت مزاج اور تُند خو۔ کیسی باتیں کرتے ہیں، پُر از علم وحکمت یا محض روایات و حکایات ہی پر مدارِ تقریر ہے۔ شرع کے پابند ہیں یا حدودِ شرع سے آزاد۔ گالیاں تو نہیں بکتے، مریدوں سے سجدے تو نہیں کراتے۔ یہ بھی دیکھو کہ اُن کے مریدوں میں بھی کوئی صاحبِ حال اور صاحبِ دل ہے یا نہیں۔ یہ بھی غور کرو کہ

ان کی صحبت میں دل دنیاوی تفکّرات اور خواہشات سے ہٹ کر اللہ کی طرف رجوع ہو جاتا اور ایک قسم کا سرور آمیز سکون حاصل ہوتا ہے یا نہیں۔

الغرض ان تمام باتوں پر غور کرنے کے بعد جب تمہیں معلوم ہو جائے کہ ان کی مجلس میں پاکیزہ لوگ آتے ہیں، وہ خود ہنس مکھ، خوش اخلاق اور عالم آدمی ہیں، شرع کے پابند ہیں، بافیض ہیں، ان کی صحبت میں خیالات دنیا سے ہٹ کر اللہ کی طرف رجوع ہو جاتے ہیں اور تمہارا دل ان کی طرف مائل ہو گیا ہے تو باقاعدہ ان کی خدمت میں حاضر ہوتے رہو اور جب کچھ عرصہ بعد ذوق وشوق کا غلبہ ہو جائے، قلب خود بخود اللہ کو یاد کرنے لگے، بُرائیوں کو دل ناپسند کرے اور محاسن کی طرف رغبت پیدا ہو جائے تب بیعت ہو جاؤ۔ یاد رکھو کہ بزرگوں کی پرکھ ان کی کرامات سے ہرگز نہیں کرنی چاہیے کیونکہ کرامتیں یعنی خوارقِ عادات تو غیر اولیاء اللہ سے بھی اس قدر سرزد ہوتی ہیں کہ طالب دھوکا کھا جاتا ہے۔

بہت سے بزرگ بیعت نہیں کرتے، بغیر بیعت ہی فیض پہنچاتے رہتے ہیں۔ ان سے پورا فیض اٹھانا چاہیے۔ لیکن سلوک طے کرنے کے لیے کسی نہ کسی کامِل بزرگ سے بیعت ہونا ضروری ہے۔ اس طرح اس سلسلے کے جتنے بزرگ گزرے ہیں ان میں اکثر سے نسبتِ روحانی قائم ہو جاتی ہے جو روحانی ترقی کے لیے بہت ضروری ہے۔

مسلمانوں میں ایک فرقہ ایسا بھی ہے جو بیعت یا پیری مریدی کا سرے سے قائل ہی نہیں ہے، اس میں کوئی حرج نہیں ہے اگر وہ قرآن پر عمل کرتے ہیں اور اچھے مسلمان ہیں تو ضروری نہیں کہ وہ کسی کے مرید ہوں۔ بیعت فرض نہیں ہے، لیکن جو لوگ بیعت ہونا چاہتے ہیں اور اس کے لیے شرعی جواز کے متلاشی ہیں، ان کی معلومات کے لیے یہ عرض کر دینا مناسب ہے کہ رسول اکرمؐ نے لوگوں کو مختلف اغراض ومقاصد کے لیے بیعت فرمایا ہے اور

قرآن میں اس کا ذکر یوں آیا ہے۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ یُبَایِعُوۡنَکَ اِنَّمَا یُبَایِعُوۡنَ اللّٰہَ یَدُ اللّٰہِ فَوۡقَ اَیۡدِیۡھِمۡ فَمَنۡ نَّکَثَ فَاِنَّمَا یَنۡکُثُ عَلٰی نَفۡسِہٖ وَمَنۡ اَوۡفٰی بِمَا عٰھَدَ عَلَیۡہُ اللّٰہَ فَسَیُؤۡتِیۡہِ اَجۡرًا عَظِیۡمًا (الفتح ۱۰)

ترجمہ: اے محمدؐ! جو لوگ تم سے بیعت کرتے ہیں وہ اللہ سے بیعت کرتے ہیں، اُن کے ہاتھ پر اللہ کا ہاتھ ہے، جو اس عہد سے پھرتا ہے وہ اپنا ہی نقصان کرتا ہے، اور جو اس عہد کو پورا کرتا ہے جو اُس نے اللہ سے کیا تھا تو بہت جلد اللہ اس کو اجرِ عظیم عطا فرمائے گا۔

اس سے ثابت ہوا کہ بیعت جائز ہے اور رسول اللہؐ کے بعد وہ لوگ بھی بیعت لے سکتے ہیں جو بجا طور پر نائب رسولؐ ہیں۔ بیعت کیا ہے؟ یہ ایک عہد ہے اللہ کے ساتھ جو کسی بزرگ کو گواہ بنا کر یا رسم کے مطابق ہاتھ میں ہاتھ دے کر کیا جاتا ہے کہ میں فلاں فلاں معائب سے مجتنب رہوں گا اور فلاں فلاں محاسن پر عمل کروں گا، علاوہ ازیں قرآن میں آیا ہے۔

یٰۤاَیُّھَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَابۡتَغُوۡۤا اِلَیۡہِ الۡوَسِیۡلَۃَ (المائدہ ۳۵)

یعنی ''اے ایمان والو تقویٰ اختیار کرو اور اللہ کی طرف کسی کو وسیلہ بناؤ''۔ مخالفینِ بیعت کا کہنا ہے کہ وسیلہ سے مراد یہاں قرآن ہے، لیکن وہ یہ غور نہیں کرتے کہ اس آیت کے پہلے ٹکڑے میں جو حکم ہے کہ تقویٰ اختیار کرو، اس کے معنی کیا ہیں؟ تقویٰ کے معنی بھی تو قرآن کی تعلیم پر کماحقہٗ عمل کرنے کے ہیں، اِس لیے آیت کے دوسرے ٹکڑے میں پھر وہی معنی لینا ایک ایسی تکرارِ زائد ہے جو قرآن کی فصاحت کے خلاف ہے۔ ایسی بھونڈی تکرار تو کوئی معمولی ادیب بھی نہیں کرتا۔ اِس لیے وسیلہ سے مراد سوائے پیر کامِل کے اور کچھ نہیں ہو

سکتا۔ تیسری دلیل بیعت کے جواز میں یہ ہے کہ رسول اکرمؐ کے بعد اب تک جو ہزار ہا اولیاء کرام گزرے ہیں، ان سب نے بیعت کی اور بیعت لی ہے، مثلاً حضرت حسن بصریؒ، حضرت جنید بغدادیؒ، حضرت بایزید بسطامیؒ، حضرت شمس تبریزیؒ، حضرت علی ہجویریؒ، حضرت محی الدّین عبدالقادر جیلانیؒ، حضرت خواجہ عثمان ہارونیؒ، حضرت خواجہ معین الدّین چشتیؒ، حضرت قطب الدّین بختیار کاکیؒ، حضرت بابا فرید گنج شکرؒ، حضرت نظام الدّین اولیاءؒ، حضرت صابر کلیریؒ، حضرت نصیرالدّین محمود چراغ دہلویؒ حضرت بہاؤالدّین نقشبندؒ، حضرت خواجہ باقی باللہؒ اور حضرت شیخ احمد مجدّد الف ثانیؒ وغیرھُم۔ تو کیا یہ سب نعوذ باللہ غلط رَو اور گمراہ تھے۔ یہی تو وہ بزرگ ہستیاں ہیں جنھوں نے چار دانگِ عالم میں اسلام کا نور پھیلایا، لاکھوں آدمیوں کو بیعت کر کے ان کا اخلاق درست کیا اور ہزاروں کو ولی اللہ بنایا۔ کیا آج کوئی شخص یہ جسارت کر سکتا ہے کہ ان کی بزرگی اور صداقت پر انگلی اٹھائے۔

اب ہم یہ بتائیں گے کہ بیعت یا بالفاظِ عوام ''پیری مُریدی'' کیا چیز ہے، مرید کس کو ہونا چاہئے اور کس لیے ہونا چاہئے۔ افسوس کہ فی زمانہ نماز روزے کی طرح پیری مریدی بھی ایک رسمی چیز رہ گئی ہے۔ بہت سے لوگ اس عقیدے سے بیعت ہوتے ہیں کہ خواہ عمر بھر بُرے کام کرتے رہیں قیامت کے دن پیر صاحب کے جھنڈے تلے جمع ہو جائیں گے اور بخشے جائیں گے۔ یہ عقیدہ غلط ہے۔ ان لوگوں کو معلوم ہونا چاہئے کہ پیر صاحب کسی کو بھی نہ بخشوا سکیں گے، ان کو تو اپنی ہی پڑی ہوگی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت بالکل برحق ہے لیکن شفاعت کے بھروسہ پر جان بوجھ کر نیک اعمال نہ کرنا اور ساری عمر گناہوں اور بدکاری میں صرف کر دینا کہاں کی عقلمندی ہے۔ رسول اللہؐ بھی تو انہی کی شفاعت کریں گے جو شفاعت کے اہل ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں، ہماری جناب میں کوئی بھی کسی کی

شفاعت نہ کر سکے گا مگر وہ جن کو ہم خود حکم دیں۔ ظاہر ہے کہ رسولوں اور علی الخصوص ہمارے رسولؐ سے بڑھ کر کون اس حکم الٰہی کا مستحق ہو سکتا ہے، اِس لیے شفاعت کا عقیدہ رکھتے ہوئے بھی نیک اعمال کو ہرگز ہاتھ سے جانے نہ دینا چاہیے۔

اکثر لوگ دنیاوی برکتوں کے لیے مُرید ہوتے ہیں، یہ بھی غلط ہے۔ ان لوگوں کو یاد رکھنا چاہئے کہ پیر صاحب نہ کسی کو دولت بخش سکتے ہیں، نہ اولاد عطا فرما سکتے ہیں، نہ کسی کی تقدیر بدل سکتے ہیں، نہ مقدمہ جتا سکتے ہیں، نہ آنے والی مصیبتوں سے بچا سکتے ہیں۔ سورۃ الحدید میں ہے کہ:

مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فِى الْاَرْضِ وَلَا فِىْٓ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِىْ كِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ أَنْ نَّبْرَاَهَا اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ (الحدید:۲۲)

”کوئی مصیبت زمین پر اور خود تم پر نہیں پڑتی مگر بیشتر اس کے کہ ہم اس کو لکھ دیں ایک کتاب میں اور یہ کام اللہ کو آسان ہے“ اب بتائیے کہ اللہ کے لکھے کو پیر صاحب کس طرح بدل یا روک سکتے ہیں، ایسے عقیدے ہرگز نہیں رکھنے چاہئیں، یہ سب شرک ہیں۔ سورۃ الجن میں اللہ تعالیٰ رسول اکرمؐ سے خطاب کرتا ہے ”کہہ دے کہ میرے ہاتھ میں نہیں ہے تمہارا بُرا بھلا“ اب فرمائیے جب رسول اللہؐ کے ہاتھ میں بھی کسی کا بُرا بھلا نہیں تو پیر صاحب بے چارے کس شمار میں ہیں۔ مسلمانو یاد رکھو اور خوب یاد رکھو کہ تمہاری انفرادی اور قومی تباہی کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ تم نے قرآن کے خلاف عقیدے گھڑ لیے ہیں اور ان پر قائم ہو کر قرآن اور اللہ کو پس پشتِ ڈال دیا ہے۔ آج تم قرآن اور اللہ کی طرف لوٹ آؤ، کل تم کو وہی عزت پھر حاصل ہو جائے گی جو قرونِ اولیٰ میں تھی۔

اکثر لوگ اس خیال سے بیعت ہوتے ہیں کہ جب بزرگ بن جائیں گے تو عیش کریں

گے۔ مریدوں کا حلقہ ہوگا، نذرانے ملیں گے، دولتِ دُنیا کی افراط ہوگی یا یہ کہ مٹی کو پھونک مار کر سونا بنا لیں گے، موت اور زندگی پر اختیار حاصل ہوجائے گا اور عزت ہوگی وغیرہ وغیرہ۔ تو ایسے لوگوں کو معلوم ہونا چاہئے کہ فقر اور ولایت تو محض عبودیت اور بندگی ہے کبریائی نہیں ہے اور بزرگی کے ذریعہ حصولِ مراتب و دولت کا خیال تو محض دُنیاداری ہے خدا کی محبت نہیں ہے، ایسے لوگوں کو کچھ بھی حاصل نہیں ہوگا۔

آج کل خاندانی اور وراثتی پیری مریدی بھی عام ہے، یعنی کسی شخص کے باپ دادا اگر کسی بزرگ سے بیعت ہوئے تھے تو وہ شخص ان بزرگ کے بیٹے یا پوتے کا ضرور مرید ہوگا اور اس کی اولاد اس کے پیر صاحب کی اولاد سے بیعت ہوگی اور ہمیشہ یونہی ہوتا رہے گا۔ یہ طریقہ بھی پیری مریدی کا نہایت ہی غلط اور تباہی پھیلانے والا ہے۔ ہوتا یوں ہے کہ کبھی کوئی واقعی بزرگ اور ولی اللہ کسی خاندان میں پیدا ہوئے اور اپنی بزرگی کی وجہ سے مشہور ہو گئے، اُن کے بعد اُن کے بیٹے اور پوتے گدّی نشین ہوئے اور یہ گدی اسی طرح وراثتاً آئندہ نسلوں میں منتقل ہوتی رہی اور لوگ بھی اسی طرح وراثتاً مرید ہوتے چلے گئے۔ ایسے گدی نشین اور وراثتی پیروں میں شاذ و نادر ہی کوئی بزرگ ہو تو ہو ورنہ عام طور پر تو یہ پیر محض دُنیادار اور طریقت و حقیقت سے بالکل ہی نابلد ہوتے ہیں۔ خدمت کے لیے بے شمار مرید اور خرچ کرنے کے لیے بے قیاس دولت ان کے پاس موجود ہوتی ہے۔ صرف عیش و عشرت ان کا کام ہوتا ہے اس کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔

بہت سے پیر عملیات کے زور پر پیری مریدی کرتے ہیں، وہ سلوک و طریقت کی ابجد سے بھی واقف نہیں ہوتے۔ عوام کی جہالت کا یہ حال ہے کہ وہ تعویذ گنڈے کرنے والے عاملوں، نجومیوں، رمالوں، پامسٹوں اور حقیقی بزرگوں کے درمیان کوئی تمیز نہیں کرسکتے اور ہر

ایک کو اللہ والا سمجھ کر ان کے مرید یا معتقد ہو جاتے ہیں۔ تو اس قسم کی پیری مریدی نہ صرف بالکل عبث اور بیکار بلکہ نقصان دہ ہوتی ہے۔ مرید ہونے کا مقصد صرف یہ ہے کہ انسان کے اخلاق کی اصلاح ہو، صحیح قسم کی عبادت کرنا آئے، ایمانِ کامل پیدا ہو، عالمِ روحانی کا علم، اللہ تعالیٰ کی معرفت اور قسمت میں ہو تو رویت کا شرف جیتے جی حاصل ہو جائے۔

آدابِ سلوک:

اب ہم پیری اور مریدی کے کچھ آداب بیان کرتے ہیں۔

جب تم کسی مرشد کا انتخاب کر کے اس سے بیعت ہو جاؤ تو پھر تمہیں مندرجہ ذیل قواعد پر پوری طرح عمل کرنا چاہیے۔

جب تک بصیرتِ باطنی پیدا نہ ہو یا تمہارا مرشد اجازت نہ دے، حصولِ تعلیم یا کسبِ فیض کے لیے کسی دوسرے بزرگ کے پاس نہ جاؤ۔ اپنے مرشد کو دُنیا کے باقی تمام زندہ بزرگوں سے زیادہ کامل سمجھو۔ خدا، رسول، صحابہ اور ائمہ کے بعد سب سے زیادہ محبت اپنے مرشد سے کرو، اس کے احکام اور ہدایات پر آنکھ بند کر کے عمل کرو۔ اگر پیر کا کوئی ارشاد سمجھ میں نہ آئے تو مناسب وقت اور تخلیہ میں نہایت ادب کے ساتھ اس کا مطلب پوچھو۔ شیخ کی مجلس میں ادب سے خاموش بیٹھو، خود ہرگز نہ بولو۔ شیخ کو بولنے کا موقع دو اور جو کچھ وہ کہے، غور سے سنو اور اس پر عمل کرو۔ یاد رکھو کہ تم بزرگوں کے پاس کچھ سیکھنے جاتے ہو ان کو سکھانے نہیں جاتے۔ جو لوگ بزرگوں کی مجلس میں خود بولتے رہتے ہیں اور ان کو بولنے کا موقع نہیں دیتے وہ نہ صرف بدتمیزی کے مرتکب ہوتے ہیں بلکہ اپنا اور دوسروں کا وقت ضائع کرتے ہیں۔ اگر شیخ خاموش ہو لیکن مراقبہ یا حالتِ استغراق میں نہ ہو تو کوئی مناسب سا سوال کر دو تا کہ وعظ و نصیحت اور حکمت و معرفت کا دریا پھر بہنے لگے۔ شیخ سے بحث و

مباحثہ کبھی نہ کرو، اس کے سامنے حرکات وسکنات میں انتہائی ادب ملحوظ رکھو، لیکن یہ خیال رہے کہ معاملہ تعبُّد کی حد تک نہ پہنچ جائے، مثلاً اتنا جھکنا کہ رکوع سے مماثلت پیدا ہو، سجدہ کرنا یا مجلس میں اس طرح بیٹھنا جیسے نماز میں اللہ کے سامنے بیٹھتے ہو ہرگز جائز نہیں، لیکن یہ بھی نہیں چاہیے کہ شیخ کی مجلس میں لیٹ جاؤ یا پاؤں پھیلا کر بیٹھو۔

مریدوں کے علاوہ عام لوگ بھی جب کسی بزرگ کی مجلس میں جائیں تو ان کو بھی انہی آداب کا خیال رکھنا چاہیے۔ انہیں چاہیے کہ بزرگوں کی مجلس میں جا کر دُنیا کی باتیں ہرگز نہ کریں، ان سے غیب کی باتیں ہرگز نہ پوچھیں، یہ فقر اور بزرگی کی سب سے بڑی توہین ہے۔ یہ کام بزرگوں کا نہیں بلکہ نجومیوں، رمّالوں اور پامسٹوں وغیرہ کا ہے اور اس پر یقین کرنا بھی منع ہے۔ سورۃ الانعام آیت ۵۰ میں اللہ تعالیٰ سرورِ دو عالمؐ کو خطاب کرتا ہے۔

''کہہ دے کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں نہ میں غیب کی باتیں جانتا ہوں نہ میں فرشتہ ہوں''۔

جب اللہ یہ فرماتا ہے کہ رسول کو بھی غیب کا علم نہیں تو تم اولیاء اللہ سے کیوں یہ امید رکھتے ہو کہ وہ تمہیں مستقبل کا حال بتائیں۔ اولیاء اللہ کے پاس تعویذ گنڈوں کے لیے بھی نہیں جانا چاہیے یہ کام عاملوں کا ہے۔ اولیاء اللہ تعویذ گنڈے کبھی نہیں کرتے، وہ صرف دعا کرتے ہیں، ان کے پاس دعا کرانے کو بے شک جاؤ۔ دعا کرانے کا طریقہ بھی یہ ہے کہ کسی بزرگ کے سامنے جا کر لمبی چوڑی داستانیں اور پچھلی ہسٹری اور قصے جیسے کہ مقدمات میں وکلاء یا بیماریوں میں ڈاکٹروں یا حکیموں کے سامنے بیان کرتے ہو ہرگز نہ کرو، بلکہ صرف دو الفاظ میں کہو کہ میں فلاں اَمر کے لیے دعا چاہتا ہوں۔ یاد رکھو کہ دُنیا داری کے لمبے چوڑے قصے سننے سے شیخ کا دھیان اللہ کی طرف سے ہٹ جاتا ہے اور اس کی طبیعت منغّض ہو جاتی ہے۔

ایسی حالت میں دعا دل سے نہیں نکلتی۔ الغرض شیخ کی مجلس میں کوئی حرکت ایسی نہ کرو جس سے اس کی طبیعت مکدر ہو جائے۔ اگر تمہاری باتوں سے اس کی طبیعت خوش ہوگی اور کیف پیدا ہوگا تو اس حالت میں دعا بھی قبول ہوگی۔ اگر کوئی بزرگ تم سے وعدہ کر لے کہ انشاءاللہ تمہارا کام ہو جائے گا تو بار بار اس سے تقاضا مت کرو۔ یاد رکھو وہ تمہارا مقروض نہیں ہے۔ ہاں کبھی کبھار تذکرۃً ادب کے ساتھ یاد دہانی کرا دو تو مضائقہ نہیں۔ جس مقصد کے لیے دعا کرائی ہے اگر اس میں کامیابی ہو جائے تو تمہارا اخلاقی فرض ہے کہ بزرگ کو اس کی اطلاع دو، اللہ اور اس بزرگ کا شکریہ ادا کرو۔ سب سے اچھا یہ ہے کہ بزرگوں کی مجلس میں بالکل بے غرض ہو کر صرف پند و نصائح سننے کو جاؤ۔

بزرگوں کو دعا کے بدلے میں شکرانہ، نذرانہ وغیرہ ادا کرنا جائز نہیں البتہ کبھی کبھی ہدایا یعنی تحفے دیئے جاسکتے ہیں، کیونکہ ہدیہ لینا اور دینا شرعاً جائز ہے۔ اس سے محبت بڑھتی اور روابط مضبوط ہوتے ہیں۔ لیکن یاد رکھو کہ ہدیہ کسی کام کی اُجرت میں نہیں دیا جاتا، یہ محض خلوص و محبت کی نشانی کے طور پر دینا چاہیئے۔ جو بزرگ محتاج اور مفلوک الحال ہوں، ہدیہ کے ذریعہ ان کی خدمت کرنا بہت ثواب کی بات ہے۔ اس طرح وہ دُنیا کے بہت سے افکار سے بے نیاز ہو کر وعظ و تلقین سے خلق اللہ کی خدمت اور سکون سے اللہ اللہ کر سکتے ہیں، مگر اہل اور نا اہل کو ضرور دیکھ لینا چاہیئے، ایسے بزرگوں کی مدد کا حکم قرآن میں بھی ہے۔

جس طرح مریدوں اور عوام کے لیے اوپر بتائے ہوئے آداب ضروری ہیں، اسی طرح بزرگوں کو بھی مریدوں اور عوام کے ساتھ ملتے وقت چند آداب و قواعد کا خیال رکھنا ضروری ہے، مثلاً جو لوگ ملنے آئیں ان کو بہت دیر تک ملاقات کے انتظار کی تکلیف نہیں دینا چاہیئے۔ یاد رکھنا چاہیئے کہ آپ فقیر اور اللہ کے ایک عاجز بندے ہیں، کہیں کے گورنر اور

ڈپٹی کمشنر نہیں جو لوگوں کو گھنٹوں انتظار میں رکھتے ہیں۔ ملاقات کے لیے ایک وقت مقرّر کر دیا جائے تو بہت ہی اچھا ہے۔ حاضرین سے نہایت محبت و مدارات سے پیش آنا چاہیے، اگر کسی سے کوئی بدتمیزی سرزد ہو تو بُرا نہیں ماننا چاہیے بلکہ خندہ پیشانی سے برداشت کرنا چاہیے۔ کسی کو اس کے عیب صاف صاف بتا کر ڈانٹنا اور بُرا بھلا کہنا فقیر کی شان کے خلاف ہے۔ بلکہ نصیحت ہمیشہ اشارے اور پردے میں کرنی چاہیے، مثلاً کسی شخص میں کوئی عیب ہو تو اس عیب کی خرابیاں اس شخص کے سامنے بیان کی جائیں، خود اس شخص کو بُرا بھلا نہ کہا جائے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے جو فرمایا ہے

اُدۡعُ اِلٰی سَبِیۡلِ رَبِّکَ بِالۡحِکۡمَۃِ وَالۡمَوۡعِظَۃِ الۡحَسَنَۃِ (النحل۔۱۲۵)

اس کا مطلب ہی یہ ہے۔

بزرگوں کے پاس لوگ اکثر اس وقت آتے ہیں جب ہر طرف سے مایوس ہو جاتے ہیں۔ آنے والوں میں اکثر بہت ہی مظلوم، دکھی اور محتاج لوگ ہوتے ہیں۔ وہ خدا جانے دل میں کیا کیا امیدیں لے کر حاضر ہوتے ہیں، اُن کو جھڑکنا اور ان پر ناراض ہونا فقیروں اور بزرگوں کا کام نہیں، یہ دنیوی حُکام کا کام ہے۔ فقیروں کو اس بات سے ہمیشہ مجتنب رہنا اور ''وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنۡھَرۡ'' کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھنا چاہیے۔ یاد رکھو ''صاحب الغرض مجنون'' کوئی ایسی حرکت نہ کرو کہ ان کے دلوں کا زخم اور گہرا ہو جائے۔ ان آنے والوں میں شرابی، زانی، چور، ڈاکو وغیرہ سب ہی لوگ ہو سکتے ہیں، فقراء کا یہ منصب نہیں کہ گناہوں کی وجہ سے ان سے نفرت کریں اور ان کو اپنی بارگاہوں سے دھکے دے کر نکلوا دیں۔ فقراء کا فرض تو ان کی اصلاح ہے اور اصلاح صرف پیار، محبت اور باطنی ہمت صرف کرنے سے ہوتی ہے، مار دھاڑ سے نہیں ہوتی۔ اگر تم ان کو اپنی مجلس میں بیٹھنے ہی نہ دو گے تو پھر اصلاح کس طرح ہوگی۔

بزرگوں کو اہلِ غرض کی تمام جائز باتوں کے لیے دعا کرنی چاہیے اور ایسا میٹھا بولنا چاہیے کہ انہیں محسوس ہو کہ کسی نے زخمِ دل پر مرہم رکھ دیا ہے۔ غیر مذاہب کے لوگ بھی بزرگوں کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں، ان کے ساتھ اس قدر حسنِ خلق اور محبت سے پیش آنا چاہیے کہ وہ اسلامی اخلاق اور تعلیمِ قرآن کی عقیدت و محبت دلوں میں لے کر واپس جائیں۔

اب ہم سلوک اور اس کو طے کرنے کے عملی طریقے بیان کرتے ہیں۔

سلوک اور اس کے عملی طریقے

رسولِ اکرمؐ نے سلوک طے کرنے کے یہ طریقے بتائے تھے۔

۱۔ چوبیس گھنٹے چلتے پھرتے اٹھتے بیٹھتے بلکہ سوتے ہوئے بھی اللہ کو یاد رکھنا۔

۲۔ پنج وقتہ نماز حضوریٔ قلب کے ساتھ

۳۔ تلاوتِ قرآن

۴۔ نوافلِ تہجد

۵۔ تزکیۂ اخلاق

ظاہر ہے کہ حضورؐ کے زمانہ میں جتنے اعراب مسلمان ہو چکے تھے، وہ سب نہ تو ان طریقوں پر عمل کرتے تھے نہ سب کو مرتبۂ ایمان حاصل تھا۔ ان کی اکثریت صرف مسلمان تھی، لیکن جن لوگوں کو حضورؐ کی صحبت کا شرف حاصل تھا، وہ سب مومن تھے۔ ان بزرگوں میں بھی جو کوئی رسول اللہؐ سے جتنا زیادہ تقرب اور محبت رکھتا تھا، اس کا ایمان اتنا ہی محکم اور مستحکم تھا۔ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ ملّتِ اسلامیہ دو جماعتوں میں تقسیم کی جا سکتی ہے، ایک مسلمان، دوسرے مومن۔ اب معلوم ہونا چاہئے کہ اعمال واخلاق کے لحاظ سے تمام مسلمان بھی ایک درجے کے نہیں ہوتے، بہت سے فاسق و فاجر اور بے انتہا گنہگار ہوتے ہیں، دوسرے ان سے کم اور پھر ان سے بھی کم و قِس علٰی ھٰذا، اور آخر میں بہت سے لوگ نہایت ہی متّقی، پرہیزگار، صالح اور عبادت گزار بھی ہوتے ہیں۔ یہی حالت مومنوں کی بھی ہے۔ معمولی درجہ کے مومن، اوسط درجے کے مومن اور آخر میں اعلٰی درجہ کے مومن۔ ایمان

کی تعریف رسول اکرمؐ نے یہ فرمائی ہے کہ عبادت کرتے میں تم یہ محسوس کرو کہ خدا تم کو دیکھ رہا ہے، لیکن اعلیٰ درجے کے ایمان کی تعریف یوں کی ہے کہ جب تم عبادت کر رہے ہو تو یہ محسوس کرو کہ تم خدا کو دیکھ رہے ہو۔ ایمان کا یہ درجہ سب سے بڑا ہے، اس درجہ کے ایمان کو احسان کہتے ہیں۔ بہرحال مرتبۂ ایمان ہو یا مرتبۂ احسان، حضور اکرمؐ کی زندگی میں یہ مرتبہ آپ کے فیضِ صحبت سے میسّر آ جاتا تھا۔

سرکارِ دو عالمؐ کی وفات کے بعد صحابۂ کبار کے فیضِ صحبت سے بھی یہ بات میسّر ہو جاتی تھی لیکن بعد میں جتنا بُعد حضورؐ کے زمانہ سے ہوا، یہ فیضِ صحبت کم ہوتا گیا۔ جب عرب کے علاوہ دوسرے ممالک کی پوری آبادیوں نے مذہبِ اسلام قبول کر لیا، خلافت کی جگہ بادشاہت نے لے لی، دولتِ دُنیا کی بہتات اور فسق و فجور کی زیادتی ہوئی، اللہ اور رسولؐ کی محبت دلوں سے جاتی رہی، بادشاہوں اور امیروں میں عیاشی اور بے دینی عام ہوگئی تو اہل اللہ نے ان لوگوں سے الگ ہو کر خانقاہیں آباد کیں اور گوشہ میں بیٹھ کر حکمت کی تعلیم دینے لگے۔ وہ ایسا کرنے میں حق بجانب اور مجبور تھے۔ ان بزرگوں اور اُن کے مریدوں میں خالص عرب عنصر برائے نام ہی رہ گیا تھا، زیادہ تر یہ لوگ عجمی اور نومسلم تھے مثلاً ایرانی، شامی، مصری، ہندوستانی وغیرہ۔

ان تمام قوموں میں پہلے سے اپنا تصوّف اور عالمِ روحانی کا ایک خاص تصوّر اور فلسفہ موجود تھا اور اس عالمِ روحانی کی معرفت حاصل کرنے کے خاص طریقے سینکڑوں سال سے مروّج چلے آتے تھے مثلاً حلقوں میں ذکر کرنا، رقص و سرور اور ریاضت ہائے شاقہ جیسے کہ یوگ کی مشقیں۔ اس سے بھی کہیں زیادہ جو چیز ان عجمیوں کے تصوّف میں تھی وہ کشف و کرامات کے مظاہرات تھے۔ یہ تمام باتیں حکمت میں بھی سالکین کو خود بخود بلا کوشش حاصل

ہوجاتی تھیں، لیکن ابتدائے اسلام میں جو بزرگ تھے وہ نہ تو کرامتوں کو کوئی خاص وقعت دیتے تھے نہ ان کا اظہار کرتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ ایسا کرنے سے توحید اور حق پرستی کی بجائے اشخاص پرستی پیدا ہوجائے گی جو ملّت کی تباہی کا باعث ہوگی، لیکن زمانہ مابعد کے اولیاء اس پر مجبور ہوگئے کہ تبلیغِ اسلام کے لیے غیر مسلم صوفیوں سے بہتر کرامات دکھائیں۔ اسی طرح وہ اس بات پر بھی مجبور ہوگئے کہ ہر عجمی قوم کے رجحانات اور مقتضیات کے مطابق حکمت کے ابتدائی طریقوں میں کچھ تغیّر و تبدّل ضرور کریں۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ سب سے پہلے ۱۱۰ ہجری میں حضرت حسن بصریؒ نے بصرے میں فلسفۂ تصوّف کا درس شروع کیا، گویا تعلیمِ حکمت اب دلوں سے نکل کر زبان پر آنے لگی۔ اس کے بعد تیسری صدی ہجری میں حضرت ذوالنون مصریؒ نے علم تصوّف کو باقاعدہ مُدوّن کیا، گویا ''حال'' اور کوائفِ باطنی کے لیے اصطلاحات وضع کی گئیں اور یہ علم رفتہ رفتہ کتابی بننے لگا، جیسے کسی زبان کے وجود میں آنے کے بعد اُس کی گرامر تیار ہوتی ہے۔ مختصر یہ کہ رفتہ رفتہ یہ علم کتابی بنتا گیا اور حصولِ مقصد کے ذرائع اور قواعد میں بھی ترمیم و تنسیخ اور اختراع و ایجادات ہوتی گئیں اور عجمی رنگ غالب آتا چلا گیا۔ مثلاً ایران کے مشائخ نے ذکر بصورت حلقہ شروع کیا۔ یعنی سب بزرگ مل کر ایک دائرہ بناتے اور باآواز بلند ذکر کرتے اور اگر دَورانِ ذکر کسی پر وجد طاری ہوتا تو وہ حلقے کے بیچ میں آکر حال کھیلتا اور تمام حلقہ اس کے گرد ذکر کرتے یا اشعار پڑھتے ہوئے رقص کرتا۔ یا مثلاً جب خواجۂ بزرگ معین الدین چشتیؒ نے ہندوستان پہنچ کر تبلیغ شروع کی اور دیکھا کہ ہندوؤں کی تمام عبادتوں کا جزوِ اعظم گانا بجانا اور اُن کی روحانیت کا ماحصل یوگ کے کرشمے دکھانا ہے تو آپ نے ان کو رُجوع کرنے کے لیے سماع یعنی قوالی جاری کی، نیز یوگ کا مطالعہ کر کے اپنے مریدوں کو سکھایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ

ہندو جوق در جوق ان کے حلقوں میں شامل اور مسلمان ہونے لگے۔

المختصر یہ تبدیلیاں ہوتے ہوتے چار بڑے خاندان قادریہ، چشتیہ، نقشبندیہ اور سہروردیہ وجود میں آئے۔ پھر ان میں بھی بہت سی شاخیں نکل آئیں اور ذکر وفکر کے طریقوں میں تھوڑا بہت تغیر ہوتا رہا۔ یہاں تک تو حالات پھر بھی قابلِ اطمینان رہے، لیکن جب ملحد مغل بادشاہ اکبر نے دینِ الٰہی جاری کیا اور اس میں عیسائی، ہندو اور مسلمان تمام مذاہب کے اُصولوں، عقیدوں اور رسموں کو مدغم کر دیا تو اس کا یہ اثر ہوا کہ ہندو بھی اپنی توحید کو مسلمانوں کی توحید کے برابر سمجھنے لگے۔ اتنا ہی نہیں خود عام مسلمانوں میں بھی یہی خیال راسخ ہو گیا کہ توحید کا دُرِّ یکتا صرف ہمارے ہی خزانہ میں نہیں، دوسرے مذاہب کی تجوریوں میں بھی موجود ہے۔ اس پر غضب یہ ہوا کہ وحدت الوجود کے غلط عقیدے کی وجہ سے چونکہ توحید کا اصلی مفہوم ان کے دماغ سے نکل چکا تھا، وہ دوسروں کے خزف ریزوں کو بھی گوہرِ یکدانہ ہی سمجھ بیٹھے اور اپنے دین کی فضیلت کا جو یقین ان کے دلوں میں قائم تھا، ضائع ہو گیا۔

حصولِ حکمت کے جو چار مُستند طریقے آج کل رائج ہیں وہ اگر چہ بجنسہٖ تو وہ نہیں جو حضور سرورِ کائنات ؐ نے تعلیم فرمائے تھے، لیکن ان میں کچھ خامی بھی نہیں ہے۔ طالبین ان سے پورا استفادہ کر سکتے ہیں بشرطیکہ مرشد کامل ہو۔ یہاں اِن طریقوں کو الگ الگ اور مفصل طور پر بیان کرنے کی ضرورت نہیں، کیونکہ وہ سب بہت عام اور مشہور ہیں۔ ہاں موجودہ زمانہ کی ذہنیت اور طالبین کی مصروف زندگی کو دیکھتے ہوئے ہم نے خود معمولی سی ترمیم واختراع کے بعد کچھ طریقے حصولِ حکمت کے مقرّر کیے ہیں اور ان کو تجربہ کے بعد مفید اور سہل العمل پایا ہے، اِس لیے ہم یہ طریقے بیان کرتے ہیں جو حسبِ ذیل ہیں:۔

ذکر

ا۔ پاس انفاس۔

۲۔نفی اثبات۔

۳۔نمازِ فرض اور نوافل۔

۴۔تلاوتِ قرآن۔

مجاہدہ

۵۔ترک ماسوئ اللہ۔

۶۔تسلیم و رضا۔

تزکیۂ اخلاق

۷۔غصّہ اور نفرت کی نفی

۸۔عالمگیر محبت اور صداقت یعنی حق کو اختیار کرنا

عرفان

۹۔تفکّر

مقصودِ اعظم

۱۰۔خدمتِ خلق

اب ان کی تفصیل سنئے:۔

ا۔پاس انفاس:

پاس انفاس کے لفظی معنی ہیں سانسوں کا لحاظ رکھنا، یعنی کوئی سانس اللہ کی یاد سے خالی نہ رہے۔طریقہ اس کا یہ ہے کہ ہر سانس جو اندر جائے یا باہر آئے اس سے لفظ ''اللہ'' اس طرح کہو کہ دل کہے اور کان سُنیں۔جلدی جلدی اللہ اللہ کہنے کے خیال سے سانس جلدی جلدی نہ لو، سانس کی لمبائی قدرتی رہے، لفظ ''اللہ'' کو سانس کے مطابق لمبا کرلو۔اندر جانے والے

سانس کے ساتھ جو "اللہ" کہا جائے وہ دل سے شروع ہو کر اُم الدِّماغ میں ختم ہو اور باہر نکلنے والا سانس اُم الدِّماغ سے شروع ہو کر دل میں گھس جائے۔ اس طرح اللہ اللہ کہتے وقت یہ محسوس کرنے کی کوشش کرو کہ اللہ تمہارے اندر، باہر، اوپر، نیچے، دہنے، بائیں، اردگرد کے مادّے اور خلاء میں ہر جگہ موجود ہے اور خواہش پیدا کرو کہ وہ نظر آ جائے۔ یہ خواہش ہی محبت الٰہی کی ابتدا ہے۔

اس کو بڑھاتے رہو۔ ظاہر ہے کہ یہ ذکر صرف فرصت کے اوقات میں ہو سکتا ہے، کام کاج کی مصروفیت میں نہیں ہوسکتا۔ اِس لیے یہی کوشش کرو کہ فرصت کا کوئی لمحہ اس سے خالی نہ رہنے پائے تم دیکھو گے کہ کچھ عرصہ بعد کام اور بات چیت کرتے وقت بلکہ سوتے میں بھی یہ ذکر خود بخود جاری رہے گا اور کوئی دِقّت پیش نہ آئے گی۔

اس ذکر کی غرض وغایت صرف یہ ہے کہ اللہ کی یاد مستقلاً دل میں بیٹھ جائے۔ رسول اکرمؐ کے زمانے میں ذکر پاس انفاس نہیں کرایا جاتا تھا کیونکہ اللہ کی مستقل یاد حضورؐ کی صحبت سے صرف چند دن میں حاصل ہو جاتی تھی۔

اسمِ ذات یعنی اللہ اللہ کے علاوہ اور اسماء کا ذکر بھی پاس انفاس کے لیے بتایا جاتا ہے مگر اُن اسماء کا انتخاب صرف مرشد ہی کر سکتا ہے طالب خود مقرّر نہیں کر سکتا۔

۲۔ نفی اثبات:

"لَآ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ" کے ذکر کو نفی اثبات کہتے ہیں۔ کیونکہ "لَآ اِلٰـہَ" کے معنی ہیں "کوئی معبود نہیں ہے" یہ نفی ہوئی اور "اِلَّا اللّٰہُ" کے معنی ہیں "لیکن اللہ" یہ اثبات ہوا۔ طریقِ حکمت میں یہ ذکر کرتے ہوئے لا الٰہ کہتے وقت نفی کی مشق کے واسطے یہ خیال کیا جاتا ہے کہ کوئی چیز بھی موجود نہیں ہے۔ طریقہ اس کا یوں ہے کہ تہجد، فجر، مغرب یا عشاء کی نماز کے بعد

دعا سے فارغ ہو کر اسی طرح دو زانو بیٹھے بیٹھے آنکھیں بند کر کے چند مرتبہ درود شریف رسول اکرمؐ کو یاد کرتے ہوئے پڑھو۔ پھر دماغ کو تمام دنیاوی وساوس و خیالات سے پاک کرو۔ اس کے بعد ناف کے ایک انگشت نیچے سے لفظ ''لا'' شروع کرو، اس وقت گردن جھک جائے گی، اب گردن اوپر اٹھاتے جاؤ اور ''لا'' کو کھینچتے ہوئے بالکل سیدھا اُوپر کی طرف لاتے جاؤ، یہاں تک کہ گردن تن جائے اور سر کسی قدر اُوپر اٹھ جائے۔ اس طرح لفظ ''لا'' کو ام لدِّماغ میں ختم کرو۔ اب گردن کو داہنی طرف موڑو یہاں تک کہ سر دہنے کندھے کی طرف ڈھلک جائے، اسی کے ساتھ لفظ ''الٰہ'' کہو اور خیال کرو کہ کوئی شے اور کوئی ہستی موجود نہیں ہے۔ یعنی دماغ میں کوئی بھی خیال باقی نہ رہے۔ بالکل خالی ہو جائے۔ چار پانچ سیکنڈ ٹھیرو اور اگر کوئی خیال باقی ہے تو اس کو نفی کرو، پھر گردن اور سر کو بائیں طرف قلب کی جانب جھکاتے ہوئے جھٹکے اور پوری طاقت سے ''اِلَّا اللّٰہُ'' کی ضرب دل پر لگاؤ اور فوراً یہ خیال کرو کہ صرف اللہ ہی اللہ موجود ہے اس کے سوا اور کچھ نہیں، یعنی اب دماغ میں صرف اللہ کا خیال باقی رہے۔ دل بائیں چھاتی سے دو انگشت نیچے واقع ہے اور اس کی صورت صنوبر کی سی ہے، یعنی ایسی پشت ''اِلَّا اللّٰہُ'' کی ضرب دل کی پشت پر لگانی چاہئے۔ یہ ذکر کرتے ہوئے جب تھک جاؤ یا سانس پھول جائے تو ''اِلَّا اللّٰہُ'' کے بعد ''مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ'' کہہ کر کلمہ پورا کر لیا کرو اور رسول اللہ پر درود بھیجو۔ یہ ذکر ایک تسبیح سے لے کر دس تسبیح تک کرنا چاہئے۔ جتنی طاقت ہو اور جتنی دیر دل لگے، جب دل اُچاٹ ہو جائے تو ذکر بند کر دو۔ اگر تسبیح یا انگلیوں پر شمار کرنے میں دھیان بٹے تو ایک دفعہ گھڑی رکھ کر دیکھ لو کہ ایک تسبیح کتنی دیر میں ہوتی ہے، پھر وقت کے لحاظ سے کرتے رہو۔

بلندیٔ آواز کے لحاظ سے یہ ذکر تین طرح ہو سکتا ہے۔ بہت بلند آواز سے، صرف اتنی

آواز سے جو کمرے سے باہر نہ نکلے اور سوائے تمہارے دوسرا نہ سنے یا پھر بالکل دل ہی دل میں۔ ابتدا میں بلند آواز سے ذکر کرنا بہتر ہے کیونکہ اس طرح اور آوازیں کانوں میں نہیں آتیں اور دھیان نہیں بٹتا، لیکن اگر کسی ساتھی یا پڑوسی کے آرام میں خلل آتا ہو تو پھر آہستہ آواز ہی سے کرنا چاہیئے۔ یہ ضروری ہے کہ ابتدا میں برس چھ ماہ یہ ذکر ایک وقت اور ایک جگہ مقرّر کر کے کیا جائے، اس سے بہت فائدہ ہوتا ہے۔ رسول اللہؐ کے زمانے میں یہ ذکر بھی اس طرح نہیں ہوتا تھا بلکہ اصحاب رسولؐ چلتے پھرتے ہر وقت دل میں کلمہ پڑھتے رہتے تھے۔ غایت اس ذکر کی یہ ہے کہ قلب جاگ اٹھے، اس میں حرارت اور سوز و گداز پیدا ہو اور نفی اثبات کی مشق سے دماغ آئندہ فنا و بقا کی کیفیات کو محسوس کرنے کے لیے تیار ہو جائے۔

اس ذکر کے بعد ذاکر کو چاہیئے کہ تین مرتبہ سورۂ الحمد معنی سمجھ کر پڑھے اور اس کے بعد مادری زبان میں کوئی مناجات یا نعت اپنے ذوق کے مطابق پوری یکسوئی سے پڑھے، اس کے بعد کم از کم ایک تسبیح درود شریف کی پڑھ کر اپنے فائز المراد ہونے کی دعا کرے، پھر اپنے ماں باپ، عزیز و اقارب، پیر بھائیوں اور مرشد کے لیے دعائے خیر کرے، پھر **سُبْحَانَ اللّٰہِ وَبِحَمْدِہٖ** کہتا ہوا کھڑا ہو جائے۔

۳۔ نماز:

نماز پنج وقتہ جماعت سے پڑھنی چاہیئے۔ اگر ملازمت و روزگار کے حالات کی وجہ سے یہ ممکن نہ ہو تو پھر تنہا ہی پڑھ لو، قضا نہ کرنی چاہیئے۔ نماز ایسی ہو کہ نیت باندھنے سے سلام پھیرنے تک برابر اللہ ہی یاد رہے۔ یہ حالت صرف ان لوگوں کو میسر آسکتی ہے جو چوبیس گھنٹے اللہ کو یاد رکھتے ہیں، اس کے سوا ممکن نہیں۔ یادِ خدا کے انتہائی مدارج یہ ہیں کہ انسان کو اللہ کی موجودگی کا احساس ہونے لگتا ہے، اسی کو حضوری کہتے ہیں۔ اس حضوری میں بھی ترقی

ہوتی رہتی ہے اور جو کیف و سرور اور لطف اس نماز میں حاصل ہوتا ہے بیان نہیں کیا جا سکتا۔ اسی نماز کے لیے سرورِ کائناتؐ نے فرمایا ''لَا صَلٰوۃَ اِلَّا بِحُضُوْرِ الْقَلْبِ'' اور اسی نماز کے لیے اللہ نے ارشاد کیا ہے ''اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِی'' کہ نماز کو میری یاد کے لیے قائم کرو۔ پنج وقتہ نماز کے علاوہ تہجد کے نوافل پڑھنے بھی بہت مفید ہوتے ہیں۔ حدیث میں ہے کہ اللہ اپنے بندوں سے نوافل میں ملتا ہے، اسی کو قُربِ نوافل کہا گیا ہے۔ جو سالک جلدی راستہ طے کرنا چاہتے ہیں ان کو تہجد ضرور پڑھنا چاہیے۔

۴۔ تلاوت:

بہتر تو یہی ہے کہ تلاوت فجر کی نماز کے بعد کی جائے۔ یہ ممکن نہ ہو تو پھر جب بھی وقت ملے کم از کم پاؤ سیپارے کی تلاوت ضرور کرنی چاہیے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ باآواز بلند نہایت خوش الحانی سے قرآن پڑھو اور معنی و مطلب کی طرف مطلق دھیان نہ دو، صرف الفاظ کی ترتیل کا خیال رکھو اور تصوّر یہ کرو کہ تم جو آواز سن رہے ہو اللہ کی آواز ہے، وہ خود اپنا کلام پڑھ رہا ہے اور تم سن رہے ہو۔ جب تلاوت ختم ہو جائے تو اسی کو معنی اور مطلب سمجھ کر آہستہ آہستہ پڑھو۔ ایک نوٹ بک پاس رکھو جو مفید مطلب بات نظر آئے، اسے لکھ لو اور اس پر عمل کرو۔

ذکر کا بیان ختم ہوا، اب مجاہدے کا بیان کیا جاتا ہے جس میں قطع ماسویٰ اللہ اور تسلیم و رضا کی مشق کرنی پڑتی ہے، اس کے بغیر ذکر سے زیادہ فائدہ نہیں ہوتا۔

۵۔ قطع ماسویٰ اللہ:

اس کا مطلب یہ ہے کہ دُنیا کی تمام چیزوں سے دلی تعلق توڑ کر صرف اللہ سے رِشتہ جوڑ لیا جائے جیسا کہ سورہ مزّمّل میں اللہ تعالیٰ نے رسول اکرمؐ سے خطاب کیا ہے کہ

وَتَبَتَّلْ اِلَیْهِ تَبْتِیْلاً (یعنی ''سب کو چھوڑ کر صرف اللہ کا ہو جا'')

قوم کی بدبختی سے اس کے معنی بھی کئی صدیوں سے یہ لیے جاتے ہیں کہ دُنیا کو چھوڑ کر جنگلوں، پہاڑوں، غاروں، تکیوں اور خانقاہوں میں بیٹھ جاؤ اور دُنیا کے تمام کاروبار چھوڑ دو۔ یہی چیز رُہبانیت ہے جس کو رسول کریمؐ نے ''لَا رُهْبَانِيَّةَ فِي الْإِسْلَامِ'' کہہ کر منع فرمایا ہے۔ اسلامی حکمت تو یہ ہے کہ نوکری، مزدوری تجارت، زراعت جس طرح بھی ہو دُنیا کماؤ، شادی کرو، بچوں اور بیوی کے حقوق ادا کرو، تمام حقوق العباد کو بوجہ احسن پورا کرو اور سلوک بھی طے کرو۔ ظاہر ہے کہ یہ طریقہ رُہبانیت سے مشکل لیکن زیادہ افضل ہے۔ جو آدمی علائق دنیوی سے آزاد ہو کر اگر عمر بھر جنگلوں میں بیٹھا اللہ اللہ کرتا رہے تو اس نے کیا خاک کمال کیا۔ کمال تو یہ ہے کہ ہر ہر قدم پر دنیاوی کاروبار، تعلقات، محبت، فرائض اور تفکّرات اس کا راستہ روکیں اور سب کو ٹھکرا کر ہر ہر قدم پر اللہ سے زیادہ نزدیک ہوتا چلا جائے۔ کیا تم نہیں جانتے کہ طاقت ہمیشہ رکاوٹ کا مقابلہ کرنے سے پیدا ہوتی ہے، بیٹھے بیٹھے پیدا نہیں ہو جاتی۔

قطع ماسویٰ اللہ کے حصول کا طریقہ یہ ہے کہ روزانہ زندگی میں جو واقعات پیش آئیں مثلاً کوئی خوشی، غم یا فکر، ان کا اثر دل پر ہرگز قائم نہ ہونے دو، اس اثر کو نفی کر کے پھر اللہ کا خیال قائم کر لو۔ غایت اس کی بھی یہی ہے کہ دل میں سوائے اللہ کے اور کسی کی یاد باقی نہ رہے اور حوادثِ زمانہ تمہارے راستہ کی رکاوٹ نہ بن سکیں۔ دراصل یہ بہت بڑا کردارِ انسانی ہے کہ جب تم کسی چیز کو حاصل کرنے پر تُل جاؤ تو کوئی رکاوٹ تمہارا دامن نہ پکڑ سکے۔ خواہ وہ روٹی کا فکر ہو یا بیوی بچوں اور عزیز واقارب کی محبت یا کسی کی موت اور جدائی کا صدمہ۔ اس پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ جس دل میں خوشی، محبت اور غم کے احساسات ہی باقی نہ رہیں وہ دل تو کیا پتھر کا ٹکڑا ہوا۔ ایسا قسیُّ القلب انسان حقوق العباد کیوں کر ادا کر سکتا ہے اور

معاشرہ کے لیے کس طرح مفید ہو سکتا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ مشق صرف دَورانِ سلوک میں کرائی جاتی ہے، اس میں احساسات کا ''مٹانا'' مقصود نہیں ہوتا ہے بلکہ مغلوب کرنا مقصود ہوتا ہے۔ قدرتی جذبات اور احساسات فنا نہیں ہوا کرتے مگر ان پر قابو حاصل ہو جاتا ہے۔ جو لوگ احساسات اور جذبات پر قابو حاصل کر لیتے ہیں، انہی کو یہ قوّت حاصل ہوتی ہے کہ ماحول سے متاثّر ہوئے بغیر اپنے کام میں لگے رہتے ہیں اور اپنا مقصد حاصل کیے بغیر دم نہیں لیتے۔ بڑا آدمی اور کام کا آدمی بننے کے لیے یہ صفت بہت ہی ضروری ہے۔ قطع ماسویٰ میں اس سے بھی بہت مدد ملتی ہے کہ تم دوسروں کے افعال و اعمال سے قطعاً کوئی سروکار نہ رکھو کہ کوئی کیا کرتا ہے اور کیوں کرتا ہے، یعنی دوسروں کے اعمال کی جستجو نہ کرو، نہ کسی کی غیبت کرو، اپنے کام سے کام رکھو۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَلَا تَجَسَّسُوا وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُم بَعْضًا (الحُجُرات ۱۲)

٦۔ تسلیم و رضا:

تسلیم و رضا یہ ہے کہ جو واقعات تم کو اپنی مرضی کے خلاف پیش آئیں ان کو مِن جانب اللہ سمجھو اور ان پر صرف صبر ہی نہ کرو بلکہ خوشی سے برداشت کرو۔ یہ بات بہت مشکل ہے لیکن مشق کرنے سے اس کی بھی عادت پڑ جاتی ہے۔ غرض و غایت اس کی یہ ہے کہ آلام و تفکّرات تمہارے قوائے عمل کو مفلوج نہ کر سکیں اور ہمیشہ خوش رہنے کی عادت پڑ جائے۔ جو انسان خوش رہتا ہے، اپنے کاموں کو زیادہ جوش اور خوش اسلوبی سے انجام دے سکتا ہے اور ہمیشہ کامیاب ہوتا ہے۔ فکر اور رنج کی حالت میں جو کام کیا جاتا ہے، کبھی اچھی طرح انجام نہیں پا سکتا۔ یاد رکھو کہ بہت سی باتوں کو تم اپنے لیے اچھا اور مفید سمجھتے ہو لیکن اللہ ان کو تمہارے لیے مفید نہیں سمجھتا۔

آج کل تسلیم و رضا کے یہ معنی لیے جاتے ہیں کہ کام کاج نہ کرو، ہاتھ پاؤں توڑ کر گھر میں بیٹھے رہو، یہ غلط ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ''انسان کے لیے سوائے سعی اور کوشش کے اور کچھ نہیں ہے'' اِس لیے کوشش اور عمل سے کسی حالت میں دست بردار نہیں ہونا چاہئے۔ ہر قوم کی زبان میں کچھ ایسے الفاظ ہوتے ہیں جو اس کی ترقی کے لیے جادو کا کام دیتے ہیں، لیکن جب وہ قوم گرتی ہے تو ان الفاظ کا مفہوم بالکل الٹا سمجھنے لگتی ہے۔ یہی حال آج کل ہمارا ہے، تسلیم و رضا کی تعلیم سے یہ مقصود تھا کہ تمہیں اپنے عزائم میں کتنی ہی ناکامی ہو، مایوس ہو کر عمل نہ چھوڑو اور ہمیشہ خوش رہو۔ اسی طرح لفظ ''صبر'' اور ''توکّل'' ہے، صبر کے معنی انتہائی قوّتِ برداشت سے کام لینے کے ہیں، کتنا ہی مشکل کام ہو اس کی صعوبتوں کو خاطر میں نہ لا کر برابر کام کیے جانے کو ''صبر'' کہتے ہیں۔ اسی طرح توکّل ہے کہ کتنا ہی مشکل اور ناممکن کام ہو اللہ پر بھروسا کر کے اس پر عمل شروع کر دو۔ پہاڑوں کی دشوار گزار چوٹیوں پر چڑھ جاؤ، سمندروں کی لاانتہا گہرائیوں میں اتر جاؤ اور خدا پر بھروسا رکھو کہ تم ضرور کامیاب ہوگے۔ توکّل کے معنی بھروسا کے ہیں، کتنا ہی مشکل مرحلہ ہو لیکن اگر کوئی شخص اللہ کی قدرت اور اس کی مدد پر یقینِ کامل رکھتا ہے تو اس کی قوّتِ عمل ہزار گنا بڑھ جاتی ہے۔ وہ نہ سُستی کرتا ہے، نہ تھکتا ہے، نہ ہراساں ہوتا ہے، برابر کام میں لگا رہتا ہے حتیٰ کہ کامیاب ہو جاتا ہے۔ یہ سب تعلیمِ قرآن کی ہے لیکن اغیار اس پر عمل کر کے کامیاب ہو رہے ہیں اور ہماری قوم تمام ایسے الفاظ کے الٹے معنی سمجھ کر تباہی کے غار میں گرتی چلی جا رہی ہے۔ تسلیم و رضا، صبر و توکّل سبھی کے یہ معنی ہیں کہ عمل کرتے ہوئے ان پر کاربند رہو۔ مگر ہمارے ہاں آج کل سب کا یہ مطلب ہے کہ کام مت کرو، گھر میں بیکار صبر کیے پڑے رہو اور اللہ پر بھروسا رکھو کہ وہ تمہارا رزق وہیں پہنچا دے گا، خواہ وہ بھیک اور خیرات ہی کیوں نہ ہو۔ استغفر اللہ۔ کیا یہ

ہماری قومی تباہی کا ایک بڑا سبب نہیں ہے؟

اوپر نمبر ۶ اور ۷ میں جو کچھ بیان ہوا وہ مجاہدہ ہے۔ پہلے زمانہ میں مجاہدہ یہ تھا کہ شیخ اپنے مریدوں سے بارہ بارہ سال تک سقّہ اور بھنگی وغیرہ کا کام کراتے تھے، بھیک منگواتے تھے، سفر کراتے تھے۔ آج کل یہ باتیں بتائی جائیں تو ایک آدمی بھی ''حکمت'' سیکھنے کے لیے تیار نہ ہو۔ اِس لیے ہم نے مجاہدہ کے یہ دو طریق مقرّر کیے ہیں، جو دیکھنے میں بہت آسان معلوم ہوتے ہیں لیکن دراصل کافی مشکل ہیں۔ مقصود ان کا بھی یہی ہے کہ سالک میں انتہائی قوّت برداشت اور طبیعت و جذبات اور خواہشات پر قابو پیدا ہو جائے وہ ہمیشہ خوش رہے اور کبھی مایوس نہ ہو۔ یہ صفتیں اعلیٰ انسانی کردار میں انمول جواہرات کی حیثیت رکھتی ہیں۔ جس سالک کا کردار اعلیٰ نہ ہو، صرف روحانی قوّت کا مالک ہو، وہ صاحبِ ارشاد اور مصلح ہونے کی اہلیت نہیں رکھتا۔ صرف یہ کر سکتا ہے کہ عوام کو کشف و کرامات کے تماشے دکھاتا اور اللہ سے غافل کر کے پیر پرستی سکھاتا رہے۔

تسلیم و رضا کے معنی بعض آدمی یہ بھی سمجھتے ہیں کہ خواہشات کو بالکل نفی کر دیا جائے، یہ ریاضت بہت عام ہے لیکن کسی طرح بھی درست اور مفید نہیں۔ یہ فلسفہ بدھ کی تعلیم اور گیتا کا ہے۔ گو دونوں میں یہ کہا گیا ہے کہ فرائض دنیاوی پوری طرح ادا کرتے ہوئے ترکِ خواہشات کرو لیکن عملاً یہ بات بھی مُضر ہوتی ہے۔ جو لوگ اوتاریت اور رہبانیت کے معتقد ہیں، ممکن ہے ان کو یہ مُضر معلوم نہ ہوتا ہو، لیکن جو لوگ ایک اللہ کو مانتے ہیں وہ تو اسے نہایت ہی نقصان رساں پائیں گے۔ بات یہ ہے کہ متواتر مشق کرنے سے جب خواہشات بالکل ہی مر جاتی ہیں، تو ایسے آدمی کو نہ کوئی خوف رہتا ہے نہ توقع، یہاں تک کہ اس کو نہ دوزخ کا ڈر رہتا ہے نہ جنت کی پرواہ۔ ظاہر ہے کہ ایمان خوف و رجا کے درمیان ہے۔ ہمارا

تعلق اللہ سے اسی وقت تک ہے جب تک کہ ہم اپنی مصیبتوں اور تکلیفوں کو دُور کرنے اور اپنی بہتری اور بہبودی حاصل کرنے کے لیے اللہ سے دعائیں اور التجائیں کرتے رہیں یا مرنے کے بعد دوزخ کے خوف اور جنت کی امید میں اللہ کی رحمت سے لَو لگائے رہیں۔ جس آدمی کے لیے ان باتوں میں سے کوئی سی بات بھی باقی نہ رہے، اس کو اللہ کی کیا پرواہ اور اللہ سے کیا تعلق رہ سکتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اللہ سے بے نیاز ہوجاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ چیز نجات کا باعث نہیں ہوسکتی بلکہ کفروالحاد کا سبب بن سکتی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ دل میں خواہش کا ہونا ایک بڑا مستحسن اور تمدنی ترقی کا واحد سبب ہے۔ جس آدمی کے دل میں کوئی بھی خواہش نہ رہے گی وہ پتھر کا بت بن کر رہ جائے گا اور اگر پوری قوم کے دل سے خواہش معدوم ہوجائے تو وہ ساری قوم ہی تباہ ہوکر رہ جائے گی۔ اِس لیے خواہشات کا بالکل نفی کرنا کسی طرح بھی مفید نہیں، لیکن کوئی سالک خواہشات کو نفی کرنا ہی چاہے تو اسے چاہئے کہ دل میں اللہ کی ملاقات کی خواہش جس قدر بھی زیادہ ممکن ہو پیدا کرے اور اس کو بڑھاتا رہے، ورنہ نتیجہ خراب نکلے گا۔ اب ہم تزکیہء اخلاق کے دواُصول بیان کرتے ہیں۔

۷۔ غصّہ اور نفرت کی نفی:

غصّہ ایک طبعی اور نہایت شریف جذبہ ہے۔ جس میں غصّہ نہ ہو بے شرم اور بے غیرت ہوتا ہے۔ ایسا آدمی دشمنوں کے مقابلے میں نہ اپنے جان و مال کی حفاظت کرسکتا ہے نہ اپنے دین و مذہب کو بچانے کے لیے اس کی رگِ حمیّت جوش میں آسکتی ہے۔ لیکن یہی غصّہ جب ضرورت سے زیادہ بڑھ جائے اور عقل وحواس پر غالب آجائے تو اس سے زیادہ کمینہ اور نقصان دہ کوئی صفت نہیں۔ انسان کی ساری شرافت اور بزرگی عقل کی وجہ سے ہے، جب عقل ہی غائب ہوجائے تو آدمی بہائم سے بھی بدتر ہوجاتا ہے۔ اِس لیے ضروری ہے کہ

غصّہ کو مدبّر کر کے قابو میں رکھنے کی تدبیر کی جائے۔عوام کے لیے یہ ناممکن ہے،خواص البتہ ایک تدبیر جانتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ غصّہ بالکل ہی نفی کر دیا جائے،یعنی خواہ کتنی ہی غصّہ کی بات ہو غصّہ کو روکنے کی پوری کوشش کی جائے۔اس طرح دَورانِ سلوک میں غصّہ بالکل جاتا رہے گا،لیکن تکمیلِ سلوک کے بعد چونکہ وہ ایک طبعی صفت ہے،پھر اُبھر آئے گا لیکن اب وہ قابو میں ہوگا،یعنی یہ بات عارف کے اختیار میں ہوگی کہ جب ضرورت ہو غصّہ کرے اور جتنا ضروری ہو اتنا ہی غصّہ کرے،اس طرح غصّہ سے سوائے فائدے کے نقصان کوئی نہ پہنچے گا۔جس شخص کو غصّہ اور دوسرے جذبات پر اس قدر قابو حاصل ہو،کیا کوئی بڑے سے بڑا ماہر نفسیات اس کی بے پناہ قوّتِ ارادی کا اندازہ لگا سکتا ہے؟ یہاں ہم حضرت علیؓ کا وہ واقعہ یاد دلاتے ہیں جب آپ نے جہاد میں ایک یہودی کو مغلوب کر کے اُس کے قتل کا ارادہ کیا اور اُس نے آپ کے منہ پر تھوک دیا تو اس پر آپ فوراً اس کی چھاتی پر سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور ارادۂ قتل ترک کر دیا۔ یہودی نے حیران ہو کر وجہ پوچھی تو آپ نے فرمایا "پہلے میں محض خدا کے لیے تجھے قتل کرنا چاہتا تھا لیکن جب تو نے میرے مُنہ پر تھوکا تو مجھے بُرا لگا۔ اب اگر میں تجھ کو قتل کر دیتا تو یہ قتل خالص اللہ کے واسطے نہ ہوتا کیونکہ اب اس میں ذاتی انتقام کا جذبہ بھی شریک ہوتا"۔

ملاحظہ فرمایا آپ نے حضرت علیؓ کو اس پر غصّہ تو یقیناً آیا لیکن اس وقت غصّہ میں قتل کرنا حق نہ تھا اس واسطے ایسے نازک موقع پر بھی حضرت علیؓ نے غصّہ پر فوراً قابو پا لیا۔

غصّہ کو نفی کرنے کی تدبیر یہ ہے کہ دن اور رات میں کسی کسی وقت یہ خیال کر لیا کرو کہ غصّہ کو نفی کرنا ہے۔اس طرح جب کسی بات پر غصّہ آنے لگے تو یاد آجائے گا کہ میں نے اپنے مرشد کے ہاتھ پر اللہ سے غصّہ کو نفی کرنے کا عہد کیا ہے، یہ بات یاد آتے ہی غصّہ

کافور ہو جائے گا۔ اگر یہ تدبیر کارگر نہ ہو تو لاحول پڑھو اور اس جگہ سے ہٹ کر دُور چلے جاؤ، ٹھنڈا پانی پیو اور تنہائی میں لیٹ کر افسوس کرو کہ غصّہ کیوں آیا۔ اس طرح بھی کامیابی نہ ہو اور کبھی غصّہ آ ہی جائے اور لڑائی جھگڑا ہو جائے تو بعد میں جب سکون ہو، اپنی حرکتوں پر نادم ہو اور سوچو کہ میں تو اہلِ سلوک سے ہوں، میں نے تو غصّہ کو نفی کرنے کا عہد کیا تھا وہ عہد توڑ ڈالا ہے۔ یہ سوچتے ہوئے فوراً اُٹھو وضو کرو، دو نفل نماز توبہ کی نیت سے پڑھو، استغفار کی تسبیح بعد نماز پوری کرو اور آئندہ پھر عہد کرو کہ غصّہ نہ کروں گا۔ اس طرح انشاء اللہ ضرور کامیابی ہوگی۔ یوں بھی نہ ہو تو مرشد سے رجوع کرو۔

نفرت:

یہی حال نفرت کا ہے، لیکن نفرت طبعی صفت نہیں ہے۔ دراصل پسندیدگی اور ناپسندیدگی طبعی صفات ہیں۔ اگر یہ دونوں صفات انسان میں نہ ہوں تو نیک باتوں کو پسند کر کے اختیار نہ کرے اور بُری باتوں سے باز نہ رہ سکے۔ نفرت اسی ناپسندیدگی کی انتہائی حالت ہے۔ غصّہ تو اکثر حالات میں ضروری بھی ہے مثلاً دفاع، عزت وناموس اور جہاد میں، لیکن نفرت تو کسی حالت میں بھی فائدہ بخش نہیں۔ نفرت کی کیفیت یہ ہے کہ دل جلتا ہے، خون کھولتا ہے، آدمی جس سے نفرت کرتا ہے اِس کو ذلیل سمجھتا ہے۔ پھر یہی نفرت اِس کو دشمنی اور ایذا رسانی پر آمادہ کر دیتی ہے اور وہ ایسی ایسی حرکتیں کر گزرتا ہے جو شرافت کے خلاف ہوتی ہیں اور وہ اگر کوئی ایسی حرکت نہ بھی کرے صرف دل میں جلتا بُھنتا رہے تو یہی کیا کم ہے۔ اس سے دماغ پریشان ہوتا ہے، سکون قلب مفقود ہو جاتا ہے اور جس سے وہ نفرت کرتا ہے اس کا کچھ بھی نہیں بگڑتا۔ نفرت ان چیزوں پر آتی ہے:۔ بُری شکل وصورت، بُری وضع قطع، بُری حرکات وعادات، بُرے افعال، گندی اور ناپاک اشیاء وغیرہ۔ جہاں تک بُری شکل و

صورت کا تعلق ہے، تم کو سوچنا چاہیئے کہ وہ تو اللہ کی بنائی ہوئی ہے اس سے نفرت کرنا تو خود اللہ کے فعل اور صنّاعی سے نفرت کرنا ہے۔ اگر کسی کے افعال وحرکات سے نفرت ہو تو یہ سوچو کہ وہ آدمی اپنے افعال کا خود ذمہ دار ہے مرنے کے بعد ان افعال کی بابت اُسی سے پوچھا جائے گا، مجھ سے سوال نہ ہوگا میں اپنے دل کو خواہ مخواہ کیوں جلاؤں، اس طرح خاطر خواہ کامیابی ہوگی۔ اس پر اعتراض یہ ہوتا ہے کہ کیا ہم بُرے اور قبیح کاموں سے بھی نفرت نہ کریں؟ تو جواب یہ ہے: جب آپ سلوک کے قواعد پر عمل کر رہے ہیں تو آپ کو واقعی بُرے کاموں سے ناپسندیدگی کا جذبہ تو رکھنا چاہیئے لیکن جذبۂ نفرت کسی طرح بھی مفید نہیں ہوتا بلکہ تصفیۂ قلب میں رکاوٹ ڈالتا ہے، کیونکہ اس سے دل جلتا رہتا ہے۔ جس کی نفی ممکن نہیں ہوتی۔ کر کے دیکھنے سے آپ کی سمجھ میں آجائے گا کہ نفرت اور ناپسندیدگی میں کیا فرق ہے۔ مقصود دونوں کا ایک ہی ہے لیکن جذبۂ نفرت جس دل میں ہوتا ہے وہ خدا کی طرف رجوع نہیں ہوسکتا۔

غصّہ اور نفرت سے اور بہت سی بُری عادتیں بھی پیدا ہوتی ہیں مثلاً غرور، تکبر، بغض و حسد، کینہ، تجسس، عیب جوئی، نکتہ چینی، پھکّڑ پن، دوسروں کا مذاق اڑانا، بدبینی، بدگوئی، بدخواہی، غیبت، چغلی، دشمنی، ایذا رسائی، دل شکنی اور قتل وغیرہ۔ اور ان دو باتوں کو نفی کر دینے سے انسان تمام متذکرہ بُرائیوں سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ سب سے اچھی بات یہ ہے کہ تم صرف خوبیوں پر نظر رکھو۔ بُرائیوں کو دیکھو ہی نہیں۔ انسان کے حواس جس چیز کے مطالعہ میں منہمک رہتے ہیں وہی رنگ اس انسان کے کردار میں پیدا ہو جاتا ہے۔ پولیس والوں کا اخلاق عام طور پر اسی لیے گندہ ہوتا ہے کہ وہ ہمیشہ انسان کی بُرائیوں کے متلاشی رہتے ہیں۔ جو کوئی کوئلہ کے گودام میں کام کرے گا، اس کے کپڑے اور مُنہ ضرور کالا ہو جائے گا۔

۸۔ عالمگیر محبت اور صداقت:

محبت کے جذبہ کی جتنی بھی تعریف کی جائے بہت کم ہے۔ محبت کا جذبہ ہی تخلیقِ عالم کا اصل سبب ہے۔ دُنیا کی تمام خوبیاں، زینتیں، رونق، زیبائش و آرائش محبت ہی کی وجہ سے ہے۔ ہر نوع کی مادّہ جو اپنے بچوں کو پرورش کرتی ہے محبت ہی کے جذبہ سے کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی شان ربوبیت خالصتاً محبت ہی ہے، عورت اسی شان ربوبیت کا مثالی مظہر ہے، خالق اپنی مخلوق سے جتنی محبت کرتا ہے کوئی ماں اپنے بچوں سے بھی اتنی محبت نہیں کرتی۔ اِس لیے سالک کو چاہئے کہ وہ بھی اللہ کی مخلوق سے محبت کرے۔ یہ ایک تعمیری جذبہ ہے اور دُنیا کی فلاح و بہبود اور تمدّن و تہذیب کی ترقی اسی جذبہ پر منحصر ہے۔

محبت پیدا کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ لوگوں کی صرف خوبیوں کو دیکھو اُن کی بُرائیوں کو نہ دیکھو۔ یاد رکھو کہ انسان کمزوری اور خطا کا مرکب ہے، ہر شخص غلطیاں کرتا ہے، تم خود معصوم نہیں ہو، اِس لیے دوسروں کی غلطیوں اور خطاؤں پر ان کے ساتھ درشتی نہ کرو بلکہ عفو و کرم سے پیش آؤ اور یقین رکھو کہ اگر تم اللہ کی مخلوق کے ساتھ عفو و کرم سے پیش آؤ گے تو اللہ بھی تمہارے ساتھ عفو و کرم سے ہی پیش آئے گا۔ محبت پیدا کرنے کی دوسری ترکیب یہ ہے کہ دل کو غصّہ اور نفرت کے جذبات سے پاک رکھو اور لوگوں پر احسان کیا کرو اور جو کوئی تم پر احسان کرے تم اس کو خوشی سے قبول کرو اور اس کا شکریہ ادا کرو اور احسان کا بدلہ احسان سے دو۔ احسان کے معنی محض نیکی کرنے کے ہیں لیکن آج کل اس کو گالی سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ زبان میں بے شمار ایسے فقرے پیدا ہو گئے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ احسان کوئی بہت ہی بُری چیز ہے میری جوتی اس کا احسان اٹھاتی ہے، میں تیرے باپ کا احسان مند نہیں ہوں وغیرہ۔ یہ نہایت ہی غیر اسلامی خیالات ہیں۔ اگر احسان اٹھانا بُرا ہوتا تو قرآن میں

احسان کرنے اور احسان کا بدلہ احسان سے دینے کا حکم کیوں دیا جاتا۔ احسان سے جماعت میں رابطہ اور اتّحاد پیدا ہوتا ہے تعمیرِ ملّت کے لیے احسان بہت ضروری ہے۔

یہاں ایک خیال یہ پیدا ہوسکتا ہے کہ ایک طرف تو آپ کہتے ہیں کہ صرف اللہ سے قلبی تعلق اور محبت رکھو، دوسری طرف تمام مخلوق سے محبت کرنے کی ہدایت کرتے ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ مخلوق سے محبت کرو صرف اِس لیے کہ وہ اللہ کی نشانی اور اللہ کی محبوب ہے۔ اس طرح تم جس قدر محبت مخلوق سے کرو گے اللہ تعالیٰ کی محبت بڑھتی جائے گی اور جن ہستیوں سے اللہ بہت زیادہ محبت کرتا ہے تم کو بھی ان سے نسبتاً اُسی قدر محبت زیادہ ہوجائے گی۔ غایت اس کی یہ ہے کہ تمہارے دل میں خالص محبت کا جذبہ سمندر کی طرح جوش مارنے لگے۔

صداقت:

صداقت کہنے کو ایک چھوٹا سا لفظ ہے لیکن انسان کے تمام اقوال و افعال اور حرکات و سکنات پر حاوی ہے۔ لوگ صداقت کے معنی صرف سچ بولنے کو سمجھتے ہیں، یہ بات نہیں ہے ہاتھ، پاؤں، آنکھ، کان، دل، سب ہی کی صداقت ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ سورہ بنی اسرائیل میں فرماتا ہے کہ ”کان آنکھ اور دل سبھی کی پوچھ ہوگی“ یہاں ہر ایک کے افعال الگ الگ لکھنے کی گنجائش نہیں، صرف یہ بتا دینا کافی ہے کہ ہر عضو کے افعال کا اوامرِ الٰہی کے مطابق ہونا ہی صداقت ہے۔

صداقت اس قدر ضروری ہے کہ اگر کبھی محبت اور صداقت کا مقابلہ آن پڑے تو صداقت پر عمل کرنا اور محبت کو قربان کردینا چاہیے ورنہ تمام نظام درہم برہم ہوجائے گا، مثلاً اگر تم جج یا مجسٹریٹ ہو اور تمہارا اپنا بیٹا ملزم کی حیثیت سے تمہارے سامنے آئے اور تمہاری تحقیق کے

مطابق وہ واقعی مجرم ہو تو محبت کی وجہ سے اس کو رہا اور بری کر دینا ہرگز جائز نہیں بلکہ صداقت کی بناء پر پوری سزا دینا تمہارا فرض ہے۔اس بارے میں حضرت عمرؓ کی مثال یاد رکھو کہ کس طرح انہوں نے اپنے لختِ جگر کو دُرّے لگوائے اور جب وہ مر گئے تو بیس دُرّے ان کے مردہ جسم پر پورے کیے اور پھر لاش کو گلے لگا کر روئے اور پیار کیا اور کہا بیٹا یہ میں نے اِس لیے کیا ہے کہ تو اللہ تعالیٰ کے سامنے پاک وصاف جائے اور وہاں جواب دہ نہ ہو۔

اب تفکّر کا بیان سنئے ،لیکن پہلے یہ بتا دینا ضروری ہے کہ جب تک اوپر بتائی ہوئی آٹھ باتوں میں کافی دستگاہ نہ ہو جائے تفکّر شروع نہ کیا جائے ورنہ عام حالتوں میں بجائے فائدے کے نقصان ہوتا ہے۔ ہاں شیخ کامِل کسی خاص طالب میں یہ استعداد دیکھے تو کسی خاص منزل سے بھی شروع کرا سکتا ہے۔

۹۔تفکّر :

اللہ نے قرآن میں جا بجا حکم دیا ہے کہ ہماری آیات پر غور کرو۔آیات سے مُراد کہیں تو قرآن کی آیات وعبارت ہی ہے لیکن زیادہ تر زمین و آسمان میں قدرت کی نشانیاں مقصود ہیں۔اس حکم پر اتنا زور دیا گیا ہے کہ عبادت کے احکام پر بھی نہیں دیا گیا۔عبادت کے متعلق تقریباً ایک سو پچاس آیات ہیں لیکن مطالعہُ کائنات کے متعلق چھ سو سے زیادہ آیات ہیں۔ اس مطالعہ اور غور و فکر سے یہ مطلب نہیں کہ بس بیٹھے ہوئے آنکھ بند کر کے سوچتے رہو اور جب دماغ تھک جائے تو سوچنا چھوڑ دو، بلکہ مقصد یہ ہے کہ اشیائے کائنات کی ہیئت ترکیبی اور خواص کا علم حاصل کرو اور ان قوانینِ فطرت کا مطالعہ کرو جن کی بدولت کائنات کا یہ نظام قائم ہے اور جو علم اس طرح حاصل ہو اس سے خود فائدہ اٹھاؤ اور نوعِ انسان کو فائدہ پہنچاؤ۔قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ اختلاف لیل ونہار پر غور کرو،اس کا مطلب یہ ہے کہ تم یہ

معلوم کرنے کی کوشش کرو کہ دن رات کیوں ہوتے ہیں پھر چھوٹے بڑے کیوں ہو جاتے ہیں اور موسم کیوں بدلتے ہیں۔ اگر ہمارے علماء اس حکم خداوندی کی تعمیل کرتے تو وہ یہ معلوم کر لیتے کہ زمین گول ہے اور اپنے محور اور مدار پر گھومتی ہے۔ لیکن اس حکم پر انھوں نے نہیں بلکہ اغیار نے عمل کیا اور انھوں نے یہ باتیں معلوم کیں جن سے جغرافیہ اور علم ہئیت میں ایک بڑے مفید باب کا اضافہ ہوا، ان احکام میں ''حکمت'' یہ ہے کہ ایک تو تم قیامت تک عمل میں مصروف رہو گے جو قوموں کی زندگی کے لیے پہلی شرط ہے۔ دوسرے یہ کہ تمہاری قوم برابر ترقی کرتی رہے گی اور دوسری قوموں پر غالب رہے گی۔ ان احکام میں سے مثال کے طور پر یہاں صرف دو آیتیں بیان کی جاتی ہیں سورہ اعراف آیت ۱۸۵ میں ارشاد ہوتا ہے:

اَوَلَمْ يَنظُرُوْا فِىْ مَلَكُوتِ السَّمَاوَاتِ وَالاَرْضِ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَىْءٍ وَّاَنْ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ قَدِ اقْتَرَبَ اَجَلُهُمْ

''کیا یہ لوگ کائنات اور اس میں جو چیزیں اللہ نے پیدا کی ہیں ان پر غور نہیں کرتے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی موت قریب آ گئی ہے''

سورہ عنکبوت آیت ۲۰ میں حکم دیتے ہیں:

قُلْ سِيْرُوْا فِى الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ بَدَاَ الْخَلْقَ

''مسلمانوں سے کہو کہ وہ کرۂ زمین میں چل پھر کر دیکھیں کہ آفرینش کی ابتدا کیسے ہوئی۔''

ملاحظہ فرمایا آپ نے یہ آیتیں کس قدر واضح ہیں۔ پہلی آیت میں صاف صاف تنبیہہ ہے کہ جو قوم کائنات کی تخلیق پر غور یعنی قوانین فطرت کو معلوم کرنے کی کوشش نہیں کرے گی وہ

فنا ہو جائے گی، مٹ جائے گی۔ دوسری آیت میں تخلیق کائنات کا علم حاصل کرنے کے لیے کرۂ زمین پر تحقیق کی غرض سے سفر کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ الغرض کائنات کی چیزوں میں غور و فکر اور ان کی حقیقت و ماہیت معلوم کرنے کی کوشش کرنا مسلمانوں کے لیے اس قدر ضروری ہے کہ خود حضور سرورِ کائنات بھی اکثر یہ دعا فرمایا کرتے تھے:۔

اَللّٰهُمَّ اَرِنَا حَقَائِقَ کلَّ الْاَشْیَاءِ کَمَا هِیَ

یعنی ''اے اللہ ہمیں تمام اشیاء کی اصلی حقیقت سے آگاہ فرما'' اس حدیثِ پاک کا ایک ایک لفظ جواہرات سے زیادہ قیمتی ہے خصوصاً الفاظ ''ہمیں'' ''تمام'' اور ''اصلی'' خاص توجہ کے قابل ہیں، یعنی رسول پاکؐ حقائقِ اشیاء کا علم خود اپنے لیے ہی نہیں بلکہ امت کے ہر فرد کے لیے چاہتے تھے، سبحان اللہ کیا کرم ہے۔ ''تمام'' سے مقصود یہ ہے کہ کوئی چیز بھی کائنات میں ایسی باقی نہ رہ جائے جس کا علم کسی مسلمان کو نہ ہو۔ ''اصلی'' سے مقصد یہ ہے کہ حقیقت معلوم ہونے میں بال برابر شُبہ یا کسر نہ رہے۔ علاوہ ازیں حضور اکرمؐ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ

تَفَكُّرْ سَاعَةً خَيْرٌ مِّنْ عِبَادَةِ سِتِّيْنَ سَنَةً

یعنی ''ایک گھڑی کا تفکّر ساٹھ سال کی عبادت سے بہتر ہے'' ان آیات و احادیث کو پڑھنے کے بعد یقیناً ہر وہ مسلمان جس کے دل میں اللہ اور رسولؐ کی ذرا سی بھی عزّت و محبت ہے، شرم سے اپنا سر نیچا کرلے گا اور یہ سوال کرنے کی ہرگز جرأت نہیں کرے گا کہ ہمارے قومی زوال اور تباہی کی کیا وجوہات ہیں؟

حقیقت کائنات کی تخلیق کا نتیجہ کون کون سے علوم ہیں؟ کیا آپ انکار کرسکتے ہیں کہ وہ علوم طبیعات، علم طبقات الارض، علم الحیٰوۃ، علمِ نباتات، علمِ معدنیات، علم الحیوانات، فلکیات، علمِ ریاضی اور بے شمار دوسرے علوم ہیں جو آج کل یورپین اور امریکن اقوام کی واحد اجارہ

داری میں پَھل پُھول رہے ہیں اور انہی علوم کی برکت سے وہ قومیں متمدّن، مہذّب، خوش حال اور صاحبِ اقتدار ہیں اور............ہم؟

کچھ نہ پوچھ اے ہم نشین تو میری بابت کچھ نہ پوچھ

ہمارے ہاں تو ان علوم کا نام لینا بھی گناہ ہے، کونسے علوم کا............؟ انہی علوم کا جن کو حاصل کرنے کا حکم اللہ تعالیٰ نے دیا ہے اور جن کے حصول کے لیے رسول اللہؐ دعا فرمایا کرتے تھے۔ یہ ہے اللہ اور رسولؐ کے احکام پر ہمارا عمل، کیا اس معاملہ میں قرآن کی یہ آیت ہمارے اوپر صادق نہیں آتی جس میں فرمایا گیا ہے کہ ''کیا تم قرآن کی بعض باتوں کو تو مانتے ہو اور بعض کو نہیں مانتے، جو ایسا کرتا ہے اس کی سزا اس کے سوا کچھ نہیں کہ اس دُنیا میں اس کی رسوائی ہو اور آخرت میں ایسے لوگ سخت عذاب کی طرف پھیر دیئے جائیں گے'' (البقرہ) کیا اب بھی آپ کو شک ہے کہ آپ کی تباہی اور دُنیا میں رسوائی کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ آپ ماڈرن علوم حاصل نہ کر کے اللہ کی نافرمانی کرتے ہیں، جس چیز کی سزا میں یہ رسوائی ہو رہی ہے۔

اب ہم تمام مسلمانوں خصوصاً علمائے دین اور امرائے ملّت سے سوال کرتے ہیں کہ آپ ایمانداری سے اپنا محاسبہ کریں کہ آپ نے اللہ تبارک تعالیٰ کے احکام کی بجا آوری میں کہاں تک سعی کی ہے۔ نہیں کی تو کیا آپ کو کبھی خوف آتا ہے کہ مرنے کے بعد اس غفلت کے لیے آپ سے باز پُرس کی جائے گی۔ علمائے دین میں کون ہے جس نے یہ علوم یا ان میں سے کوئی سا علم حاصل کیا ہے؟ امرائے ملّت میں سے وہ کون ہے جس نے سکول، کالج، معمل (لیبارٹری) یا کوئی ادارہ ان علوم کے لیے کھولا ہے یا اس کے لیے کچھ روپیہ اللہ کے دیئے ہوئے روپے میں سے خرچ کیا ہے؟

اتنا بیان کر دینے کے بعد اب بتایا جاتا ہے کہ ''حکمت'' میں ''تفکّر'' صرف یہ نہیں ہے کہ چادر سے منہ ڈھانپ کر کشف القبور یا مکاشفۂ لطائفِ غیبی کا مراقبہ کر لیا اور بس، بلکہ تفکّر کی دو قسمیں ہیں: ایک تفکّر بالمشاہدہ، دوسری تفکّر بالمراقبہ، ان کا حال آگے بیان کیا جاتا ہے:

تفکّر بالمشاہدہ:

اس کے کئی طریقے ہیں:

پہلا طریقہ:۔ کائنات میں جتنی خوبصورت اور حسین چیزیں اللہ کی پیدا کی ہوئی ہیں مثلاً آسمان میں سورج، چاند، ستارے، شفق، بادل، بارش، قوسِ قزح اور زمین پر سمندر، دریا، چشمے آبشار، سبزہ، پھول، میوے، رنگ برنگے جانور، چرند پرند، طرح طرح کے خوبصورت پتھر، جواہرات اور دھاتیں وغیرہ، ان سب کو غور اور دلچسپی سے دیکھنے کی عادت ڈالو اور یہاں تک دیکھو کہ ان میں جو حسن، نزاکت اور دلکشی ہے اس کا احساس پیدا ہو جائے۔ جب یہ بات حاصل ہو جائے تو ان کے بنانے والے کا خیال کرو اور سوچو کہ وہ خود کتنا حسین اور صنّاع ہو گا۔ اس مشق کا حاصل یہ ہونا چاہئے کہ تمہیں قدرت کی ہر مخلوق میں حُسنِ مطلق کی جھلک نظر آنے لگے اور ساتھ ہی اللہ کی موجودگی کا احساس ذہن نشین ہوتا چلا جائے۔ یہ انہماک رفتہ رفتہ اس قدر بڑھ جائے گا کہ جس چیز کا نظّارہ کر رہے ہو خود اس کی موجودگی کا احساس فنا ہو جائے گا اور ایک ایسی ہستی کی موجودگی کا احساس پیدا ہو گا جو موجود تو ہے مگر دکھائی نہیں دیتی، یہی حضوری کی ابتدا ہے۔

اس مشق کو (پچھلے اعمال کے ساتھ ساتھ) اگر جاری رکھا جائے تو جس ہستی کا احساس پیدا ہوا تھا وہ نظر آنے لگے گی، یہ حضوری کا دوسرا درجہ ہے۔ کیا نظر آئے گا، اس کا بیان الفاظ میں نہیں ہو سکتا۔ یاد رکھو کہ یہ مشاہدہ ظاہری آنکھوں سے نہیں ہو گا، ایک ایسی حِس کے

ذریعے ہوگا جس کو بصارت کی روح کہنا چاہیئے اور جو آنکھ سے کہیں زیادہ دیکھتی ہے۔ آنکھ تو چیزوں کی صرف ظاہری سطح کو دیکھتی ہے، نہ ان کے اندر دیکھ سکتی ہے نہ ان کے پیچھے کی طرف۔ مگر یہ حِس جب بیدار ہو جاتی ہے تو چیزوں کے اندر باہر، اوپر نیچے، آگے پیچھے کی طرف دیکھتی ہے۔ یوں سمجھو کہ اللہ تعالیٰ نے جو فرمایا ہے کہ

اِنَّ اللّٰہ عَلٰی کُلِّ شَئیٍ مُّحِیطٌ. یا ھُوَ الۡاَوَّلُ وَالۡاٰخِرُ وَ الظَّاھِرُ وَالۡبَاطِنُ.

تو اس طریقۂ تفکّر سے ان آیات کا معنوی مشاہدہ ہوتا ہے، لیکن یہ مشاہدہ بھی ہر طالب کو اس کی اپنی روحانی استعداد کے مطابق ہوتا ہے۔ عینِ ذات کو تو جس طرح ہمارے سرکار دو عالم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مشاہدہ فرمایا ہے، نہ پہلے کسی نے دیکھا نہ آئندہ دیکھ سکے گا۔ اس جگہ یہ بیان کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ آیت

ھُوَ الۡاَوَّلُ وَالۡاٰخِرُ وَالظَّاھِرُ وَالۡبَاطِنُ. (الحدید:۳)

کی تشریح میں جب یہ کہا جاتا ہے کہ اللہ اس کائنات کے ذرّہ ذرّہ میں موجود ہے تو اکثر لوگوں کو جو صرف پڑھتے اور سنتے ہیں عملی طور پر کچھ نہیں کرتے، دو وسوسے پیدا ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس طرح حلول کا مسئلہ ٹھیک ہوا، دوسرے یہ کہ جب اللہ گندی چیزوں میں بھی ہے تو وہ ناپاک کیوں نہیں ہو جاتا۔ ان لوگوں کو معلوم ہونا چاہیئے کہ تمہارے اردگرد جو فضا اور خلاء ہے اور جس میں بظاہر کچھ بھی نظر نہیں آتا اس میں ان گنت چیزیں موجود ہیں۔ اوّل تو ہوا ہے جس کو تم جانتے ہو لیکن اور بھی بہت سی چیزیں ہیں مثلاً پانی کی نمی یا بھاپ، کئی قسم کی گیسیں، برق، ریڈیائی لہریں، ایتھر اور کئی قسم کی شعائیں۔ ان چیزوں کا پتہ تو سائنس نے لگا لیا ہے لیکن اور بھی بے شمار چیزیں ہیں جن کا پتہ ابھی سائنس نہیں لگا سکی مگر اہلِ حال اور بصیرت باطنی رکھنے والے جانتے ہیں مثلاً نفس، عقل، روح وغیرہ اور جنت و دوزخ جیسا

کہ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ''جنت زمین و آسمان کی وسعتوں میں پھیلی ہوئی ہے۔'' (آل عمران ۱۳۳)

اسی طرح اللہ ہے، کہ ہر جگہ موجود ہے۔ اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ سب چیزیں جو اس فضا اور خلا میں موجود ہیں، ان میں ہر ایک اپنا اپنا کام کرتی ہے اور کوئی چیز کسی دوسری چیز سے نہ مُتاثّر ہوتی ہے نہ اس کے کام میں رکاوٹ ڈالتی ہے، حتیٰ کہ ریڈیو کی لہریں جیسا کہ معلوم ہو چکا ہے ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سیکنڈ کی رفتار سے سفر کرتی ہیں اور کوئی مادّی شے بھی ان کے لیے رکاوٹ کا سبب نہیں ہوسکتی، جب مخلوقات کا یہ حال ہے تو خود خالق کا تو ذکر ہی کیا۔ وہ بذاتہ سب پاکوں کا پاک ہے، اُس پر کوئی شے اثر نہیں کرسکتی، ہر شے میں ہوتے ہوئے بھی ہر شے سے الگ ہے۔ یہاں ایک اور مثال پر غور کیجئے:۔ زمین پر گوبر اور گندگی کا ایک ڈھیر لگا ہوا ہے اور آفتابِ عالم تاب کی دھوپ اس پر پڑ رہی ہے اور دھوپ کی حرارت گندگی کے اندر کئی گز نیچے تک پہنچ رہی ہے۔ اب بتائیے کہ یہ دھوپ اور حرارت اس گندگی سے ناپاک ہو جائے گی یا خود اس کو پاک کر دے گی۔

بہرحال اس طریقہ تفکّر سے جو مشاہدہ ہوتا ہے اسے سیر ہی سمجھنا چاہئے کیونکہ جو کچھ دکھائی دیتا ہے اس کی معرفت حاصل نہیں ہوتی۔

دوسرا طریقہ:۔ جب پہلے طریقہ پر عمل کرنے سے تجلّیات وغیرہ کا مشاہدہ ہونے لگے تو اب تم اس تمام یونیورس یعنی کائنات کا تصوّر دماغ میں قائم کرو۔ یہ اس طرح ہوسکتا ہے کہ پہلے فلکیات پر چند ایسی کتابیں پڑھو جو موجودہ تحقیقات کے مطابق لکھی گئی ہیں۔ اس طرح تمہیں معلوم ہوگا کہ یہ سورج، چاند، سیّارے اور ستارے سب بڑے بڑے کُرّے ہیں جو اس فضا میں تیر رہے ہیں۔ ان کی تعداد، جسامتیں اور درمیانی فاصلے اتنے زیادہ ہیں کہ

انسانی شمار و حساب میں بھی نہیں آسکتے۔ اس طرح جب اس فضا کی وسعت و پہنائی کا کچھ تصوّر دماغ میں قائم ہوجائے تو رات کو جب ستارے جگمگا رہے ہوں کھلے آسمان کے نیچے لیٹ کر غور کیا کرو کہ تمہاری زمین جو ایک کُرّہ ہے اس کے چاروں طرف ایسا ہی آسمان جیسا کہ اوپر نظر آتا ہے لا انتہا فاصلوں تک پھیلا ہوا ہے۔ سوچو کہ آخر یہ سلسلہ ستاروں اور سیّاروں یعنی آفرنیش کا کہاں تک چلا گیا ہے۔ اگر تفکّر بالمشاہدہ کے پہلے طریقے سے تمہاری حِسِ فکر یہ تربیّت یافتہ ہو چکی ہے تو تم یونیورس کا زیادہ صحیح تصوّر قائم کرسکو گے اور دیکھو گے کہ پہلے آسمان سے آخری آسمان تک کس طرح آفرنیش کا سلسلہ قائم ہے۔ اس کے بعد یہ سوچنا شروع کرو کہ جہاں آفرنیش ختم ہوتی ہے اس سے آگے کیا ہے، تمہاری سمجھ میں آئے گا کہ آگے محض خلاء ہے۔ اب سوچو کہ یہ خلاء کہاں تک چلا گیا ہے اور اس کی انتہا کے بعد کیا ہے۔ یہاں تمہاری عقل عاجز اور تمہارا دماغ بیکار ہوجائے گا اور کچھ بھی سمجھ میں نہ آئے گا۔ اس ناقص تصوّر یا تفہم کو خوب پختہ کر کے یہیں چھوڑ دو۔

اب ایک ایٹم کی جسامت کا تصوّر دماغ میں بٹھانے کی کوشش کرو۔ ایٹم اس قدر چھوٹا ہے کہ ایک سوئی کی نوک پر لاتعداد ایٹم اکٹھے ہوسکتے ہیں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ایٹم پر دو ایک کتابیں پڑھو، جب یہ تصوّر قائم ہوجائے تو آگے چلو اور اقلیدس کے نقطے کا تصوّر کرو جس میں نہ لمبائی ہے نہ چوڑائی نہ گہرائی۔ نہ وہ سمتوں اور امتداد میں مقید ہے نہ اس کے ٹکڑے ہوسکتے ہیں۔ جب یہ تصوّر بھی قائم ہوجائے تو آیت

سُبۡحَانَ رَبِّکَ رَبِّ الۡعِزَّتِ عَمَّا یَصِفُوۡنَ (صافات ۱۸۰)

”تمہارا رب پاک ہے تمام صفتوں سے جو تم اس کی طرف منسوب کرتے ہو“

کے معنی دماغ میں رکھتے ہوئے یہ فکر کرو کہ ایک طرف تو اللہ اتنا بڑا ہے کہ تمام یونیورس

پر محیط ہے اور اس کے ذرّہ ذرّہ میں موجود ہے۔ دوسری طرف اقلیدسی نقطے سے بھی زیادہ چھوٹا ہے۔ جب یہ تصوّرات پختہ ہو جائیں گے تو سخت مشقّت اور مدّت دراز کی کوشش کے بعد عجیب عجیب راز تم پر کھلیں گے۔ تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ تمام یونیورس باوجود اس بے انتہا وسعت و پہنائی کے اس ذات بیچون و چگون میں جو نقطے کے تصوّر سے محسوس یا مدرک ہوئی ہے، اس طرح سمایا ہوا ہے کہ معدومِ محض کی سی حیثیت رکھتا ہے اور وہ ذات بیک وقت اس یونیورس سے بھی بے اندازہ بڑی اور اقلیدسی نقطہ سے بھی کہیں چھوٹی ہے۔ اس نکتہ پر اس سے زیادہ صاف لکھنے کے لیے ہماری زبان میں الفاظ ہیں نہ قلم میں طاقت نہ رخصت۔

اِسی تفکّر کا ایک ضمنی پہلو یہ بھی ہے کہ جب تم کائنات کی وسعت و پہنائی کا ایک تصوّر قائم کرلو تو اس کے مقابلے میں اپنی زمین کی جسامت پر غور کرو۔ تمہیں دکھائی دے گا کہ یونیورس کے مقابلہ میں تمہاری زمین اتنی بڑی بھی نہیں جتنا اس کرۂ زمین کے مقابلہ میں ایک رائی کا دانہ۔ پھر غور کرو کہ اس کرۂ ارض کے مقابلہ میں خود تمہارا جسم کتنا بڑا ہے، تم کو دکھائی دے گا کہ تمہاری جسامت اس نسبت سے اتنی بھی تو نہیں جتنی گندے پانی کی ایک بوند میں خوردبین سے نظر آنے والے لاکھوں جراثیم میں سے ایک جرثومہ کی۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ تمام کائنات ایک کتابِ مرقوم ہے اور تم اِس میں ایک نہایت باریک موہوم سی تحریر یا نقش۔ جیسا کہ غالب نے کہا ہے۔

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

پھر لُطف یہ ہے کہ جہاں ایک طرف تم اِس قدر ضعیف و حقیر ہو وہاں دوسری طرف اس قدر قوی اور عظیم کہ سمندروں میں طوفان لا سکتے ہو، اُٹھتے ہوئے طوفان کو روک سکتے ہو،

پہاڑوں کو اِن کی بُنیادوں سے ہلا سکتے ہو اور ہمت و ارادہ کرو تو کیا نہیں کر سکتے۔ جب تم ایسے ہو تو تمہارا خالق کیسا کچھ نہ ہوگا۔

غالب کا مندرجہ بالا شعر لکھتے ہوئے ایک بات یاد آ گئی، صوفی شعراء اور بعض فلاسفروں نے یہ مضمون طرح طرح سے بیان کیا ہے خصوصاً برکلے کے فلسفہ کا تو ماحصل ہی یہ ہے کہ۔

عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

یعنی حقیقتاً صرف ایک ذہن کل موجود ہے اور باقی سب کچھ اِسی ذہن کے تصوّرات ہیں۔قرآن کی بعض آیات سے بھی ذہن اِس طرف منتقل ہوتا ہے۔ کیونکہ جب اللہ ہی سب سے اوّل و آخر اور ہر چیز کے اندر و باہر اور ہر شے کو محیط ہے تو کائنات کی حیثیت اِس کی ذات میں یقیناً ایسی ہی ہو سکتی ہے جیسی ذہن میں تصوّرات کی۔ یا یوں سمجھو کہ جب نقّاش صفحۂ قرطاس پر ایک تصویر کھینچنا چاہتا ہے تو جس طرح وہ تصویر کاغذ پر آنے سے پہلے نقاش کے ذہن میں موجود ہوتی ہے اِسی طرح یہ کائنات مصوّرِ حقیقی کے ذہن میں موجود ہے۔ اِس مثال کو وحدت الوجود کے ماننے والے بہت زور و شور سے اپنے عقیدے کے ثبوت میں پیش کیا کرتے ہیں۔ ہم اِس بارے میں ان سے صرف یہ پوچھتے ہیں کہ کیا وہ تصویر جو مصوّر کے ذہن میں موجود ہے اِس کے دماغ کا کوئی حصّہ یا اِس کے جسم کا کوئی عضو ہے؟۔ اگر ایسا نہیں ہے اور یقیناً نہیں ہے تو پھر اس تصویر کی کیا حیثیت اور حقیقت ہے؟ کیا وہ اِس ذہن اور دماغ کی مخلوق نہیں؟

یہ سب کچھ تو ہم ایک رَو اور جذبہ میں بیان کر گئے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ حقیقت کا ایک شمّہ بھی نہ تو کسی سے بیان ہوا ہے نہ ہو سکے گا۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کے لیے کوئی لفظ صحیح طور پر استعمال نہیں کیا جا سکتا مثلاً بڑا، چھوٹا، ظاہر، چُھپا وغیرہ وغیرہ۔ نہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ

اِس کے ہاتھ، آنکھیں، چہرہ اور زبان یا روح اور نفس ہے، لیکن سمجھنے سمجھانے کے لیے کچھ نہ کچھ کہنا ہی پڑتا ہے اور ہم کیا کہتے ہیں وہ خود اپنے لیے فرماتا ہے کہ میں سمیع ہوں، بصیر ہوں، یعنی سنتا اور دیکھتا ہوں، وہ اپنے ہاتھ بھی بیان کرتا ہے یَدُ اللّٰہِ فَوْقَ اَیْدِیْھِمْ وہ اپنے چہرے کا بھی ذکر کرتا ہے فَاَیْنَمَا تَوَلُّوْا فثم وجہُ اللّٰہ. وہ اپنے لیے نفس کا ہونا بھی فرماتا ہے۔وَکَتَبَ عَلٰی نَفْسِہِ الرَّحْمَۃَ کہتا ہے کہ میری روح بھی ہے نَفَخْتُ فِیْہِ مِنْ رُّوْحِیْ. اِس لیے ہم بھی مجبور ہیں کہ اِس کا بیان کرتے ہوئے یہ سب الفاظ اِستعمال کریں ورنہ اِس کی ذات تمام الفاظ اور افہام و تفہیم سے کہیں ارفع و اعلیٰ اور ماورا ہے۔

تیسرا طریقہ:۔ تفکّر بالمشاہدہ کا ایک اور طریقہ بھی ہے، یعنی چیزوں کی شکل وصورت اور حسن ولطائف پر غور کرنے کی بجائے اِن کی ساخت پر غور کیا جائے اور تجربہ کر کے دیکھا جائے کہ وہ کن عناصر یا اجزاء کو کس نسبت سے ملا کر بنائی گئی ہیں اور ہم انہی عناصر یا اجزاء کو اِسی یا دیگر نسبتوں سے ملا کر کیا کیا چیزیں بنا سکتے ہیں اور وہ انسان کے فائدے کے لیے کس طرح اِستعمال کی جا سکتی ہیں۔ اِس طریقہ تفکّر میں روشنی، حرکت، برق، ایتھر، قدرتی شعاعوں کے خواص اور اِن قوانین کے اکتشافات بھی شامل ہیں جن کے مطابق یہ چیزیں کام کرتی ہیں، اِسی کا نام سائنس ہے اور اِسی سے وہ علوم وجود میں آتے ہیں جو آج کل یورپ و امریکہ کا طرّہٗ امتیاز بنے ہوئے ہیں، یہی وہ علوم ہیں جن کو حاصل کرنے کے لیے آیات اللہ پر غور کرنے کا حکم قرآن میں دیا گیا ہے اور ہم نے آج تک اِس پر عمل نہیں کیا۔ اگر آپ موجودہ ذلّت و رسوائی سے چھٹکارا اور عاقبت کے عذاب سے نجات پانا چاہتے ہیں تو اِن علوم کے حاصل کیے بغیر چارہ نہیں۔ اِس عملی طریقہ تفکّر سے یقیناً اللہ کا دیدار تو نہیں ہوگا لیکن اِس کی موجودگی پر یقینِ محکم ضرور پیدا ہو جائے گا، چنانچہ جب سے یہ اکتشاف ہوا ہے

کہ ایٹم کے پھٹنے سے انرجی (توانائی) پیدا ہوتی ہے، سائنس کے اس مُسلّمہ کا خاتمہ ہو گیا ہے کہ مادّہ فنا نہیں ہوتا۔ اب تمام سائنس دان اِس بات کے قائل ہیں کہ اِس مادّی دُنیا سے آگے ایک اور دُنیا ہے جس کو میٹا فزیکل ورلڈ (عالم ماورائے مادّہ) کہتے ہیں۔ یہ تو ابتدائے عشق ہے آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا؟ ہمارا تو ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ سائنس کے ذریعے سے بھی اپنی ہستی کو منوا کر رہے گا۔ اِس نے مخلوق اور خصوصاً انسان کو پیدا ہی اِس لیے کیا ہے کہ پہچانا جائے اور سب اِس کی پرستش کریں۔ یقین ہے کہ ایک دن یورپ کا بچہ بچہ حتیٰ کہ ملحد اور منکرِ خدا کمیونسٹ بھی ایمان لے آئیں گے۔ وہی دن ہو گا جب قرآن اور اسلام کی صداقت آفتابِ نصف النّہار کی طرح روشن ہو جائے گی۔ یہ صرف گمان اور قیاس نہیں ہے ایسا یقیناً ہو کر رہے گا چونکہ یہ بات بھی اللہ تعالیٰ نے قران کریم میں بیان فرما دی ہے، کہتے ہیں:۔

سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ اَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ اَنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ اَلَآ اِنَّهُمْ فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْ لِّقَاءِ رَبِّهِمْ اَلَآ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيْطٌ (حم سجدہ ۵۳، ۵۴)

یعنی ''ان لوگوں کو (منکرین کو) ہم یہ نشانیاں تمام اطرافِ عالم میں دکھائیں گے اور اِن کے اپنے نفوس میں بھی یہاں تک کہ اِن پر ظاہر ہو جائے گا کہ یہ قرآن برحق ہے۔ کیا یہ بات کافی نہیں کہ تمہارا رب ہر چیز کا شاہد ہے خبردار کہ انہیں اپنے رب کی ملاقات میں شک ہے، یاد رکھو کہ وہ ہر چیز کو احاطہ کیے ہوئے ہے''۔

اِس آیت میں جو فرمایا ہے کہ ہم تمام اطرافِ عالم میں اپنی نشانیاں دکھائیں گے وہ تو نظر آ ہی رہی ہیں کہ قدرت کے سینکڑوں راز معلوم ہو چکے ہیں، جس کے نتیجہ میں اب چاند

اور ستاروں کا سفر درپیش ہے اور ایک عالم ماورائے مادّہ کا عقیدہ قائم ہو چکا ہے، لیکن یہ جو فرمایا ہے کہ ہم اِن کے نفوس میں بھی اپنی نشانیاں دکھائیں گے، یہ بہت قابلِ غور بات ہے۔ ایکس رے کے ذریعہ بدن کے اندر اعضائے رئیسہ کے حالات تو بہت کچھ اب دکھائی دینے لگے ہیں، کہیں یہ تو مراد نہیں کہ آئندہ آلات کے ذریعے انسانی عقل، نفس اور روح وغیرہ کی طاقت اور لطافت و کثافت بھی معلوم ہو جایا کرے گی، دل کے خیالات بھی ریکارڈ ہونے لگیں گے وغیرہ وغیرہ۔ تعجب تو کچھ نہیں اگر ایسا ہو اور اِس کے ساتھ ہی یہ جو کہا ہے کہ انہیں ہماری لقاء پر شک ہے مگر ہم ہر چیز پر محیط ہیں۔ اِس کا یہ تو مطلب نہیں کہ آئندہ کچھ ایسے آلات نکل آئیں کہ خدا کی موجودگی اِس قدر ثابت و ظاہر ہو جائے جیسے آنکھوں سے دیکھ کر ہوتی ہے۔

اب ہم تفکّر بالمراقبہ کا بیان کرتے ہیں:

تفکّر بالمراقبہ:

مراقبہ کے معنی حفاظت و نگہبانی کے ہیں۔ لیکن حکمت و عرفان میں اصطلاحاً دماغ میں کسی خیال یا تصوّر کے اِس طرح قائم کرنے کو کہتے ہیں کہ اِس کے سوا اور کوئی خیال یا تصوّر باقی نہ رہے۔ تفکّر بالمشاہدہ میں ہم اشیاء کی شکل و صورت پر غور کرتے ہیں مگر تفکّر بالمراقبہ میں اشیاء یا اسماء کی حقیقت اور معنویت پر غور و فکر کیا جاتا ہے، مثلاً تفکّر بالمشاہدہ میں ہم برف کو دیکھ کر اِس کی چمک دمک اور سفید رنگ کی شوخی اور خوبصورتی کے تصوّر میں محو ہو جائیں گے، لیکن تفکّر بالمراقبہ میں برف کی کسی صفت مثلاً سردی کا تصوّر اِس انہماک سے کریں گے کہ آخرکار ہمیں سردی محسوس ہونے لگے گی خواہ اِس وقت گرمی ہی کیوں نہ پڑ رہی ہو۔

یہ ضروری ہے کہ مراقبہ مرشد کی ہدایت کے بغیر نہ کیا جائے۔ وہ بہتر جانتا ہے کہ کس کے

لیے کون سے اِسم یا آیت کا مراقبہ زیادہ مناسب ہوگا۔ بہت سے طالب نفیٔ ماسویٰ ہی میں وہ کمال حاصل کر لیتے ہیں کہ انہیں مراقبہ کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ مراقبہ کی غرض و غایت یہ ہے کہ کشف حاصل ہو جائے، روحیں نظر آنے لگیں اور عالمِ مثال کا مشاہدہ میسر آ جائے اور یہ سب باتیں قطع ماسویٰ میں ہی بعض سالکوں کو حاصل ہو جاتی ہیں۔ مبادیاتِ مراقبہ یہ ہیں کہ پہلے اللہ کی اسماء صفات میں سے کسی اسم کا مراقبہ کیا جائے، جب اِس میں دستگاہ ہو جائے تو قرآن کی کسی آیت کا، پھر اِسم ذات کا، پھر فنا کا وغیرہ وغیرہ۔

مراقبہ کے لیے ضروری نہیں کہ اِسی طرح بیٹھو جس طرح نماز میں بیٹھتے ہو بلکہ اِس طرح بیٹھنا چاہیے جس میں تکلف اور تکلیف نہ ہو اور ایسے وقت اور ایسی جگہ بیٹھو کہ شور وشغب نہ ہو اور دھیان نہ بٹے۔ طریقہ یہ ہے کہ مراقبہ کے لیے وہ لفظ منتخب کرو جو تمہارے دل کو سب سے پیارا لگتا ہے مثلاً یارحیم۔ اب پاس انفاس بند کر دو اور ''یارحیم'' کا وِرد شروع کرو لیکن لفظ رحیم کا خیال رکھنے کی بجائے اِس کے معنی کا خیال کر کے اللہ تعالیٰ کی عام رحمت کو ہر چیز میں خیال کی مدد سے دیکھنے کی کوشش کرو۔ یہاں تک کہ رفتہ رفتہ کچھ دن میں رحمت کا عام مفہوم دماغ اور قلب میں پیوست ہو جائے اور اِسم غائب ہو کر مسمیٰ باقی رہ جائے، پھر قرآن کی کوئی آیت چنو مثلاً

وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَمَا كُنْتُمْ (الحدید۴)

''یعنی تم جہاں بھی ہو اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ ہے''

اب اِس کا ورد معنوں کا خیال رکھتے ہوئے اِس قدر کثرت سے کرو اور اِس کے معنوں میں اِس قدر مستغرق ہو جاؤ کہ آیت کے الفاظ کی طرف خیال ہی نہ جائے لیکن معنی دل کی آنکھوں کے سامنے روشن ہو جائیں۔

فناء کے مراقبہ کا طریقہ یہ ہے کہ خلاء محض کا تصوّر دماغ میں قائم کرو اور اِس قدر کوشش کرو کہ خلاء کے بیچ میں جو آفرینش ہے اِس کا خیال بھی باقی نہ رہے حتیٰ کہ خود اپنا وجود بھی نفی ہو جائے۔ اب جو تصوّر حاصل ہوا ہے وہ خلاء یا عدم کا ہے۔ اب اِس تصوّر کو اتنا بڑھاؤ کہ خود تصوّر کا احساس بھی جاتا رہے، فنا حاصل ہو جائے گی۔

ایک مراقبہ کشف قبور کا بھی ہے۔ اِس کا طریقہ یہ ہے کہ کسی قبرستان میں رات کی تنہائی میں بیٹھ کر مردے کے جسم کا تصوّر کرو اور

سُبُّوحٌ قُدُّوسٌ رَبُّنَا وَ رَبُّ الْمَلَائِكَةِ وَالرُّوحِ

کی اَن گنت تکرار کرو اور لفظ روح کو خوب دل و دماغ میں جماؤ۔ ارتکاز خیال کامِل ہونے پر اِس مُردے کا جسم نظر آنے لگے گا اور رفتہ رفتہ تمام قبرستان کے مُردے بھی ممکن ہے نظر آ جائیں۔ روحوں کو بلانے اور دعوت دینے اور مستقبل کی باتیں معلوم کرنے کے لیے بھی مراقبے کیے جاتے ہیں۔ چونکہ یہ باتیں ہماری رائے اور تجربہ میں سالکوں کو بجائے فائدے کے نقصان پہنچایا کرتی ہیں، اِس کے علاوہ تمام تصوّف کی کتابوں میں موجود ہیں، اِس لیے ان کا ذکر نہیں کیا جاتا۔

اب ہم خدمتِ خلق کا ذکر کرتے ہیں جو حاصل ہے تمام جد و جہد و ریاضت اور سلوک کا۔ ظاہر ہے کہ تم کتنے ہی بڑے ولی اللہ بن جاؤ اگر تم سے دُنیا کو فیض نہ ہو تو تمہاری ولایت صرف تمہارے ذاتی فائدے کے لیے ہے اور تم کسی حالت میں نائب رسول کہلانے کے مستحق نہیں۔ کیونکہ نبی مبعوث ہی اِس لیے ہوئے ہیں کہ خلقِ خدا کو زندگی بسر کرنے کے ایسے طریقے بتائیں جن پر عمل کرنے سے دُنیا اور عقبیٰ دونوں میں کامرانی نصیب ہوتی ہے۔

۱۰۔ خدمتِ خلق:

اگر طالب صادق اور محنتی اور اس کا مرشد کامِل ہو تو اوپر بتایا ہوا سارا نصاب زیادہ

سے زیادہ تین سال میں مکمّل ہو جاتا ہے ورنہ تیس چالیس برس میں بھی نہیں ہوسکتا۔ معرفتِ الٰہی حاصل ہونے کے بعد دُنیا اور کائنات کی تمام اشیاء اور خصوصاً انسانی فطرت کی معرفت بھی حاصل ہو جاتی ہے اور عقلِ سلیم بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ ایسا شخص اخلاق میں کامل ہوتا ہے، وہ انفراداً اور اجتماعاً انسانی فطرت کو اوروں سے کہیں زیادہ سمجھتا ہے، اِس لیے زندگی کے انفرادی اور اجتماعی مسائل کو آسانی سے حل کرنے اور عوام کے اخلاق کی اصلاح کرنے کا اہل اِس سے زیادہ کوئی نہیں ہوسکتا۔ قرنِ اول میں ملّت کے رہنما، قائد، افسر اور جنرل ایسے ہی لوگ تھے۔ اِسی لیے اِس زمانے میں اِس قدر ترقی ہوئی۔ آج کل کے لیڈر اور افسر جیسے ہیں آپ کے سامنے ہیں۔

خدمتِ خلق میں ایک معمولی سی بات سے لیکر اِنتہائی قربانی اور ایثار تک سب کچھ شامل ہے مثلاً کسی کو راستہ بتانا، راستہ کو کانٹوں اور پتھروں سے صاف کر دینا، کسی کا بوجھ اُٹھا دینا، بھوکے اور ننگے کو روٹی کپڑا دینا، بیماروں کی تیمارداری اور علاج کرنا، بے علموں کو علم حاصل کرنے میں مدد دینا۔ ان سب سے بڑھ کر یہ کہ کسی کو اِس قابل بنا دینا کہ وہ معیشتی لحاظ سے اپنی زندگی آرام سے گزار سکے اور اِس سے بھی بڑھ کر یہ کہ کسی کو اللہ کا راستہ بتانا اور قرآن کریم کی تعلیم میں اِس طرح کامل کر دینا کہ اِس کی زندگی دُنیا اور عقبیٰ دونوں میں کامیاب رہے۔ نبی یہی سکھاتے تھے اِسی لیے اِن کا مرتبہ سب سے زیادہ ہے۔

خدمتِ خلق کی دو صورتیں ہیں، ایک انفرادی دوسرے اجتماعی۔ زیادہ افضل اور اشرف کام وہ ہیں جن سے انسانوں کی بڑی سے بڑی جماعتوں کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچے مثلاً بیماروں کے مفت علاج کی غرض سے اعلیٰ درجے کے ہسپتال کھولنا، عوام کو معمولی اور اعلیٰ تعلیم کے لیے کتب خانے، سکول اور کالج قائم کرنا، سائنس کی ترویج کے لیے مَعْمَلْ یعنی

لیبارٹریاں بنانا، بینک اور ایسے صنعتی ادارے اور کارخانے قائم کرنا جن کی وجہ سے قوم میں دولت کی ریل پیل ہو جائے۔ یہ سارے کام دراصل قومی اُمراء کے فرائض میں شامل ہیں۔ متمدّن ممالک اور زندہ قوموں میں یہ سب کام قوم خود کرتی ہے۔حکومت کے ذِمّہ تو صرف ایڈمنسٹریشن، انصاف اور دفاع کا کام ہوتا ہے، مگر اسلامی ممالک کی قومیں روٹی کے ٹکڑے تک کے لیے گورنمنٹ کے آگے ہاتھ پھیلانے کی عادی ہیں۔جن قوموں کے اُمراء یہ کام اپنے ذمہ لے لیتے ہیں وہ قومیں ترقی کرتی چلی جاتی ہیں جیسا کہ یورپ، امریکہ، جاپان اور آخر میں ہندوستان کے ہندو سیٹھوں نے کر کے دکھایا۔مسلمانوں میں بھی ہزاروں لکھ پتی، سینکڑوں کروڑ پتی اور بیسیوں ارب پتی ہیں، لیکن یہ لوگ سارا روپیہ اپنی ذاتی آسائشوں اور عیاشیوں پر ہی خرچ کرتے ہیں،قومی خدمت کا خیال بھی ان کے دماغ میں نہیں آتا۔قرآن دولت کمانے سے ہرگز منع نہیں کرتا لیکن دولت کو جمع کر کے رکھنے یا صرف ذاتی عیش و عشرت پر صرف کرنے کو ضرور منع کرتا ہے، چنانچہ سورۃ توبہ آیت ۳۴ میں ارشاد ہوتا ہے کہ ''روپیہ اور دولت زمین میں گاڑ رکھنے والوں کو عذاب ہے جو راہِ خدا میں خرچ نہیں کرتے'' یہ راہِ خدا کیا چیز ہے؟ قوم کی فلاح و بہبودی۔

اللہ تعالیٰ قرآن میں فرماتے ہیں: وَاَقْرِضُو اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا (المزمل ۲۰)

''اور اللہ کو قرض دیتے رہو، اچھا قرض''

کون ہے جو اللہ تعالیٰ کو قرضِ حسنہ دیتا ہے، ظاہر ہے کہ اللہ کو اپنے لیے روپیہ وغیرہ قرض لینے کی ضرورت نہیں وہ کسی حیثیت سے بھی کسی کا محتاج نہیں ہے۔لہٰذا اس قرض سے اس کے سوا اور کچھ مراد نہیں کہ قوم کی فلاح و بہبود اور دفاع و ترقّی پر روپیہ خرچ کرو، کیونکہ ملّت کی بقاء ہی سے اسلام کی بقا ہے، پھر ہمارے اُمراء کو یہ بھی سوچنا چاہیئے کہ ان کی ہستی بھی قوم

کی ہستی پر منحصر ہے، قوم ترقی کرے گی تو وہ بھی ترقی کریں گے، قوم تباہ ہو جائے گی تو وہ بھی تباہ ہو جائیں گے۔ اگر کوئی دشمن مُلک پر قبضہ کر لے تو سب سے پہلے ان کو لوٹے گا، اِس لیے قوم کو مضبوط اور طاقتور رکھنے میں انہی کا فائدہ ہے۔

پیوستہ رہ شجر سے اُمیدِ بہار رکھ

جو لوگ اوپر بتائے ہوئے طریقوں سے ایمانِ محکم حاصل کرتے اور کردارِ انسانی کی تکمیل کرتے ہیں ان کو روپیہ پیسہ ہرگز اتنا عزیز نہیں ہوتا کہ قوم کو ضرورت ہو اور وہ اپنے خزانوں کو سانپ کی طرح کلیجے سے لگائے بیٹھے رہیں۔ ایسے لوگ روپیہ ہی نہیں اپنی املاک، اپنے بیوی بچے اور جان سب کچھ بوقت ضرورت اللہ یعنی قوم پر قربان کر دیتے ہیں۔ رسول اکرمؐ کے صحابیؓ ایسے ہی تھے۔

سلوک کے طریقوں کا بیان ختم ہوا، اب ہم بتائیں گے کہ دَورانِ سلوک میں کیا کیا کچھ نظر آتا ہے، کیا کوائف وارد ہوتے ہیں، کون سی منازل اور طبقات سے گزرنا ہوتا ہے اور سلوک کا ماحصل کیا ہے؟

اِن باتوں کو آسانی سے سمجھانے کے لیے ہم نے چار دَور قائم کیے ہیں، لیکن ضروری نہیں کہ ہر سالک کو ہر چیز ضرور ہی نظر آئے یا اسی ترتیب سے نظر آئے یا حاصل ہو جو ہم نے قائم کی ہے۔ ظاہری صورت وشکل اور عادات و اطوار کی طرح سالکوں کی روحانی استعداد بھی ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہے، اِس لیے ان کے حصولِ درجات کی ترتیب اور کوائف بھی ایک دوسرے سے بہت کچھ مختلف ہوتے ہیں۔

حصولِ درجات کے جو چار دَور ہم نے مقرّر کیے ہیں، ان میں جا بجا روحانی سفر اور ان مقامات کا ذکر آتا ہے جہاں سے روح گزرتی ہے۔ اِس لیے ضروری معلوم ہوتا ہے

کہ ان ادوارِ چہار گانہ کا ذکر کرنے سے پہلے اس عالمِ روحانی اور اس کے طبقات وغیرہ کا کچھ ذکر کر دیا جائے اور اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے جو قلیل علم روح کا ہم کو عطا فرمایا ہے اس کی بناء پر کچھ حال روح کا بھی لکھ دیا جائے تا کہ قارئین کی سمجھ میں ہمارا مفہوم و مطلب اچھی طرح آجائے۔

عالمِ رُوحانی

علماء اور اولیائے متقدمین نے دو عالم بیان فرمائے ہیں، ایک عالمِ امر اور دوسرا عالمِ خلق۔ ہم نے زیادہ واضح طور پر سمجھانے کی غرض سے عالمِ خلق کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے، ایک عالمِ مثال دوسرے عالمِ مادّی۔ اِس طرح کل تین عوالم ہوئے عالمِ امر، عالمِ مثال، عالمِ مادّی۔ اِن تینوں کے مجموعہ کا منفرد نام کائنات ہے۔

عالمِ مادّی میں زمین، سورج، چاند اور تمام ستارے شامل ہیں۔ عالمِ مثال اور عالمِ امر اِس تمام کائنات کی فضا میں پھیلا ہوا ہے۔ وہ ہماری زمین اور ستاروں اور کرّوں میں بھی موجود ہے اگرچہ اِن کے رہنے والوں کو محسوس نہیں ہوتا، نہ عالمِ مثال میں رہنے والی مخلوق کو یہ کُرّے محسوس ہوتے ہیں۔ قرآن میں اِس کی بابت آل عمران آیت ۱۳۳ اور سورہ الحدید کی آیت ۲۱ میں ہے کہ جنّت زمین و آسمان کی وسعتوں میں پھیلی ہوئی ہے۔

یہ تمام کائنات کُروی شکل کی ہے، اِس کا مرکز عرشِ اعظم ہے اور اِس عرش کا مرکز عین ذات یا ذاتِ بحت کا جائے قرار ہے، جس کو قرآن میں **ثُمَّ اسْتَوىٰ عَلَى الْعَرْشِ** کہا گیا ہے۔ یہ ذات کی وہ حقیقت ہے جو پاک ہے اُن تمام صفات سے جو ہم اُس کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ اِس ذاتِ بحت کے ارد گرد ذاتی تجلّیات کا عالم ہے۔ عرش کے سِروں سے صفاتی تجلّیات شروع ہوتی ہیں یعنی اب الطف مقابلتہً کم لطیف ہوتا جاتا ہے۔ ذاتی وصفاتی تجلّیات کا مبداء اگرچہ عرش ہے مگر وہ تمام کائنات میں ہر وقت اور ہر جگہ موجود لیکن اِس طرح مستور ہیں جیسے بادلوں میں بجلی۔ عرش کے بعد بسائط ہیں، اِن کی تعداد کو اللہ ہی جانتا

ہے، لیکن اِن میں سے خاص خاص یہ ہیں، پہلے روحِ بسیط یا روح الاعظم ہے، دوسرے عقلِ بسیط ہے تیسرے نفسِ بسیط ہے، نفسِ بسیط کے بعد عدمِ بسیط ہے۔ یاد رکھئے کہ ہم عرش سے عالمِ مثال اور عالمِ مادّی کی طرف نزول کر رہے ہیں۔ عرش کے بعد جن بسائط کا ذکر ہوا وہ اور دوسرے عوالم جن کا اب ذکر ہوگا عرش کے چاروں طرف طبقات کی طرح واقع ہیں۔ عدمِ بسیط کے آخری سرے پر عالمِ امر ختم ہو جاتا ہے۔

عالمِ اَمر کے بعد عالمِ مثال ہے جس کے پہلے طبقے کا نام عالمِ ھو ہے۔ اِس کے بعد علی الترتیب ھاھوت، لاھوت، جبروت اور ملکوت کے عوالم ہیں، یہاں جنّتوں کے طبقات ختم ہو جاتے ہیں۔ اِس کے بعد ناسوت یعنی دوزخوں کا مُلک ہے، جس کے ڈانڈے ہمارے عالمِ مادّی سے ملے ہوئے ہیں۔ ناسوت مادّی عالم کو کہتے ہیں، ہم نے آسانی سے سمجھ میں آنے کے لیے یہ لفظ دوزخ کے لیے اِستعمال کیا ہے۔

عوالم کی یہ ترتیب نزولی ہے یعنی ہم عرش سے اِس عالمِ مادّی کی طرف آئے ہیں۔ اِس میں یاد رکھنے کی بات صرف یہ ہے کہ ہر عالم اور اِس عالم کا ہر طبقہ جو جتنا عرش سے نزدیک تر ہے اتنا ہی اپنے بعد کے عالم سے زیادہ لطیف ہے حتیٰ کہ سب سے کثیف یہ ہمارا عالمِ مادّی ہے۔ اب ہم کچھ حال ارواح انسانی کا بیان کرتے ہیں کہ وہ کہاں سے اور کس طرح چل کر اِس عالمِ مادّی تک پہنچتی اور مادّی جسموں میں جلوہ فگن ہوتی ہیں۔

اوپر بیان ہو چکا ہے کہ عرش کے بعد اور اِس کے اردگرد روحِ بسیط ہے جو مخزن ہے اِن تمام ارواحِ مجرّدہ کا جو خالق حقیقی نے روزِ اول محض اپنے حکم سے پیدا کر دی تھیں۔ اِن ارواحِ مجرّدہ میں کوئی صفت سوائے محبت اور عبودیت کے نہیں ہوتی۔ لیکن استعداد دوسرے خواص کو جذب کرنے کی موجود ہوتی ہے۔ مثال روحِ بسیط کی سمندر کو سمجھو، سمندر کیا ہے؟

پانی ہے بسیط شکل میں، دوسرے الفاظ میں یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ سمندر مجموعہ ہے پانی کے بے شمار ایٹموں کا، جب سورج اُس پر نظر ڈالتا ہے تو اِس کے تارہائے نظر یعنی کرنوں سے اِن ایٹموں میں زندگی یعنی حرارت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ ایک تار یا شعاع کی شکل میں آسمان کی طرف صعود کرتے ہیں۔ یہ تار اِس قدر باریک ہوتے ہیں کہ خوردبین سے بھی نظر نہیں آسکتے البتہ وہ سب مل کر دکھائی دیتے ہیں تو ہم اِس کو بھاپ کہتے ہیں۔ جب خلا میں اِس بھاپ کی مقدار زیادہ ہو جاتی ہے تو وہ بادل کہلاتی ہے۔ اِس بادل کو جب سردی پہنچتی ہے تو پھر وہ پانی بن کر زمین پر برس پڑتا ہے اور اپنی اصل یعنی سمندر کی تلاش میں بے اختیار نشیب کی طرف دوڑنے لگتا ہے، کیونکہ سمندر سطحِ زمین سے نشیب ہی میں واقع ہے، اِس میں سے کچھ پانی جس کو صراط المستقیم مل جاتی ہے۔ دریاؤں کے وسیلے (وَابْتَغُوْا اِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ) بہت جلد سمندر میں جا ملتا ہے، کچھ پانی غلط راستے پر پڑ کر تالابوں، جھیلوں، کنوؤں وغیرہ میں قید ہو جاتا ہے اور رفتہ رفتہ زمین میں جذب ہو کر تنگ و تاریک اور پیچیدہ مادّی (مثالاً ناسوتی) راہوں سے سمندر کی تلاش میں رواں دواں رہتا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ پانی ہزار ہا سال سرگرداں رہنے کے بعد اپنی اصل سے جا ملے اور یہ بھی ممکن ہے کہ قیامت تک نہ پہنچ سکے۔

وَعَلَى اللّٰهِ قَصْدُ السَّبِيْلِ وَمِنْهَا جَآئِرٌ (النحل ۹)

یعنی ''ایک سیدھی راہ ہے جو اللہ تک پہنچتی ہے اور کئی راہیں ٹیڑھی میڑھی بھی ہیں''۔

بعینہٖ یہی حال ارواحِ مجرّدہ کا ہے۔ ہر روح ایک ایٹم کی طرح روحِ بسیط میں موجود ہے۔ آفتابِ حقیقی جب کسی روح کو پیدا کرنے کا ارادہ فرماتا ہے تو اپنی نظر حیات افروز اِس پر ڈالتا ہے جس کے اثر سے یہ روحانی ایٹم لمبا ہو کر بشکل شعاع (یا با الفاظِ قرآن ظِل یا پرچھائیں) عالمِ اسفل کی طرف نزول کرنے لگتا ہے، لیکن برخلاف پانی کے اِس روحانی ایٹم

کا سرا روحِ بسیط میں اپنی جگہ پر ہی قائم رہتا ہے۔ روحِ بسیط سے گزر کر یہ شعاع عقلِ بسیط میں داخل ہوتی ہے اور بقدرِ استعداد عقل کو جذب کرتی ہوئی نفسِ بسیط میں پہنچتی ہے اور نفس سے جو حصّہ مقدر ہوتا ہے لے لیتی ہے، مطلب یہ ہے کہ یہاں اِس میں نفس پیدا ہو جاتا ہے۔ (نفس کیا ہے؟ خواہش مجرّد) اب یہ عدمِ بسیط میں پہنچتی ہے۔ چونکہ قانونِ آفرینش کے مطابق کوئی ہستی اِس وقت تک مشخّص نہیں ہوسکتی جب تک کہ وہ اپنی ضد کے مقابل نہ آئے، اِس لیے عدم میں پہنچتے ہی اِس کو اپنے وجود کا عرفان ہو جاتا ہے، گو یہ عرفان ابھی بہت ضعیف ہوتا ہے اِسی کو اَنا کہتے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ جس طرح روح، عقل اور نفس کے لطائف میں سے گزرتے ہوئے بقدرِ استعداد عقل اور نفس کے خواص کو اپنے ساتھ ملا لیتی ہے، اِسی طرح عدم میں سے گزرتے ہوئے تخریب وفنا کے تاثّرات اور خواص کو بھی ساتھ لے لیتی ہے، اگر ایسا نہ ہوتا تو جو چیز اِس مادّی عالم میں ایک دفعہ پیدا ہو جاتی پھر کبھی فنا نہ ہوسکتی۔ عدم کے آخری کنارے پر عالمِ امر ختم ہو جاتا ہے، گویا اب تک اِس کا وجود محض اللہ تعالیٰ کے علم اور ارادہ میں مستور رہتا ہے، اب یہ شعاع ھو میں داخل ہوتی ہے۔

یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ ہر روح میں مبداء سے معاد تک اِس کا پورا مقدّر اِس طرح پنہاں ہوتا ہے جس طرح بڑ کے رائی برابر بیج میں اُس سے پیدا ہونے والے تناور درخت کی پوری زندگی۔ اب لامحالہ یہ روح یا تو دوزخی ہوگی یا جنّتی، اگر دوزخی ہے تو عالمِ ناسوت کے کسی طبقے میں اِس کے لیے کوئی خاص مقام مقرّر ہوتا ہے جہاں مادّی سفر کے بعد اِس کو قیامت تک ٹھہرنا ہے۔ اگر جنّتی ہے تو پھر جنّت کے عوالم میں سے کسی عالم اور طبقے میں کوئی خاص جنّت اُس کے لیے ہوتی ہے، اِسی جنّت کو اِس روح کا مقامِ محمود کہتے ہیں۔

الغرض عالمِ امر کے ختم ہونے پر یہ روح عالمِ مثال کے مبیّنہ عوالم میں سے گزرتی ہوئی

اپنے مقامِ محمود (یا دوزخی ہو تو عالمِ ناسوت میں اپنے مقامِ معاد) تک پہنچ جاتی ہے، یہاں وہ قدرے قیام کرتی ہے تاکہ اِس مقام سے روشناس ہو جائے۔ حقیقتاً اِسی مقام پر اس کو وہ وجود عطا ہوتا ہے جس کو بجا طور پر روحانی وجود کہا جا سکتا ہے۔ اب مقامِ محمود سے روانہ ہو کر باقی عوالم کو طے کرتی اور عالمِ ناسوت سے گزرتی ہوئی یہ ایثر میں داخل ہوتی ہے جو مادّے کی سب سے لطیف اور آخری حد ہے۔ ایثر سے یہ حواس پنجگانہ اور دیگر مادّی خواص وقویٰ کو بقدرِ استعداد اخذ کرتی ہوئی کسی نظامِ شمسی کے آفتاب میں جاتی ہے، اور اِس سے جان یا روح حیوانی کی حرارت حاصل کر کے اِس کُرّے میں پہنچ جاتی ہے جہاں اِس کو پیدا ہونا ہے۔ اب وہ بہ اِنتظام قضا وقدر کسی کھانے پینے کی چیز مثلاً پھل، غلّہ وغیرہ میں داخل ہو جاتی ہے اور وہ چیز اُس شخص کو کھلائی جاتی ہے جو اس کا باپ بننے والا ہے۔ صلبِ پدر سے یہ رحمِ مادر میں منتقل ہوتی ہے، نو ماہ وہاں مادّی تعمیر میں بسر ہوتے ہیں۔ اِس کے بعد انسان بن کر عالمِ مادّی میں پیکرِ مادّی پہن کر جلوہ افروز ہو جاتی ہے۔ اب جتنی اور جیسی زندگی مقدر ہو بسر کر کے عالمِ مثال میں اپنے مقامِ معاد یا مقامِ محمود کو واپس چلی جاتی ہے اور یوم الحساب تک وہیں مقیم رہتی ہے۔ اس کے بعد جو مالکِ یوم الدّین چاہے گا اِس کے ساتھ کرے گا، یہاں یہ بات خاص طور پر غور کرنے کی ہے کہ روحِ بسیط میں اپنے پہلے سرے سے چل کر یہ شعاع کس طرح درجہ بدرجہ لطیف سے کثیف تر ہوتی نطفہ تک پہنچتی ہے، نطفہ کیا ہے؟ وہ جرثومہ یا زندہ مادّی اجسام کی وہ سب سے پہلی اور لطیف ترین یونٹ جو خوردبین سے بھی بمشکل نظر آتا ہے۔ یہی جرثومہ مادہ کے پیٹ میں اپنی غذا حاصل کر کے درجہ بدرجہ کثیف ہوتا جاتا ہے یہاں تک کہ مکمّل ہو کر شکمِ مادر سے باہر نکل آتا ہے۔ اب ہم بتائیں گے کہ مرنے کے بعد انسان کی روح سفرِ آخرت کس طرح طے کرتی ہے؟ اِس کے لیے اب ہم کو اُلٹا سفر کرنا پڑے

گا یعنی عوالم میں ترتیبِ صعودی کا خیال رکھنا ہوگا۔

یہ تو بتایا جا چکا ہے کہ ہمارے عالَمِ مادّی سے ملا ہوا عالَمِ ناسوت یا دوزخوں کا عالَم ہے۔ اب سنئے کہ اِس عالَم میں ہماری تحقیق کے مطابق بہتّر (۷۲) طبقات ہیں۔ جن میں سے شروع کے چند طبقات میں بے برگ و گیاہ ریگستان اور بیابان، جلے ہوئے خشک پہاڑ، دہشت ناک جنگل، کھولتے ہوئے پانی کے چشمے اور جھیلیں، آتش فشاں پہاڑ اور آگ سے بھری ہوئی وادیاں ہیں، پینے کے پانی کا کہیں نام و نشان نہیں اور ملتا بھی ہے تو گرم اور کڑوا۔ درختوں میں سوائے زقّوم، ناگ پھنی اور خاردار جھاڑیوں کے اور کچھ نظر نہیں آتا۔ اِس کے بعد چند طبقات میں کسی قدر ٹھنڈا پانی، سرسبزی اور کچھ بہتر قسم کے جنگل اور آبادیاں ہیں۔ اِس کے بعد ہر طبقہ پہلے طبقے سے بہتر ہوتا چلا گیا ہے، حتیٰ کہ بہترواں طبقہ سرسبزی و شادابی میں پچھلے تمام طبقوں سے بڑھا ہوا ہے اور عالَمِ ملکوت کے پہلے طبقے کی جنّتوں سے کچھ ہی کم ہے۔ یہ طبقہ ناسوت کے بالکل آخری سرے پر واقع ہے۔ اِس کے بعد ایک دیوار ہے جس کا نام اعراف ہے، اِسی کی نسبت سے یہ طبقہ اعراف کہلاتا ہے۔ دیکھئے سورۂ اعراف آیت ۴۵ا اور سورۂ الحدید آیت ۱۳۔ اِس دیوار کے بعد جنّتوں کے عوالم شروع ہوتے ہیں جن میں پہلا عالَمِ ملکوت ہے۔ اعراف اور جنّت کے پہلے طبقے میں یہ فرق ہے کہ جنّت میں کھانا پینا اور عیش و عشرت کے سامان اعراف سے بہت بہتر ہیں اور بے محنت و مشقّت میسّر آتے ہیں۔ اعراف میں سب چیزیں گھٹیا درجے کی ہیں اور محنت و مشقّت سے ملتی ہیں۔ دوسرا فرق یہ ہے کہ اعراف کے لوگ (یعنی روحیں) دوسروں کو اپنے سے بہتر حالت میں دیکھ کر جلتے اور رنج کرتے ہیں، جس کا کرب ہی اِن کے لیے عذابِ دوزخ ہے۔ برخلاف ازیں جنّت میں ہر روح اپنی حالت پر خوش اور مگن ہے بلکہ دوسروں کو زیادہ اچھی حالت میں

دیکھ کر اور بھی خوش ہوتی ہے۔ اِس طرح جنّت میں خوشی ہی خوشی ہے، رنج کا نام نہیں۔ کاش ہم دُنیا میں بھی یہی عادت اختیار کر لیں تو دُنیا بھی جنّت سے کم نہ رہے۔

اِس بیان کو پڑھ کر بہت سے لوگ کہیں گے کہ اگر یہی امرِ واقعہ ہے تو پھر مادّی اور روحانی عالم میں فرق ہی کیا رہ گیا۔ تو جواب یہ ہے کہ واقعی عالمِ مثال (برزخ) سارے کا سارا قطعاً روحانی ہے ہرگز مادّی نہیں، لیکن وہاں ہمارا جسم بھی تو روحانی ہوگا اور روحانی جسم کو روحانی عالم کی تمام کیفیات و کمیّات مثلاً راحت، اذیّت، سردی، گرمی اور نرمی وسختی وغیرہ بالکل ایسی ہی معلوم ومحسوس ہوں گی جیسی کہ ہمارے مادّی اجسام کو اِس مادّی عالم میں ہوتی ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو قرآن وحدیث میں عذابِ دوزخ اور وہاں کی تکلیف کا جو بیان ہے مثلاً آگ، کھولتا ہوا پانی، کھانے کو زقوم اور خار دار درخت، پینے کو گرم پانی، لہو اور پیپ وغیرہ وغیرہ تو یہ سب بے معنی ہوتا۔ اِسی طرح جنّتوں کے بیان میں جو حُور و قصور، باغات، ماکولات ومشروبات اور دیگر لذائذ ونعائم کا ذکر ہے وہ بھی کوئی معنی نہ رکھتا۔ حق یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ اپنے کلامِ پاک میں بیان کیا ہے لفظاً لفظاً درست ہے اور ایک مسلمان کو اِس پر اِسی طرح ایمان رکھنا چاہیئے، اِس کی اور کوئی توجیہہ نہیں ہے۔

ہاں تو اعراف کے بعد جنّتوں کے عوالم شروع ہوتے ہیں جن میں پہلا عالمِ ملکوت ہے۔ اِس کے چھتیس (۳۶) طبقات ہیں جن میں سے ہر طبقہ پچھلے طبقے سے ہر لحاظ سے بہتر اور افضل ہوتا چلا گیا ہے۔ ملکوت کے بعد عالمِ جبروت اور اُس کے بعد عالمِ لاہوت ہے۔ ان دونوں عوالم میں سے ہر ایک میں اٹھارہ طبقات ہیں جن میں ہر طبقہ عمارت وامارت، وسعت ورفعت، سرسبزی وشادابی اور نزہت ولطافت میں اپنے پچھلے طبقے سے کہیں زیادہ بہتر وبرتر ہے۔ ان جنّتوں میں جو محلّات، قصور، باغات، نہریں، چشمے، پھل، پھول، ماکولات و

مشروبات، حوریں، غلمان وغیرہ ہیں اور جو کیف و سرور اللہ تبارک وتعالیٰ کی تجلّیات اور لِقا سے حاصل ہوتا ہے ان سب کا بیان بخوفِ طوالت ترک کیا جاتا ہے، جس کو شبہ ہو قرآن اور احادیثِ نبویؐ کی طرف رجوع کرے۔

یہاں تک ہم نے عالَمِ لاہوت کا بیان کیا ہے۔ اب ہم اگلے عوالم کا بیان کرتے ہیں، لیکن ایک مرتبہ پھر یاد دلانا ضروری ہے کہ ان عوالم میں سب سے بڑا فرق کثافت و لطافت کا ہے۔ عالَمِ ناسوت کا پہلا طبقہ سب سے کثیف ہے، اس کے بعد ہر طبقہ پچھلے طبقہ سے لطیف تر ہوتا گیا ہے، حتیٰ کہ عرش اور اس کے مرکزی نقطہ پر جہاں عین ذات کی حقیقت ہے اس لطافت کی تکمیل ہوجاتی ہے۔ اب سنئے کہ عالَمِ لاہوت کے بعد عالَمِ ہاہوت ہے، جس کے چودہ طبقات ہیں۔ اس عالَم کا پہلا طبقہ لطافت میں اس قدر بڑھ گیا ہے کہ وہاں کی جنّتیں اور اُن کے قصور بڑی صاحبِ بصیرت روحوں کو بھی محض دُھندلے نقوش کی طرح نظر آتے ہیں۔ اگلے طبقات میں یہ نقوش اور بھی لطیف ہوتے ہوتے محض خیالی سے رہ جاتے ہیں اور چودھویں طبقے میں تو صُور و اشکال کا تخیّل بھی غائب ہوجاتا ہے۔ اس عالَم میں صرف اُن اولیاءاللہ کی روحیں رہتی ہیں جو عرفان میں کمال حاصل کر کے اس دُنیا سے گئے ہیں۔ اس کے بعد عالَمِ ھو ہے۔ اس کے طبقات کا فرق متمیّز نہیں ہوتا پھر بھی ہر اگلا قدم پچھلے قدم سے زیادہ لطافت کی طرف لے جاتا ہے۔ یہ ایک نور کا سا میدان ہے جہاں تجلّیاتِ الٰہی کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہے اور ان تجلّیات ہی میں ہر قسم کی لذّتیں اور کوائف موجود ہیں۔ عالَمِ ھو ان بزرگوں کی روحوں کا مسکن ہے جنھوں نے قرآنی آیت وَتَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلًا پر عملِ کامل کیا اور حقیقی معنوں میں دُنیا کی ہر چیز سے تعلقِ قلبی قطع کر کے صرف اللہ کے ہو گئے۔ دراصل جنّتوں کے طبقات عالَمِ لاہوت پر ہی ختم ہوجاتے ہیں۔ ہاہوت اور ھو جنّتوں کے طبقات

نہیں ہیں بلکہ جنّتوں کے طبقات کی روح یا معنوی شکل ہیں۔ سورۂ فرقان کے آخری رکوع میں کہا گیا ہے کہ ''دوزخ بہت ہی بُری جگہ ہے خواہ مستقلاً رہنے کے لیے ہو یا عارضی قیام کے لئے۔'' پھر اس رکوع کے آخر میں ارشاد ہوا ہے کہ ''جنّت بہت اچھی جگہ ہے خواہ مستقلاً رہنے کے لیے ہو یا عارضی طور پر ٹھہرنے کے لئے'' اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ دوزخ سے تو گناہگار عذاب بھگتنے کے بعد جنّت میں چلے جائیں گے۔ لیکن جنّتی جنّت میں عارضی قیام کے بعد کہاں جائیں گے تو وہ اگلے مقامات یہی ہاہوت اور ھو کے طبقات ہیں، یہاں صرف اُنہی بزرگوں کی روحیں رہیں گی اور رہتی ہیں جنہوں نے جیتے جی اللہ کی محبت میں فنا ہو کر اُس کا تقرّب حاصل کر لیا اور جس روح کو جتنا زیادہ تقرّب حاصل ہو گا وہ اتنا ہی عرش کے نزدیک والے طبقے میں رہے گی۔

عالم ھو کے بعد علی الترتیب عدمِ بسیط، نفسِ بسیط، عقلِ بسیط اور پھر روحِ بسیط ہے۔ پھر عرش کبریا اور اُس کے مرکز میں ذاتِ بحت یا وہ حقیقتِ کبریٰ ہے جس کی بابت وہ خود فرماتے ہیں۔

سُبْحَانَ رَبِّکَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا یَصِفُوْنَ (صافات ۱۸۰)

یہی وہ ذات ہے جس میں کوئی صفت موجود نہیں یا باالفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ تمام متضاد صفتیں اِس طرح جمع ہیں کہ اِن میں سے کوئی بھی بالخصوص موجود نہیں کہی جا سکتی۔ مطلب یہ ہے کہ بہ یک وقت سب کچھ موجود ہے اور کچھ بھی نہیں ہے، پھر اِس ذاتِ بحت کی بھی کوئی حدّ و انتہا نہیں ہے۔ ہر طالب اپنی اپنی استعداد کے مطابق دیکھتا اور عرفانِ حقیقت حاصل کرتا ہے اور اِسی میں سب سے آگے کہیں وہ مقام ہے جہاں سرکارِ دو عالم ﷺ بھی بے اختیار پکار اُٹھتے ہیں۔

مَا عَرَفْنَاکَ حقَّ مَعْرِفَتِکَ

مندرجہ بالا بیانات سے آپ اتنا تو سمجھ گئے ہوں گے کہ انسان کی رُوح ایک شعاع کی طرح ہے جس کی چوٹی یعنی پہلا سِرا روحِ بسیط میں ہے، دوسرا انسان کے جسم میں۔ سورۂ ہود میں ارشاد ہوتا ہے کہ کوئی جاندار ایسا نہیں جس کو اللہ اُس کی چوٹی سے پکڑے ہوئے نہ ہو۔

مَا مِنْ دَآبَّۃٍ اِلَّا ھُوَ اٰخِذٌ بِنَاصِیَتِھَا (ھود ۵۶)

اِس چوٹی سے یہی روح کا پہلا سِرا مُراد ہے۔ چونکہ اب ہم یہ بیان کرنے والے ہیں کہ اِس روح کے خواص کیا ہیں اور اِس جسم فانی سے نکلنے کے بعد یہ کس طرح سفرِ آخرت طے کرتی ہے اور یہ مضمون بہت ہی مشکل ہے، اِس لیے آسانی کی خاطر ہم اِس شعاع کے پہلے سرے کو ''الف'' اور دوسرے کو ''جیم'' کہیں گے۔ یہ بیان ہو چکا ہے کہ ''الف'' اور ''جیم'' کے درمیاں ہر روح کا مقامِ محمود ہے جہاں روح وجودِ امری سے وجودِ مثالی اختیار کرتی ہے، اِس مقام کو ''ب'' لکھیں گے، اِس طرح پوری شعاع کا نام ہوا ''اب ج''۔ اب ہم ''اب ج'' کے کچھ خواص بیان کرتے ہیں جس سے بہت سے نادر و نامعلوم نکات واضح ہوں گے اور یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ سفرِ واپسی کس طرح طے ہوتا ہے۔ سلاست و وضاحت کی پوری کوشش کے باوجود ہم جانتے ہیں کہ یہ باتیں اہلِ بصیرت واہلِ عرفان حضرات کے سوا اوروں کی سمجھ میں پوری طرح ہرگز نہ آئیں گی، تاہم جو کچھ لکھا جاتا ہے ابلاغِ علم اور تفکّر کی غرض سے ہے۔

اب روح کے خواص و تاثّرات کا جو کچھ قلیل علم وعرفان اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے ہم کو عنایت فرمایا ہے، اُس کا بیان سنئے:۔

ا۔ روح ایک شعاع ہے، یہ شعاع جب تک اللہ کا حکم یعنی موت نہ آئے ہمیشہ اور ہر وقت ''ا'' سے ''ج'' تک قائم رہتی ہے یعنی کوئی چیز نان کنڈکٹر بن کر اِس کو منقطع نہیں کر سکتی۔

سورہ الفرقان آیت ۴۵ اور ۴۶ میں ارشاد ہوتا ہے۔

اَلَمۡ تَرَ اِلٰی رَبِّکَ کَیۡفَ مَدَّ الظِّلَّ وَلَوۡ شَآءَ لَجَعَلَهٗ سَاکِنًا ثُمَّ جَعَلۡنَا الشَّمۡسَ عَلَیۡهِ دَلِیۡلًا ثُمَّ قَبَضۡنٰهُ اِلَیۡنَا قَبۡضًا یَّسِیۡرًا

یعنی ''کیا تم نے نہیں دیکھا اپنے رب کی طرف کتنی لمبی کر دی ہے ہم نے پرچھائیں، ہم چاہتے تو اِس کو ٹھہرائے رکھتے لیکن پھر ہم نے سورج کو اِس کی دلیل بنایا۔ پھر کھینچ لیا اِس پرچھائیں کو اپنی طرف سہج سہج''۔ علمائے ظاہر نے یہاں ظِلّ سے مُراد مادّی اشیاء کا سایہ لیا ہے جو سورج سے پیدا ہوتا ہے۔ ایسے سایہ کے لیے ضروری ہے کہ سورج پہلے سے موجود ہو، حالانکہ آیت میں پہلے پرچھائیں یا سایہ کو لمبا کرنے کا ذکر اور یہ کہ ''ہم چاہتے تو اِسے وہیں قائم رکھتے'' اِس کے بعد کہا گیا ہے کہ ''پھر ہم نے سورج کو دلیل بنایا اور پرچھائیں کو آہستہ آہستہ اپنی طرف کھینچ لیا'' اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ آیت کا مفہوم کچھ اور رہی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے رسولِ کریمؐ کو یہ دکھانا چاہا ہو کہ انسانی روح کس طرح پیدا ہوتی ہے، چنانچہ کہا دیکھو ہماری طرف، جب رسول اللہؐ نے دیکھا تو اللہ تعالیٰ نے روحِ بسیط کی ایک روحِ مجرّد کو حکم دیا ''ہو''۔ یہ حکم ملتے ہی اِس روح نے شعاع، پرچھائیں یا ظِلّ کی صورت اختیار کی اور بڑھ کر زمین تک آ گئی، لیکن چونکہ اِس کا پیدا کرنا مقصود نہ تھا تو اِس لیے اِس کو آہستہ آہستہ اپنی طرف (یعنی روحِ بسیط میں) کھینچ لیا اور رسول اللہؐ کو فرمایا کہ یہ طریقہ ہے جو ہم نے آپ کو دکھایا، باقی باتیں آپ سورج کی دلیل سے اچھی طرح سمجھ سکتے

ہیں کہ اِس کی شعائیں کس طرح اِس زمین کی مخلوقات کو زندہ رکھتی ہیں واللہ اعلم۔ بہر حال یہ آیت اہلِ بصیرت کے تفکّر کے لیے ایک بڑی نشانی ہے۔

۲۔ یہ شعاع اِس قدر لچکیلی اور سریع السّیر ہے کہ انسان پیدل یا سواری پر چاہے جس رفتار سے حرکت کرے اور جہاں چاہے جائے یہ ہر وقت اِس کے ساتھ رہتی ہے۔

۳۔ ''ا سے ب'' اور ''ب سے ج'' تک اِس شعاع کے ہر ذرّہ میں اس انسان کا ایک پیکرِ مثالی (یا ہمزاد) موجود ہوتا ہے جو ہو بہو اِسی کا ہم شکل ہوتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ ''ج'' سے جس قدر آگے چلو ہر جسم پچھلے جسم سے لطیف تر ہوتا جاتا ہے۔ یہ حقیقت میں ایک ہی جسم کے لاانتہا مثنّٰے ہیں اِن کی بابت نہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ بہت سے جسم ہیں نہ یہ کہ یہ سب ایک ہی جسم ہے۔ الفاظ میں یہ بات سمجھانا بہت ہی دشوار ہے، مندرجہ ذیل مثال سے شاید کچھ سمجھ میں آجائے۔

سینما ہال کا تصوّر کیجئے، ایک طرف آپریٹرز روم ہے، دوسری طرف پردۂ سیمیں اور دونوں کے بیچ میں دو سو فُٹ لمبا ہال۔ آپریٹرز روم میں انجن اور مشینری وغیرہ ہے، ایک چرخی پر فلم چڑھا ہوا ہے جس کے سامنے دیوار میں ایک سوراخ ہے۔ آپریٹر فلم پر پیچھے سے روشنی ڈالتا ہے جو ایک تصویر پر پڑتی ہے۔ اور تصویر روشنی کی شعاعوں پر سوار ہو کر ہال کی خلا میں سے گزرتی اور پردہ پر زیادہ بڑی ہو کر نظر آنے لگتی ہے۔ مثلاً اِس فلم کو روحِ بسیط خیال کیجئے اور اِس تصویر کو جو روشنی کے ذریعہ پردہ تک بھیجی گئی ہے روحِ مجرّد۔ پیچھے سے جو روشنی پڑ رہی ہے اِس کو اللہ تعالیٰ کا نور، ارادہ یا حکم۔ فلم کی سطح سے پردہ تک جو خلا ہے اِس کو عَالمِ مثال اور خود پردہ کو عَالمِ مادّی۔ اب ہمارے ایک سوال کا جواب دیجئے۔ فلم سے پردہ تک جو خلا ہے کیا اِس میں کوئی ذرہ بھی ایسا ہے جہاں وہ تصویر نہ ہو جو فلم پر غیر متحرک ہے اور پردہ پر متحرک یا

جاندار نظر آ رہی ہے اور یہ بھی بتائیے کہ فلم کی تصویر سے پردہ کی تصویر تک کوئی ذرہ بھر جگہ بھی اِن شعاعوں میں ایسی ہے جہاں یہ تصویر موجود نہیں۔ اور بتائیے کہ یہ ایک ہی جسم ہے یا بہت سے۔ مثال یقیناً دوسری باتوں کے لحاظ سے ناقص ہے مگر سمجھانے کے لیے ہمیں اِس سے اچھی اور مثال معلوم نہیں۔ اِس مثال پر غور کریں اور فلم پر جو روشنی ڈالی جاتی ہے اِس کو نورِ خدا فرض کر لیں، تو آپ پر اَللّٰہُ نُورُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْض کا مطلب بھی خوب اچھی طرح واضح ہو جائے گا۔

۴۔ انسان کا دماغ اُس کے حواسِ پنج گانہ، عقل اور تجربہ سے جو علم حاصل کرتا ہے وہ مثالی اجسام کو بھی اُن کی متناسب لطافت کے لحاظ سے منتقل ہوتا رہتا ہے، بصیرت باطنی بھی۔

۵۔ انسان کا قلب جن جذبات سے متاثّر ہوتا ہے وہ مثالی اجسام پر بھی تدریجاً مؤثر ہوتے ہیں۔

۶۔ انسان کا نفس عقائد و اعمال کی وجہ سے جو رنگ پکڑتا ہے وہی رنگ اِن مثالی اجسام پر بھی تدریجاً چڑھتا ہے۔

۷۔ انسان میں نیک یا بد اعمال سے کردار کی جو طاقت یا کمزوری پیدا ہوتی ہے وہ مثالی اجسام میں بھی تدریجاً پیدا ہوتی رہتی ہے۔

۸۔ یہ شعاع انسانی ارادے کی قوّت کے مطابق چشم زدن میں کائنات کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک حرکت کر سکتی ہے۔ اگر یہ شعاع کسی کامِل ولی اللہ کی روح کی ہو تو وہ ولی اللہ اپنی قوّتِ ارادی سے (بحکم اللہ تعالیٰ) اپنے کسی مثالی جسم کو اِس زمین یا کائنات میں (یہ طاقت پر منحصر ہے) جہاں چاہے مجسم طور پر ظاہر کر سکتا ہے یا اپنے اِس جسم مادّی کو جہاں چاہے منتقل کر لیتا ہے۔ یہی وہ راز ہے کہ اکثر اولیاء اللہ ایک ہی وقت میں

مختلف مقامات پر موجود پائے گئے ہیں اور پائے جاتے ہیں۔ جس نے یہ طاقت حاصل کر لی ہے یا جو اِس کا علم رکھتا ہے وہ جانتا ہے کہ سرکار دو عالمؐ کی معراج جسمانی تھی۔

۹۔ خط ''ج ب'' اپنے اوپر والے حصّہ ''ب ا'' کے ذریعہ قضا و قدر کی طرف سے نازل ہونے والے احکامات سے اثر پذیر ہوتا ہے (یہ تقدیر ہے)

تمام عَالمِ مادّی اور عَالمِ مثال میں اپنے اردگرد کے ماحول کا اثر بھی اپنی کمزوری اور طاقت کے لحاظ سے قبول کرتا ہے (یہ حوادثات ہیں)

جسم مادّی سے جو افعال و اعمال سرزد ہوتے ہیں اُن سے بھی متاثّر ہوتا ہے (یہ تدبیر ہے)

۱۰۔ جب تک اس خط کا تعلق نقطہ ''ج'' سے قائم رہتا ہے یہ زندگی کہلاتی ہے جب یہ تعلق ٹوٹ جاتا ہے تو اسی کو موت کہتے ہیں۔

موت اور سفرِ آخرت :

جب حکم قضا صادر ہوتا ہے نقطہ ''ا'' نقطہ ''ب'' کو اور نقطہ ''ب'' نقطہ ''ج'' کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ اس کشش کا فطرتی تقاضہ تو یہ ہوتا ہے کہ ساری شعاع ''ج ب'' سمٹ کر نقطہ ''ب'' یعنی مقامِ محمود میں جمع ہو جائے لیکن ایسا نہیں ہوتا بلکہ نقطہ ''ج'' ایک جھٹکا محسوس کرتا ہے اور شعاع کے تمام مثالی اجسام میں سب سے کثیف ہونے کے سبب سرے سے الگ ہو جاتا ہے یا صحیح الفاظ میں یوں کہئے کہ الگ کر دیا جاتا ہے، اسی کا نام موت ہے۔ اب ''ج'' کے جسم مادّی کے سرے پر سے غائب ہوتے ہی اس کی جگہ وہ جسم مثالی لے لیتا ہے جو ''ج'' کے بالکل متصل تھا، اسی کو ہم مرنے والے کا روحانی جسم کہتے ہیں، ہم اس کو ''د'' کہیں گے۔ اب یہ شعاع نسبتاً ہلکی ہو جانے کی وجہ سے سمٹ کر ناسوت کے پہلے طبقہ میں چلی جاتی ہے۔

اب اگر ''ذ'' بہت بھاری اور کثیف ہے تو سِرا ''ذ'' ناسوت میں مقیم ہو جاتا ہے، لیکن اگر کسی قدر ہلکا ہے تو جتنا یہ ہلکا ہوتا ہے اسی نسبت سے شعاع ''ب'' کی طرف سمٹتی ہے اور نقطہ ''ذ''، ''ب'' کی طرف بڑھتا ہے، یعنی عَالمِ ناسوت کو طے کرتا جاتا ہے۔ اگر شعاع کے ناسوتی حصّہ کے سارے ہی اجسام (ہمزاد) ہلکے ہیں تو یہ ایک دوسرے میں سما کر ایک ہی جسم بن جاتے ہیں۔ اس طرح ناسوتی عَالم میں شعاع کا جو حصہ تھا سب سمٹ جاتا ہے یعنی ناسوت طے ہو جاتا ہے اور ''ذ'' ملکوت یعنی جنّتوں کے طبقۂ اول میں پہنچ جاتا ہے۔ اسی طرح اگر شعاع کے ان حصوں کے مثالی اجسام بھی جو ملکوت، جبروت اور لاہوت وغیرہ میں سے گزرتے ہیں متناسب طور پر ہلکے ہوں تو شعاع اور زیادہ سُکڑ کر جبروت، لاہوت یا اور آگے تک سمٹ جاتی ہے اور ''ذ'' اپنے مقامِ محمود پر پہنچ جاتا ہے، یہی قیامت تک کے لیے سفر آخرت کا اختتام ہے۔ یہ بیان ذرا مشکل ہے اِس لیے یہ بات اب ہم ذرا عام فہم انداز میں لکھتے ہیں۔

جب روح جسم سے نکلتی ہے تو نکیرین اس کو عَالمِ ناسوت کے طبقۂ اول میں اس مقام پر پہنچا دیتے ہیں جہاں سے اس کو سفرِ آخرت شروع کرنا ہے۔ اگر یہ روح ایسے آدمی کی ہے جو عَالمِ آخرت اور اللہ تعالیٰ کی لِقا وغیرہ کا قائل نہ تھا یا سخت گناہگار اور صراط المستقیم سے نابلد محض تھا تو یہ روح وہیں قید ہو جاتی ہے یا عَالمِ ناسوت کے طبقۂ اول ہی میں بھٹکتی پھرتی ہے۔ (دیکھئے بارش کے پانی کی مثال جو پیچھے دی جا چکی ہے)۔ سورۃ الانعام آیت ۳۱ میں ارشاد ہوتا ہے ''تحقیق نقصان اٹھایا انہوں نے جنہوں نے جھٹلایا اللہ کی ملاقات کو، یہاں تک کہ جب آ جائے گی قیامت ان کے پاس اچانک تو کہیں گے افسوس تقصیر کی ہم نے'' اس آیت کے آخری ٹکڑے میں اور سورۂ عنکبوت کی تیرھویں آیت میں اللہ تعالیٰ نے گناہوں کو

بوجھ فرمایا ہے۔ اِس لیے جو روح جتنی زیادہ گناہ گار ہوگی اتنا ہی اس کو چلنا اور آگے بڑھنا مشکل ہوگا۔ ان میں بعض روحیں اس قدر بوجھل بھی ہوں گی جو مطلق چل ہی نہ سکیں گی بلکہ مفلوج یا بیمار کی طرح ایک ہی جگہ پڑی رہیں گی۔ بہرحال یہ اپنے اپنے گناہوں کی مقدار، تعداد اور نوعیت پر منحصر ہے۔ ناسوت کے ابتدائی طبقات میں دہکتی ہوئی آگ اور کھولتے ہوئے پانی کا عذاب بھی ہے، جو روحیں اس عذاب کی مستحق ہیں وہاں پہنچا دی جاتی ہیں۔ برخلاف ازیں جو روحیں ایمانِ محکم، صحیح اعتقادات اور نیک اعمال کی وجہ سے ہلکی پھلکی، لطیف اور طاقتور ہوتی ہیں وہ بجلی جیسی تیزی سے عالَمِ ناسوت یعنی طبقات دوزخ کو طے کر کے تھوڑے ہی عرصہ میں اپنے مقامِ محمود تک پہنچ جاتی ہیں۔ اتقیا، اصفیاء، شہدا اور اولیاء کی ارواح اِس قدر لطیف اور طاقتور ہوتی ہیں کہ چشم زدن میں اپنے مقامِ محمود تک پہنچ جاتی ہیں اور انہیں معلوم بھی نہیں ہوتا کہ کس وقت طبقات دوزخ میں سے گزرے تھے۔ تمام جنّتی ارواح کی سمتِ سفر اللہ ہی کی طرف ہوتی ہے، اِسی واسطے فرمایا ہے۔

اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ (البقرہ:۱۵۶)

اور یوں بھی ارشاد ہوتا ہے

كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ثُمَّ اِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ

یعنی ''ہر نفس کو مَرنا اور ہماری طرف واپس آنا ہے'' اِس میں لفظ ''طرف'' خصوصاً قابلِ توجہ ہے۔ ''طرف'' کے لفظ سے اللہ تعالیٰ نے صرف سمت ظاہر کی ہے یہ نہیں فرمایا کہ ہمارے اندر مل جانا یا سما جانا ہے جیسا کہ بعض صوفیاء اور عوام کہا کرتے ہیں۔ اللہ تعالی نے یہ بھی فرمایا ہے۔

يَآ اَيُّهَا الْاِنْسَانُ اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰى رَبِّكَ كَدْحاً فَمُلَاقِيْهِ (الانشقاق:٦)

''اے انسان تو جو اِس کوشش سے اپنے رب کی طرف چلا جا رہا ہے تو ضرور اِس سے ملے گا'' اور یہ بھی فرمایا ہے کہ۔

لَتَرۡکَبُنَّ طَبَقًا عَنۡ طَبَقٍ (الانشقاق:۱۹)

یعنی ''تم کو چڑھنا ہے (اللہ تعالیٰ کی طرف) طبق طبق کر کے''۔ یہاں طبق طبق سے مراد عاَلمِ مثال کے وہی طبقات ہیں جن کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ ظاہر ہے کہ طبق ہمیشہ ایک دوسرے کے اوپر ہوتے ہیں برابر برابر کے قطعات کو طبق نہیں کہتے۔

یہاں ہم یہ بھی عرض کر دینا چاہتے ہیں کہ اِن بیانات میں جو کچھ کہا گیا ہے اور جو الفاظ اِستعمال ہوئے ہیں مثلاً اوپر نیچے، آگے پیچھے دُور اور نزدیک وغیرہ یہ سب سمجھانے کے لیے ہیں، ورنہ عاَلمِ مثال اور عاَلمِ امر میں اطراف، وقت اور فاصلے کے وہ اندازے ہرگز نہیں جو اس عاَلمِ مادّی میں ہیں، لیکن جو لوگ یہ کہتے ہیں وہاں وقت اور فاصلہ موجود ہی نہیں وہ غلطی پر ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے سورۃ الحج میں فرمایا ہے کہ اللہ کا ایک دن ایک ہزار برس کے برابر ہے۔ اگر وقت اور فاصلے کی مزید حقیقت معلوم کرنی ہو تو ٹائم اور سپیس پر موجودہ زمانہ کی تحقیقات سے جو کتابیں لکھی گئی ہیں وہ پڑھو تم کو معلوم ہو جائے گا کہ وقت اور فاصلے کا جو تصوّر تمہارے ذہن میں ہے اور جسے تم حقیقت سمجھتے ہو وہ تو صرف تمہارے اِن حواس اور قویٰ کی وجہ سے ہے جو تم کو قدرت نے عطا کیے ہیں۔ اگر ایک ہوائی جہاز مشرق سے مغرب کی طرف اِس رفتار سے سفر کرے جس رفتار سے زمین اپنے محور پر گھومتی ہے اور جس وقت وہ روانہ ہو اِس وقت سورج اُفقِ مشرق سے صرف ایک درجہ بلند ہو چکا ہو تو اس جہاز کے لیے چوبیس گھنٹے ہمیشہ ایک ہی وقت رہے گا یعنی سورج ہمیشہ ایک ہی درجہ بلند نظر آتا رہے گا۔ یہی حال فاصلے کا ہے، اگر ہمارے قد موجودہ اوسط سے دس گُنا بڑے ہوتے یا آئندہ ہو جائیں یا ہماری

رفتار موجودہ اوسط رفتار سے بقدر دس گُنا بڑھ جائے تو ہمارے لیے فاصلہ بقدر دس حصے کم ہو جائے گا، یعنی دس میل ایک میل کے برابر ہو جائے گا۔ یہی حال بصارت کا ہے، اِدھر ایک آدمی لندن میں ٹیلی ویژن پر کھڑا ہوا اُدھر وہ کراچی یا بمبئی بلکہ ساری دُنیا میں ہر جگہ کے ٹیلی ویژنوں پر فوراً ہی نظر آئے گا۔ یہی حال آواز کا ہے، اِدھر نیویارک یا برطانیہ کے براڈ کاسٹنگ اسٹیشنوں پر کوئی بولا اُدھر تمام دنیا کے ریڈیو اسٹیشنوں پر اس کی آواز پہنچ گئی۔ ایٹم کی ساخت پر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ بجائے خود ایک نظامِ شمسی ہے جو اس ننھے مُنے معدوم ذرّہ میں پوشیدہ ہے اور اسی قاعدے سے کام کر رہا ہے جس سے آسمانوں میں بڑے بڑے نظام ہائے شمسی کام کرتے ہیں۔ کیا ان چیزوں کے مطالعہ اور ان باتوں پر غور کرنے سے ایک حیّ و قیوم اور قادر و توانا ہستی کا ثبوت نہیں ملتا جو ان سب کو اپنی مرضی کے مطابق چلا رہی ہے۔ لیکن یہ ایمان اُنہی لوگوں کو حاصل ہوتا ہے جو علم حاصل کر کے غور و فکر سے کام لیتے ہیں۔

الحمدللہ کہ عالمِ روحانی کا بیان ختم ہوا۔ اب اُس کے متعلق صرف چار پانچ باتیں اور بیان کرنی ہیں۔ یہ باتیں ان اعتراضات کا جواب ہیں جو متذکرہ صدر بیانات پڑھتے وقت دل میں پیدا ہوئے ہوں گے۔

پہلی بات: یہ ہے کہ جو کچھ لکھا گیا ہے ہم نے اپنے ذاتی کشف و عرفان کی بنا پر لکھا ہے۔ مگر ہمارا یہ دعویٰ نہیں کہ پہلے بزرگ اِن باتوں کو نہیں جانتے تھے۔ بلا شبہ جانتے تھے لیکن مصلحتاً راز میں رکھتے تھے۔ اب زمانہ بدل گیا ہے، علم و اکتشافات کا دَور دَورہ ہے اور سائنس کا یہ عقیدہ کہ مادّہ فنا نہیں ہوتا، ختم ہو کر یہ نظریہ قائم ہو چکا ہے کہ مادّہ ختم ہو کر انرجی میں تبدیل ہو جاتا ہے اور وہیں سے عالمِ مابعد الطبیعات شروع ہوتا ہے۔ اگر سائنسی ترقی کی یہی رفتار رہی

اور نوعِ انسان لڑلڑ کر تباہ نہ ہوگئی تو وہ دن دُور نہیں جب اللہ ''اپنے کام کرنے والے'' بندوں کو ایتھر (ایثر) پر دسترس عطا فرمادے گا۔ ایسا ہوا تو دُنیا ہی بدل جائے گی، انسانی طاقت کا اندازہ ہی نہ رہے گا۔ خاص حالات میں مُردوں کو زندہ کرنا، منٹوں میں ہزار ہا میل کا سفر طے کر لینا اور دوسرے ستاروں میں آنا جانا معمولی بات ہو جائے گا۔ اُس وقت بھی اللہ کا پتہ تو نہ لگ سکے گا لیکن غیبی قوّتوں کا بہت کچھ علم حاصل ہو جائے گا۔ اِس لیے ہم نے مناسب سمجھا کہ اِن میں سے کچھ باتیں قلمبند کر دیں۔ ہم نے جا بجا قرآن کے حوالے اِسی لیے دیئے ہیں کہ صاحبِ فکر اور اہلِ حال حضرات اب اِن زاویوں سے بھی آیاتِ قرآنی پر غور کریں اور زیادہ وضاحت کے ساتھ اِن حقیقتوں کو دیکھ اور بیان کر سکیں جواب تک پردۂ راز میں ہیں۔

دوسری بات: یہ ہے کہ ہم نہ تو اِن باتوں کا عملی ثبوت دے سکتے ہیں نہ منطقی طور پر ثابت کر سکتے ہیں۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ جس کسی کو ''واقعی طلب'' ہو اِسے راستہ بتا دیں۔ رہی کامیابی تو یہ ہر شخص کی اپنی جہد، ظرف، استقلال اور در حقیقت اللہ کے فضل پر منحصر ہے۔

تیسری بات: یہ ہے کہ اِن بیانات سے اکثر حضرات کے دل میں یہ سوال پیدا ہوا ہوگا کہ اہلِ کتاب اور کفّار جو نیک عمل کرتے ہیں اِن کی جزائے خیر اِن کو ملے گی یا نہیں۔ اگر نہیں ملے گی تو یہ اللہ کے عدل کے خلاف ہے اور اگر وہ بھی جنّتوں میں جائیں گے تو پھر اِن میں اور مسلمانوں میں کیا فرق ہوا۔ جواب یہ ہے کہ عالمِ مثال میں ہر پیغمبر کی اُمّت کے لیے الگ الگ منطقے ہیں اور اِن میں سے ہر ایک میں ناسوت سے لے کر ھوتک پورے عوالم موجود ہیں، جہاں اِس اُمّت کے تمام افراد اپنے اپنے اعمال کے مطابق ادنیٰ یا اعلیٰ مقامات میں رہیں گے اور ہر اُمّت کے کفّار اپنے اعمال و اخلاق کے مطابق اپنی دوزخ کے کسی ادنیٰ یا اعلیٰ طبقہ میں جائیں گے۔ دوزخ سے آگے جنّتوں کے عوالم میں داخل نہ ہو سکیں گے۔

مسلمانوں کو دوسری اُمتوں پر یہ فضیلت ہے کہ اسلام چونکہ آخری، مکمّل اور بہترین دین ہے، اِس لیے مسلمانوں کے لیے جو منطقہ ہے اِس کی جنّتیں بھی باقی سب منطقوں سے نعائم و لطائف میں مکمّل اور بہترین ہیں۔

چوتھی بات: یہ ہے کہ اِن بیانات سے یہ خیال بھی پیدا ہوا ہوگا کہ اس طرح تو جو کچھ ہوتا ہے تقدیر سے ہوتا ہے پھر آدمی تدبیر اور عمل کیوں کرے اور یہ کہ اِس کو سزا کیوں دی جائے گی؟ یہ مسئلہ جبر و قدر سے متعلق ہے جو ہمیشہ سے ایک متنازعہ فیہ اور بحث طلب مسئلہ رہا ہے۔ اسلاف اور متقدمین نے اِس پر ہزاروں صفحات تحریر کیے ہیں جن پر رجوع کرنے کی یہاں گنجائش نہیں، اِس لیے ہم صرف چند ایسی موٹی موٹی باتیں لکھتے ہیں جو عوام کی سمجھ میں بھی آ جائیں۔

اِس مسئلہ پر تحقیقی نظر ڈالیں تو تین سوال سامنے آتے ہیں۔

۱۔ جب ہر کام اللہ کی مرضی سے ہوتا ہے تو ہم عمل کیوں کریں؟

۲۔ جب مرنے کے بعد بخشش بھی اللہ ہی کی مرضی پر منحصر ہے تو ہم عبادت کیوں کریں؟

۳۔ جب اللہ تعالیٰ کسی کو کافر ہی پیدا کرتا اور کافر ہی مارتا ہے جیسا کہ اِس نے قرآن کریم میں فرمایا ہے کہ ہم نے کثیر تعداد جنات اور انسانوں کی دوزخ کے لیے پیدا کی ہے تو اِس کو دوزخ میں کیوں ڈالتا ہے، اِس کا کیا قصور ہے؟

اِن سوالات میں سے ہم ہر ایک کا الگ الگ جواب تحریر کرتے ہیں۔

۱۔ پہلے سوال کا جواب

بے شبہ قرآن میں بہت سی آیات ایسی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ کی مرضی کے خلاف کچھ نہیں ہوتا، وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے، لیکن اُسی قرآن میں اُن سے کہیں

زیادہ آیات ایسی بھی ہیں جن میں حکم دیا گیا ہے کہ ''عمل کرو''، ''عمل کرو''، ''عمل صالح کرو'' ''کوشش کرو'' کہ تمہارے لیے سوائے کوشش کے اور کچھ نہیں ہے۔ اِن آیات کا ملا جلا مفہوم بعض آدمی یہ سمجھ بیٹھتے ہیں کہ جو عمل ہم کرتے ہیں وہ بھی اللہ ہی کراتا ہے حتیٰ کہ گناہ بھی۔ مگر بات یوں نہیں بلکہ یوں ہے کہ تم عمل ضرور کرو کہ تمہارے لیے اِس کے سوا چارہ کار نہیں، لیکن اِس بھول میں کبھی مُبتلا نہ ہو کہ تمہارے اعمال کا نتیجہ بھی وہی ہوگا جو تم چاہتے ہو، نہیں بلکہ اُن کا نتیجہ وہی ہوگا جو اللہ چاہتا ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ تم اعمال میں تو مختار ہو لیکن اِن کے نتائج میں مجبور۔ مشاہدہ بھی یہی کہتا ہے کہ ہزاروں آدمی کوئی خاص مقصد حاصل کرنے کے لیے پوری جدوجہد کرتے ہیں لیکن ناکام رہتے ہیں۔ عقل بھی یہی کہتی ہے کہ اگر انسان اپنے اعمال و افعال کے نتائج پر قادر ہوتا تو ہر انسان بادشاہ بننے کی کوشش کرتا اور آج ہر انسان اِس دُنیا میں بادشاہ ہوتا، لیکن ایسا نہیں ہوسکتا کیونکہ اعمال و افعال کے نتائج صرف اللہ تعالیٰ کے قبضۂ قدرت میں ہیں۔ درحقیقت یہ خیال کہ انسان کے تمام بُرے بھلے کام خود اللہ کرتا ہے، اُسی مسئلہ وحدت الوجود یا فلسفہ ویدانت کا پیدا کردہ ہے جس نے ہمارے نام نہاد صوفیوں اور اُن کی بدولت ہمارے عوام کے دماغ میں یہ کافرانہ عقیدہ پیدا کردیا ہے کہ ہر چیز خدا ہے۔ اِس میں شک نہیں کہ بعض انسان خاص کیفیات میں کبھی کبھی ایسے خوارق بھی کر گزرتے ہیں جن پر وہ خود مطلع نہیں ہوتے کہ کیا کر رہے ہیں، مگر ایسے انسان بہت ہی کم اور ایسی کیفیات شاذ و نادر ہی دیکھنے میں آتی ہیں۔ وہ معمولی قسم کے آدمی نہیں بلکہ بہت ہی بلند قسم کے اولیاء اللہ ہوتے ہیں۔ چنانچہ حدیث قدسی ہے کہ ''اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میرا بندہ نوافل میں ہمیشہ میرا قُرب حاصل کرسکتا ہے یہاں تک کہ میں اِس کو دوست رکھتا ہوں، تب میں اُس کے کان، آنکھ، ہاتھ اور زبان بن جاتا ہوں پھر وہ مجھ ہی سے (یعنی میرے ہی

واسطے سے) سُنتا، دیکھتا، بولتا اور پکڑتا ہے''۔ اِس حدیث قدسی سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ مرتبہ ہر انسان کو نہیں بلکہ صرف خاصانِ خدا کو حاصل ہوسکتا ہے۔اب مشاہدہ یہ بتاتا ہے کہ ایسے خاصانِ خدا بھی اِس چودہ سو برس میں صرف گنتی ہی کے ہوئے ہوں گے۔لہٰذا یہ خیال کہ ہر انسان سے جو فعل صادر ہوتا ہے وہ اللہ ہی کا فعل ہوتا ہے، ایک عام عقیدے کی حیثیت سے بالکل غلط اور سخت گمراہ کُن ہے۔

اِس بیان سے اچھی طرح سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ اعمال و افعال کا نتیجہ کسی طرح بھی انسان کے ہاتھ میں نہیں بلکہ اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے، یہی حقیقت ہے اور اِس حقیقت کو قرآن کریم میں بہ اندازِ خاص ظاہر کر کے اللہ نے مسلمانوں پر احسان عظیم فرمایا ہے، کیونکہ اِس تعلیمِ قرآنی کا نفسیاتی فائدہ یہ ہے کہ اگر مسلمان کسی کام میں سخت محنت اور جد و جہد کرنے کے بعد بھی ناکامیاب ہو تو ہمّت نہ ہارے، مایوس نہ ہو اور دل شکستہ ہو کر سُست اعمالی میں مبتلا نہ ہونے پائے بلکہ یہ سمجھ کر خوش اور مطمئن ہو جائے کہ اگر اِس کام کا وہی نتیجہ نکلتا جو میں چاہتا تھا تو وہ میرے لیے سخت مُضر اور نقصان دہ ہوتا اور سوچے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں یہ بھی تو کہا ہے کہ ''بعض باتوں کو تم اپنے لیے اچھّا سمجھتے ہو حالانکہ اللہ تعالیٰ اُن کو تمہارے لیے اچھا نہیں سمجھتا'' اب اگر نفسیاتی نقطۂ نظر سے اِس تعلیم پر غور کیا جائے تو صاف سمجھ میں آ جائے گا کہ انسان کو سرگرمِ عمل رکھنے کے لیے اِس سے بہتر طریقۂ تعلیم ہو ہی نہیں سکتا۔مگر افسوس ہے کہ جب سے ملّتِ اسلامیہ ذہنی پستی میں مبتلا ہوئی ہے، اُس وقت سے ہم ہر ایسی تعلیم کے معنی اُلٹے سمجھنے لگے ہیں جو ہم کو اُبھارنے اور سرگرم عمل رکھنے کے لیے دی گئی ہے، جیسا کہ قبل ازیں ''صبر'' اور ''توکل'' کے معانی کی تشریح میں بیان کیا جا چکا ہے۔

۲۔دوسرے سوال کا جواب:

اِس سوال سے متعلق قرآن میں تین قسم کی آیات ہیں۔ایک وہ جن میں عبادت کا حکم دیا

گیا ہے، دوسری وہ جن میں عبادت گزار بندوں سے بخشش کا وعدہ کیا گیا ہے، تیسری وہ جن کا مطلب یہ ہے کہ ہم جس کو چاہیں گے بخشیں گے چنانچہ آل عمران آیت نمبر ۱۲۹ میں صاف الفاظ میں فرمایا ہے کہ ''اللہ جس کو چاہے بخشے اور جس کو چاہے عذاب کرے'' اب سُست، کاہل اور عبادات کی معمولی تکالیف سے جی چُرانے والوں نے پہلی دو قسم کی آیات کو تو نظر انداز کر دیا، تیسری قسم کی آیات کی آڑ لے کر لگے عبادت سے بچنے کے بہانے تلاش کرنے۔ مومن تو ایسا خیال بھی نہیں کر سکتے۔ لیکن یہ وسوسہ اگر کسی مسلمان کے دل میں آ جائے تو اُسے اتنا تو سوچنا چاہئے کہ میں اگر ''واقعی عبادت'' کروں گا تو اللہ تعالیٰ ہرگز ایسا بے انصاف نہیں کہ اپنا وعدہ پورا نہ فرمائے۔ ہاں اگر معترض کوئی غیر مسلم ہے تو اُس کو ہم بتاتے ہیں سنو! اللہ چونکہ انسان کا خالق ہے وہ اِس کی فطرت اور طبیعت سے اتنا واقف ہے کہ خود انسان بھی واقف نہیں۔ وہ جانتا ہے کہ بہت سے لوگ رسمی عبادت کرتے ہیں جس میں خلوص کا شائبہ بھی نہیں ہوتا۔ بہت سے ریاکار ہوتے ہیں اور اِس لیے عبادت کرتے ہیں کہ متقی، پرہیز گار اور عبادت گزار مشہور ہو کر اہلِ دُنیا سے طرح طرح کے فائدے اُٹھائیں۔ تو ایسے لوگوں کو اللہ ہرگز نہیں بخشے گا گو وہ قیامت کے دن اپنی عبادت کو بطور حُجّت پیش بھی کریں۔ اِس کے علاوہ ایک نفسیاتی نکتہ یہ بھی ہے کہ جو لوگ سچ مچ خلوص سے عبادت کرنے والے ہیں وہ اس آیت کی موجودگی میں اپنی عبادت پر مغرور اور اللہ سے بے نیاز نہ ہو جائیں۔ خوب سمجھ لو کہ اگر یہ آیت نہ ہوتی تو بہت سے لوگوں کے دلوں میں ایک مدت دراز تک عبادت کرنے کے بعد یہ خیال ضرور بیٹھ جاتا کہ ہم نے کافی عبادت کر لی ہے، اب تو اللہ بھی ہم کو دوزخ میں ڈالنے پر قادر نہیں۔ اِس خیال کے جڑ پکڑتے ہی اللہ کا خوف رفتہ رفتہ اُن کے دلوں سے نادانستہ طور پر نکل جاتا اور اُن کی تمام سعادت اور لطافتِ روحانی

آہستہ آہستہ مسخ ہو جاتی۔ ہماری اِس تحریر کا یہ مطلب نہ لے لیا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ بات مصلحتاً کہہ دی ہے ورنہ وہ عابدوں کو دوزخ میں ڈالنے پر قادر ہی نہیں ہے۔ نعوذ باللہ۔ ہم نے تو یہ کہا ہے کہ اللہ حقیقتاً اِس بات پر قادر ہے کہ چاہے تو گناہگاروں کو بخش دے اور عبادت گزاروں کو دوزخ میں ڈال دے اور اِس حقیقت کو ظاہر کرکے اِس نے اپنے عبادت گزار بندوں پر احسان عظیم کیا ہے کہ اِن کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے گمراہی سے محفوظ کر دیا۔

مندرجہ بالا بیان کی مزید وضاحت کے لیے ہم آپ کی توجہ دو غیر مسلم عقائد کی طرف منعطف کراتے ہیں۔ عیسائیت میں کفّارہ کا عقیدہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام مصلوب ہو کر اپنی اُمّت کا کفّارہ ادا کر گئے، اب چاہے کوئی کتنے ہی گناہ کرے مَرنے کے بعد وہ دوزخ میں نہیں جا سکتا۔ اِس عقیدے کا نفسیاتی اثر اِس کے ماننے والے پر کیا پڑ سکتا ہے۔ وہ گناہوں اور بداعمالیوں پر جسارت کرے گا یا اِن سے بچے گا؟ اِس کا فیصلہ آپ خود کر لیں۔ اِسی طرح ہندوؤں میں کرم یعنی اعمال کا عقیدہ ہے یعنی انسان کو اُس کے ہر اچھے فعل کی جزا اور بُرے فعل کی سزا خود بخود ملے گی۔ خدا اِس بات پر مطلق قادر نہیں کہ نیکوں کو سزا دے اور گنہگاروں کو معاف کر دے۔ اِس عقیدے کا نتیجہ بھی یہی ہوتا ہے کہ انسان اللہ سے بے نیاز ہو جاتا ہے، ایسا انسان خدا پرست نہیں رہ سکتا۔ خدا سے تعلق تو اِسی وقت تک رہ سکتا ہے جب تک کہ اِس سے خوف اور توقع دونوں ہی موجود رہیں۔ لیکن متذکرہ صدر دونوں عقیدے نفسیاتی طور پر اللہ سے مکمّل قطع تعلق کا موجب ہوتے ہیں۔ کیا اب بھی آپ اسلامی تعلیم کی خوبی پر شبہ کریں گے؟ یاد رکھئے آپ سے یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ آپ غریب کیوں رہے؟ آپ نے علم کیوں حاصل نہیں کیا؟ آپ سے تو صرف یہ پوچھا جائے گا کہ جب آپ نے بخوشی اسلام قبول کر لیا تھا اور مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتے تھے تو قرآن کے

احکام پر عمل کیوں نہیں کیا؟ جن باتوں سے ہم نے منع کیا تھا وہ کیوں کیں اور جن کے کرنے کا ہم نے حکم دیا تھا وہ کیوں نہیں کیں۔

۳۔ تیسرے سوال کا جواب:

ایسے اعتراضات دل میں اِس لیے پیدا ہوتے ہیں کہ انسان اللہ تعالیٰ کی قدرت کا صحیح اندازہ نہیں کرسکتا۔ وہ اللہ کے مقابلہ میں زیادہ سے زیادہ ایک بادشاہ کی مثال دیتا ہے اور کہتا ہے کہ جب ایک آدمی قصوروار نہیں تو بادشاہ کو کیا حق ہے کہ اِسے سزا دے؟ معترض یہ کبھی نہیں سوچتا کہ بادشاہ تو خود مخلوق، مجبور اور فانی ہے، وہ خلقت میں دوسرے انسانوں کے برابر ہے، اِسے واقعی حق نہیں کہ کسی بے قصور کو سزا دے، لیکن اللہ تو خالق، قادر اور باقی ہے۔ جب کچھ بھی نہیں تھا تو خدا نے اس کائنات کو پیدا کیا، یہ وہی جانتا ہے کہ کیوں؟ لیکن بہرحال اپنی مرضی اور خواہش سے پیدا کیا اور جس طریقے اور ترکیب سے چاہا اور جس نہج پر چاہا اِسی پر پیدا کیا کسی سے مشورہ نہیں لیا، اِسی لیے وہ کسی کے آگے جواب دہ نہیں ہے۔ جہاں تک تجربہ اور مشاہدہ کا تعلق ہے اللہ نے مخلوق کو جوڑے جوڑے اور ایک دوسرے کی ضد پیدا کیا ہے۔ نر مادّہ، گرمی سردی، سختی نرمی، خشکی تری، سفید سیاہ، خوشبو بدبو، تکلیف راحت، رنج و خوشی، صحت و بیماری، طاقت و کمزوری، نیکی و بدی، برائی بھلائی، امیری غریبی، الغرض جس پہلو سے غور کرو اور جس شے کو دیکھو اِس کی ضد موجود ہے اور اصل تو یہ ہے کہ کوئی چیز اپنی ضد کے بغیر مشخّص و معلوم ہو ہی نہیں سکتی۔ جو مچھلی سمندر میں پیدا ہوئی ہو اور اُسے خشکی کی سختی اور دیگر کیفیات سے کبھی واسطہ نہ پڑا ہو، اُس کو پانی کی معرفت کبھی حاصل نہیں ہوسکتی۔ لیکن اگر اُس کو خشکی پر ڈال دیا جائے تب وہ محسوس کرے گی کہ یہ کیفیات کچھ اور ہیں اور اِس طرح اُس کو پانی کا عرفان حاصل ہو جائے گا۔ پس اگر غریبی نہ ہوتی تو امیری کا وجود نہ ہوتا، بدی

نہ ہوتی تو نیکی بھی نہ ہوتی، تکلیف و عذاب نہ ہوتا تو راحت و بخشش بھی نہ ہوتی، کفر نہ ہوتا تو اسلام نہ ہوتا، دوزخ نہ ہوتی تو جنّت بھی نہ ہوتی۔ مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی چیز ایسی ہوتی جس کی ضد نہ ہوتی تو اِس چیز کا وجود مشخّص نہ ہوتا۔ اِس لیے جس نہج پر اللہ نے کائنات کو پیدا کیا ہے اِس پر اعتراض کرنے کا حق صرف اُسی کو ہے جو اس سے بہتر پیدا کر کے دکھا دے۔

ایک کمہار چاک پر کھلونے بنا رہا تھا۔ مٹی کی لُگدی چاک پر رکھ کر اِس نے ایک آدمی بنایا، جب وہ مکمّل ہونے کے قریب آیا تو کمہار کے دل میں آیا کہ اُسے بادشاہ بنائے تو اُس نے اُس کے سر پر تاج بنا دیا اور اُتار کر ایک طرف رکھ دیا۔ اب دوسری لُگدی چاک پر چڑھائی اور ایک آدمی اور بنایا، جب وہ مکمّل ہونے کے قریب آیا تو کمہار نے اِس کے ہاتھ میں کشکول بنا کر اس کو فقیر بنا دیا اور اُتار کر بادشاہ کے برابر رکھ دیا۔ کچھ دیر بعد اُس کا ایک دوست آیا اُس نے بادشاہ اور فقیر کے کھلونے دیکھ کر کہا کیوں بھئی اِس مٹّی میں کیا خوبی تھی کہ تو نے اِس کو بادشاہ اور اِس مٹّی کا کیا قصور تھا کہ اِسے فقیر بنا دیا۔ کمہار نے کہا اچھا آپ کو اعتراض ہے تو لائیے میں بدل دیتا ہوں، چنانچہ دونوں کھلونوں کو توڑ کر جو بادشاہ تھا اِس کو فقیر اور جو پہلے فقیر تھا اِس کو بادشاہ بنا دیا اور پھر دونوں کو زمین پر رکھ دیا۔ اتنے میں ایک دوست اور آیا اُس نے بھی دونوں کھلونوں کو دیکھ کر وہی اعتراض کیا جو پہلے دوست نے کہا تھا، کمہار نے دونوں کھلونے توڑ کر پھر بدل دیئے۔ یعنی بادشاہ کو فقیر اور فقیر کو بادشاہ بنا دیا اور کھلونے پھر ایک طرف رکھ دیئے۔ ایک اور دوست آیا اُس نے بھی وہی اعتراض کیا اور کمہار نے پھر کھلونے بدل دیئے اور دن بھر یوں ہی کرتا رہا۔ آخر بہت دیر بعد اُس کی سمجھ میں آیا کہ اگر میں یونہی ہر ایک کی مرضی کے مطابق کرتا رہوں گا تو کچھ بھی کام نہ ہو سکے گا، چنانچہ آئندہ اِس نے عہد کیا کہ کسی کا بھی کہنا نہ مانے گا اور جو چاہے گا بنائے گا۔ یہ مثال

بالکل نامکمّل ہے کیونکہ یہاں تو مٹّی بھی کمہار کی بنائی ہوئی نہیں۔ اللہ نے تو مٹّی بھی خود ہی بنائی ہے پھر کمہار جان نہیں ڈال سکتا مگر اللہ نے تو جان، روح، نفس اور عقل وحواس بھی خود ہی پیدا کر کے انسانوں کو دیئے ہیں۔ پھر جب کمہار کو خدا کی بنائی ہوئی مٹی پر اتنا اختیار ہے کہ جس مٹی سے چاہے بادشاہ بنائے اور جس سے چاہے فقیر، تو کیا خدا کو اتنا بھی اختیار نہیں۔ دیکھئے سورۃ مومنون آیت نمبر ۷۱ جس میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ''اگر اللہ لوگوں کی خواہش کے مطابق کام کرے تو زمین و آسمان اور اِن کے درمیان جو کچھ ہے سب درہم برہم ہو جائے۔''

اب رہے وہ جِنّ اور آدمی جن کی بابت اللہ فرماتا ہے کہ ہم نے اِن کو بنایا ہی دوزخ کے لیے ہے تو اِن کو دوزخ میں کوئی تکلیف نہ ہوگی۔ وہ وہاں اُسی طرح زندہ اور خوش رہیں گے جیسے آگ کا کیڑا ''سمندر'' آگ میں رہتا ہے۔ اِن کو اِس لیے بنایا گیا ہے کہ سب مسلمان عذاب بھگتنے کے بعد جنّت میں چلے جائیں گے تو دوزخ خالی نہ رہے۔ ظاہر ہے کہ اگر اِن کو بھی تکلیف ہو تو یہ بات اللہ کے عدل کے خلاف ہے۔ قرآن سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ دوزخ میں ہر ایک کو تکلیف نہ ہوگی۔ سورۃ مریم آیت ۷۱ میں ہے کہ ''تم میں سے ہر ایک کو دوزخ میں سے گزرنا ہے یہ تمہارے رب کا اٹل فیصلہ ہے''۔ اب بتایئے وہاں سے تو انبیاء اور اولیاء سب ہی گزریں گے تو کیا اِن کو بھی تکلیف ہوگی؟ ہرگز نہیں۔

اب حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ انسان کو بالکل مجبور کہتے ہیں وہ بھی غلطی پر ہیں اور جو بالکل مختار مانتے ہیں وہ بھی صحیح نہیں کہتے۔ تجربہ اور مشاہدہ تو یہ کہتا ہے کہ انسان جہاں بہت زیادہ مجبور ہے وہاں کسی قدر مختار بھی ہے اور اِسی قدرے قلیل اختیار پر اِس سے قیامت کے دن باز پُرس کی جائے گی۔ ورنہ اگر وہ سو فیصدی مجبور ہوتا تو قیامت کے دن اِس سے باز

پُرس کا کوئی جواز نہ تھا۔ بچہ جس خاندان میں پیدا ہوتا اور جس ماحول میں پرورش پاتا ہے اُس کا ایک خاص اخلاقی، معاشرتی اور معاشی معیار ہوتا ہے۔ اِسی معیار کے مطابق اِس بچے کا کردار بنتا ہے، اِس میں وہ مجبورِ محض ہے۔ اس ماحول اور معیارِ خاندانی کی وجہ سے وہ جیسی کچھ تعلیم حاصل کرتا ہے، جیسے کچھ اخلاق اور ذہنیت اس میں پیدا ہوتی ہے اور جو کچھ ذریعہ معاش وہ اختیار کرتا ہے ان سب میں یقیناً وہ محض مجبور ہے لیکن عقل و تجربہ حاصل کرنے کے بعد جب دو چیزیں اِس کے سامنے آئیں جن میں سے ایک اچھی ہو اور دوسری بُری، ایک مفید ہو دوسری مُضر اور اس کو اِن کی بھلائی برائی اور افادت و مضرت کا علم بھی ہو اور وہ اُن دونوں میں سے ایک کو فی الوقت قبول کرنے کی قدرت بھی رکھتا ہو تو وہ مختار کامل ہے کہ دونوں میں سے جسے چاہے اختیار و قبول کرے۔ اب اگر وہ مُضر اور بُری چیز کو قبول کر لے تو یقیناً یہ اُسی کا قصور ہے، تقدیر کا قصور نہیں ہے۔ جس قدر بھی گناہ ہیں انسان کو اِن کی مُضرتوں کا علم ہے، اگر وہ ایسے گناہ کر کے اپنی صحت یا روحانیت کو خراب کر لے، مفلس ہو جائے، جیل چلا جائے یا پھانسی پائے تو اِس میں تقدیر کا کیا قصور ہے؟

یورپ کے اکثر مصنّفین نے مسلمانوں کے زوال کی یہ وجہ بھی بیان کی ہے کہ وہ تقدیر کو مانتے ہیں۔ لیکن انہوں نے یہ نہیں سوچا کہ جن مسلمانوں نے قرونِ اولیٰ میں ترقی کی تھی وہ ہم سے کہیں زیادہ تقدیر کو مانتے تھے۔ ہاں یہ فرق ضرور ہے کہ وہ تقدیر کو عمل کے ساتھ مانتے تھے، ہم بے عملی کے ساتھ مانتے ہیں۔ وہ مٹھی بھر آدمی لے کر بڑے بڑے دشمنوں سے ٹکرا جاتے تھے، سخت سے سخت تکالیف کو ہنستے ہوئے برداشت کرتے تھے، خوفناک مصائب کو مسکراتے ہوئے خوش آمدید کہتے تھے، کیوں؟ محض اِس لیے کہ وہ تقدیر کو مانتے تھے۔ اُن کو قرآن کی اس آیت پر یقینِ محکم تھا کہ کوئی مصیبت نہیں آتی جو اللہ نے پہلے سے کتاب

(تقدیر) میں نہ لکھ دی ہو (سورہ الحدید آیت ۲۲) مگر اُن کو اللہ کے اس قول پر بھی پورا ایمان تھا کہ "ہر آدمی کی موت کا ایک وقت مقرّر ہے جب وہ وقت آ تا ہے تو ایک ساعت اِدھر ہو سکتی ہے نہ اُدھر" وہ جانتے تھے کہ جو مصیبت آنی ہے وہ آکر رہے گی، مگر موت کا جو وقت مقرّر ہے، اِس سے پہلے کوئی مصیبت ہماری زندگی کو ختم نہ کر سکے گی، اِس لیے وہ کہتے تھے کہ ہم عمل کیوں نہ کرتے رہیں جبکہ قرآن میں اِس قدر تاکید سے عمل کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ مرتے دم تک عمل کرتے اور آگے بڑھتے رہتے تھے۔ برخلاف اُن کے ہم سمجھتے ہیں کہ جو کچھ تقدیر میں ہے وہ تو ہو کر ہی رہے گا پھر ہم عمل کیوں کریں؟ ہم یہ نہیں سوچتے کہ عمل نہ کر کے ہم اللہ کی نافرمانی کے عذاب میں گرفتار ہوتے ہیں اور دن رات تباہ ہوتے چلے جاتے ہیں۔ یاد رکھو! تقدیر کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ اللہ نے جو کچھ لکھ دیا ہے وہ لکھ کر اپنے ہاتھ کاٹ لیے ہیں اور اُس لکھے کو اب مٹا یا بدل نہیں سکتا۔ اللہ یقیناً اس بات پر ہر وقت قادر ہے کہ نظامِ عَالم کو ایک ڈھرے پر باقاعدہ چلانے کے لیے جو کچھ لکھ دیا ہے اِس میں جب چاہے اور جو چاہے تبدیلی بھی کر دے۔ سورہ رعد آیت ۳۹ میں ہے کہ "اللہ جو چاہتا ہے (لوح محفوظ میں سے) مٹا دیتا ہے اور جو چاہتا ہے باقی رکھتا ہے اور اصل کتاب تو اُسی کے پاس ہے"۔

پانچویں بات:

یہ ہے کہ ہمارے بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ عذاب ثواب مرتے ہی شروع ہو جاتا ہے، حالانکہ قرآن کہتا ہے کہ عذاب ثواب قیامت میں حساب کتاب ہونے کے بعد شروع ہوگا۔ اِس کا جواب یہ ہے کہ قرآن میں دونوں طرح کی آیتیں ہیں۔ ایسی جن سے عذاب ثواب کا ہونا بعد از قیامت ظاہر ہوتا ہے اور ایسی بھی جن سے معلوم ہوتا ہے کہ عذاب

ثواب مرتے ہی شروع ہو جائے گا۔ اِسی وجہ سے علمائے دین میں بھی دو گروہ ہیں، لیکن بھاری اکثریت ہمیشہ انہی عُلماء کی رہی ہے جو مرتے ہی عالَمِ برزخ میں عذاب و ثواب کے شروع ہونے پر یقین رکھتے ہیں۔ بظاہر اِن دونوں قسم کی آیتوں کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن میں تضاد بیانی ہے، لیکن امرِ واقعہ یہ ہے کہ قرآن میں مطلق تضاد بیانی نہیں بلکہ جو کچھ کہا گیا لفظ بہ لفظ درست ہے اور کسی تاویل یا لفظی کھینچ تان کی مطلق ضرورت نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جس طرح انسانوں کی بے شمار قوموں میں سے ہر ایک قوم دوسری سے کسی نہ کسی قدر مختلف ہے اِسی طرح مرنے کے بعد اُن کی روحوں میں بھی فرق ہوگا۔ ارواح کے بعض گروہوں میں یہ فرق معمولی ہوگا لیکن بعض میں اتنا زیادہ جتنا کہ زمین و آسمان میں ہے۔ یہ گروہ اپنے احساسات اور علم میں اس قدر مختلف ہوں گے کہ قیامت کے دن بعض کو تو یہ بھی محسوس و معلوم نہ ہوگا کہ مرنے کے بعد اب تک کتنا وقت گزرا اور کیسے گزرا، بعض کو اِن سے کچھ زیادہ احساس و علم ہوگا اور بعض کو بہت زیادہ۔ یوں کہنا چاہیے کہ بعض پر تو بے خبری یا خواب کی سی کیفیت طاری ہوگی، بعض کسی قدر ہوشیار ہوں گے اور بعض بیدار۔ چنانچہ قرآن سے بھی اِس کا ثبوت ملتا ہے، سورہ الاعراف آیت ۳۸ میں دو گروہوں کا ذکر ہے جن میں سے ایک دوسرے کی شکایت کرے گا کہ یارب اِن لوگوں نے ہم کو گمراہ کیا تھا اس لیے اِن کو دُگنا عذاب دے تو اللہ تعالیٰ جواب دے گا کہ ”تم میں سے ہر ایک کو دُگنا ہی عذاب ہو رہا ہے مگر تم جانتے نہیں“۔

اب اگر آپ غور کریں تو یہ کیفیت اِس دُنیا میں بھی پائی جاتی ہے۔ کثیر تعداد انسان ایسی بے خبری اور بے حسی میں زندگی گزارتے ہیں کہ اگر سو برس بھی زندہ رہیں تو انہیں دُنیا بلکہ خود اپنی حالت کا کوئی خاص علم اور احساس نہیں ہوتا کہ زندگی آرام میں گزری یا تکلیف میں۔

اِسی طرح سینکڑوں قومیں ایسی ہیں جنہیں اپنی جہالت، مفلسی اور پسماندگی کا ذرا احساس نہیں۔ غریبوں اور گداگروں کی بستیوں میں جا کر دیکھو، پہننے کو پھٹے کپڑے اور چیتھڑے، رہنے کو ٹوٹی ہوئی جھونپڑیاں، کھانے کو سوکھی روٹیوں کے ٹکڑے مگر پھر بھی اپنی حالت میں مگن ہیں۔ ہنستے بھی ہیں، قہقہے بھی لگاتے ہیں، گاتے بجاتے بھی ہیں اور زندگی کا پورا لطف اُٹھاتے ہیں۔ کیوں؟ اِس لیے کہ اُنہیں اپنی فلاکت اور مفلسی کا علم اور احساس نہیں ہے۔ اگر اِن کو اپنی حالت کا صحیح احساس ہو جائے تو خودکُشی کر کے مر جائیں یا اُمراء کو قتل کر کے اِن کی دولت و محلّات پر قبضہ کر لیں۔ اصل یہ ہے کہ تکلیف و راحت بذاتِ خود کوئی چیز نہیں، صرف اُس علم و احساس کا نام ہے جو مختلف حالات و کوائف کے تقابل سے حاصل ہوتا ہے۔ مشکوٰۃ میں ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اکرمؐ نے فرمایا کہ ''جب اللہ تعالیٰ نے عقل کو پیدا کیا تو اِس کو حکم دیا کھڑی ہو، وہ کھڑی ہوگئی پھر کہا پیچھے ہٹ، وہ پیچھے ہٹ گئی پھر فرمایا بیٹھ، وہ بیٹھ گئی۔ ارشاد ہوا کہ ہم نے تجھ سے بہتر، افضل اور عمدہ کوئی چیز پیدا نہیں کی۔ تیرے ہی سبب سے مواخذہ کرتا ہوں، تیرے ہی سبب سے پہچانا جاتا ہوں، تیرے ہی سبب سے غصّہ کرتا ہوں، تیری ہی وجہ سے ثواب ہے اور تجھ پر ہی عذاب ہے۔'' اِس حدیث سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ہر آدمی کو مرنے کے بعد جو عذاب، ثواب ہوگا وہ اِس کی عقل و سمجھ کے مطابق ہو گا یا دوسرے الفاظ میں یوں کہیئے کہ ہر شخص عذاب ثواب کو اپنی سمجھ کے مطابق محسوس کرے گا۔ اگر آپ کو اِس بارے میں کچھ شک ہے تو رسول اکرمؐ کی دوسری حدیث ملاحظہ فرمائیے جو زیادہ واضح ہے۔ رسول اکرمؐ نے فرمایا کہ ''آدمی نمازی بھی ہوتا ہے، روزہ دار بھی، زکوٰۃ بھی دیتا ہے، حج و عمرہ بھی کرتا ہے، لیکن قیامت کے روز عقل کے مطابق اِس کو جزا سزا دی جائے گی۔''

متذکرہ صدر آیت کو اِن حدیثوں کے ساتھ ملا کر سوچنے سے یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آ جانی چاہئے کہ ہر شخص کو جس طرح دُنیا میں تکلیف و راحت کا احساس اپنے علم و عقل کے مطابق کم یا زیادہ ہوتا ہے اِسی طرح مرنے کے بعد بھی ہوگا۔ مختصر یہ کہ بہت سی روحیں اِس قدر بے حس اور بے خبر ہوں گی کہ جب میدانِ قیامت میں لائی جائیں گی تو کہیں گی۔ ''ہم تو ابھی سوئے تھے'' یا یہ کہ ''ہم تو دُنیا میں صرف ایک ہی دن رہے تھے'' وغیرہ وغیرہ۔ لیکن ایسی روحیں بھی ہوں گی جن کو دُنیا کی زندگی اور موت سے قیامت تک کی زندگی کا علم و احساس بہت زیادہ ہوگا۔ اِنہی کو اللہ نے قرآن میں علم والا کہا ہے کہ ''علم والے جانتے ہیں کہ تم کتنے دن رہے''۔ سرکارِ دو عالمؐ کی ایک حدیث اور بھی ہے جس میں حضورؐ نے فرمایا ہے کہ قیامت میں حساب کتاب کے لحاظ سے تین گروہ ہوں گے۔ ایک وہ جس کا حساب کتاب بالکل نہ ہوگا، دوسرا وہ جس کا آسان ہوگا اور تیسرا وہ جس کا بہت مشکل ہوگا۔ اِس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ نیک اعمال کی وجہ سے اپنے مقامِ محمود یا مقامِ معاد تک پہنچ چکے ہوں گے، اُن کے حساب کتاب کی ضرورت نہ ہوگی۔ جو لوگ قریب ہوں گے اُن کا حساب کتاب آسان ہوگا، لیکن جو لوگ دُور ہوں گے اُن کا حساب کتاب واقعی سخت اور مشکل ہوگا، یعنی جتنا عذاب اعمال کی رُو سے ہونا چاہئے وہ دے کر اُن کو اُن کے مقامِ محمود تک پہنچایا جائے گا۔

قیامت:

اب معلوم ہونا چاہئے کہ قیامت کیا ہے؟ جیسا کہ لفظ قیامت سے ظاہر ہوتا ہے اِس کے معنی ''قیام'' یا ''ٹھہر جانے'' کے ہیں یعنی اِس وقت کائنات کا ذرّہ ذرّہ متحرک ہے (جیسا کہ اب سائنسی اکتشافات سے ثابت ہو گیا ہے) لیکن قیامت کے دن یہ حرکت بند ہو جائے گی اور ہر شے اپنے خالق کے سامنے مودّب اور ساکت و صامت کھڑی ہو جائے گی جیسا

کہ نماز میں قیام کے وقت ہوتا ہے۔ حرکت بند ہو جانے کی وجہ سے چیزوں کی جو شکل و صورت اب نظر آتی ہے، معدوم ہو جائے گی اور جتنے پردے پڑے ہوئے ہیں، اُٹھ جائیں گے اور ہر شخص کو اپنے علم و عقل کے مطابق معلوم ہو جائے گا کہ میرا مقام اور مرتبہ، قُرب اور عرفانِ باری تعالیٰ کے لحاظ سے کیا ہے۔ سورۂ ہود رکوع ۹ میں ہے کہ ''دوزخی دوزخ میں اور جنّتی جنّت میں رہیں گے جب تک یہ زمین و آسمان قائم ہیں''۔ پھر سورہ ابراہیم کی آیت ۴۹ میں ہے ''اِس دن کہ بدلی جاوے یہ زمین اور زمین سے اور یہ آسمان اور آسمان سے'' اِن دونوں آیتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ دوزخی قیامت کے دن تک دوزخ میں اور جنّتی جنّت میں رہیں گے اور قیامت کے دن جب یہ زمین و آسمان بدل دیئے جائیں گے تو اُن کو اِن نئے بدلے ہوئے دوزخوں اور جنّتوں میں جگہ دی جائے گی۔ قرآن میں یہ بھی ہے کہ قیامت میں لوگ اسی جسم کے ساتھ اٹھائے جائیں گے (سورۃ قیامۃ آیت ۳) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کے دن سب لوگوں کو اِن کے اعمال کے مطابق نئی جنّتیں اور دوزخ عطا ہوں گے اور پھر وہ اُنہی اجسام کے ساتھ ہمیشہ اُن میں رہیں گے، بہر حال قیامت کا صحیح علم اللہ اور اللہ کے رسولؐ کو ہے، مگر سورۂ ہود اور سورۂ ابراہیم کی مندرجہ بالا آیات سے اتنا یقیناً ثابت ہوتا ہے کہ عذاب و ثواب مرتے ہی شروع ہو جاتا ہے۔ اتنا بیان کرنے کے بعد اب ہم بتاتے ہیں کہ سلوک سے کیا کچھ حاصل ہوتا ہے۔

سلوک کا ماحصل

پہلا دَور:

۱۔ کسی کامل بزرگ سے بیعت ہونے یا تعلقِ قلبی پیدا کرنے اور پیچھے بتائے ہوئے دس قاعدوں پر اچھی طرح عمل کرنے کے بعد سب سے پہلی چیز یہ حاصل ہوتی ہے کہ طبیعت میں ایک عجیب اطمینان و امتنان اور خوشی پیدا ہو جاتی ہے۔

۲۔ ذوقِ طلب بڑھنے لگتا ہے، نیکیوں کی طرف میلانِ طبع زیادہ ہو جاتا ہے، بُرائیوں سے بچنے کا ارادہ مستقل ہو جاتا ہے۔

۳۔ عبادت میں دل لگتا ہے۔ ذکر میں مزا آنے لگتا ہے اور ایک سرخوشی سی طاری ہونے لگتی ہے۔

۴۔ کسی کسی وقت دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی ہے جس سے بڑا کیف و سرور محسوس ہوتا ہے اور ہر حرکتِ قلب پر بلا ارادہ پاس انفاس جاری ہو جاتا ہے۔ اسی کو قلب کا جاری ہونا کہتے ہیں، اکثر سالکوں کو یہ نہیں ہوتا۔

۵۔ دل میں ایک ہلکا ہلکا سوز یا حرارت پیدا ہو جاتی ہے اور ساتھ ہی یہ کیف و سرور بڑھتے بڑھتے نشہ، سرمستی، بے خودی اور سیہ مستی تک پہنچ جاتا ہے۔ یہی وہ چیز ہے جس کو صوفی شعراء نے اپنے کلام میں شراب کہا ہے اور بعد میں تصوّف سے نابلد شاعروں نے محض تقلیداً اپنے اشعار میں اس کثرت سے باندھا ہے کہ عوام اُس کو یہی دنیاوی شراب سمجھنے لگے

جو حرام ہے۔

اس کیفیت کو جذب بھی کہتے ہیں۔ سالکوں کے لیے یہ اللہ کا بہت بڑا انعام اور نعمت ہے۔ یہ چیز عبادت اور ذکر سے پیدا نہیں ہوتی بلکہ مرشد کی طرف سے عطا ہوتی ہے۔ یہ سرورِ دو عالمؐ کا عطیہ اور امانت ہے اور اِس لیے ملتی ہے کہ اس کے کیف و سرور میں دُنیا کی تمام خرافات نہایت آسانی سے نفی ہو سکتی ہیں اور سالک اس کیف و سرمستی میں ہر قسم کی تکلیف کو بخوشی برداشت بلکہ نظر انداز کرتا ہوا آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ یہ کیفیت غیر مسلم درویشوں مثلاً سادھوؤں اور راہبوں میں بھی پائی جاتی ہے، لیکن اہلِ حال اور صاحبِ نظر جانتے ہیں کہ ایک غیر مسلم کی گرمی اور ایک مومن کی حرارتِ قلبی یا جذب میں کتنا فرق ہوتا ہے۔ وہ نقل ہوتی ہے یہ اصل، وہ پیتل ہوتا ہے یہ سونا۔ یہ دراصل ایک مَرکَب ہے جس پر سوار ہو کر سالک راہِ سلوک کو بہت آسانی سے طے کر سکتا ہے۔ لیکن افسوس کہ آج کل اسی کو سلوک اور بزرگی کا ما حصل سمجھ لیا جاتا ہے۔ جس کے قلب میں یہ پیدا ہو جائے اگر اس کا مرشد یا استاد کامل نہ ہو تو وہ اس مَرکَب پر سوار ہو کر اگلی منازل طے کرنے کی بجائے خود اسی مَرکَب کی تواضع اور پرورش میں مصروف ہو جاتا ہے اور اسی میں مر جاتا ہے۔ بعض قلوب میں حرارت کی بجائے برف جیسی ٹھنڈک پیدا ہو جاتی ہے لیکن سرور و کیف اس میں بھی وہی ہوتا ہے جو حرارت میں۔

جذب کے پیدا ہوتے ہی سالک کو تھوڑا بہت کشف بھی حاصل ہو جاتا ہے اور معمولی قسم کی کرامات بھی سرزد ہونے لگتی ہیں اور اُس میں ایک ایسی مقناطیسی کشش پیدا ہو جاتی ہے کہ لوگ اس کی طرف خواہ مخواہ رجوع ہونے اور اُس کی ہر بات پر لبیک کہنے لگتے ہیں۔ اس رجوعات سے سالک کو بہت سخت نقصان پہنچ سکتا ہے۔ اوّل تو اس کے دل میں غرور

اور کبر پیدا ہو جاتا ہے جو روحانی بلندیوں تک پہنچنے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ دوسرے رجوع ہونے والوں میں عوام بھی ہوتے ہیں اُمراء بھی، مرد بھی ہوتے ہیں عورتیں اور لڑکے بھی اور یہ سب اُس کے ہر حکم پر سرِ تسلیم خم کر دیتے ہیں۔ اُس وقت اگر سر پر مرشدِ کامل کا ہاتھ نہ ہو تو سالک ایسی ایسی نازیبا اور قبیح حرکات کر بیٹھتا ہے کہ یہ دولتِ بیدار اُس سے چھین لی جاتی ہے اور وہ نہ دین کا رہتا ہے نہ دُنیا کا۔ جذب کو مسمریزم یا ہپناٹزم کی قوّت نہ سمجھ لینا، یہ اُن سے ہزار گنا زیادہ لطیف اور پُر اثر ہوتی ہے۔ جو مرشد اپنے مریدوں کو یہ طاقت ان کے اخلاق کی کافی اصلاح ہونے سے پہلے ہی دے دیتے ہیں وہ ان پر عنایت نہیں ظلم کرتے ہیں اور اُن کی تباہی کا باعث ہوتے ہیں۔ یہ طاقت اُس وقت عطا کرنی چاہئے جب مرید میں کافی قوّتِ برداشت پیدا ہو جائے اور وہ مجاہدہ اور تزکیۂ اخلاق میں ایک معیاری مرتبہ حاصل کر لے۔

جذب سے ایک اور نقصان بھی ہوتا ہے، وہ یہ کہ بعض سالکوں کا ظرف اس بارِ عظیم کا متحمل نہیں ہو سکتا اور وہ مسلوب الحواس اور مغلوب العقل ہو جاتے ہیں اور مجذوب کہلاتے ہیں۔ ان لوگوں کی عاقبت تو یقیناً اچھی ہو گی کیوں کہ راہِ خدا ہی میں اُن کا یہ حال ہوتا ہے لیکن دُنیا خراب ہو جاتی ہے جو شرعاً جائز نہیں۔ یہ لوگ نہ صاحبِ ارشاد ہوتے ہیں نہ قابلِ تقلید۔ جاہل عوام ان کو اولیاء اللہ سمجھ کر ہر وقت ان کے گرد جمع رہتے ہیں اور خدا کو بھول کر انہی سے اپنی مرادیں مانگتے ہیں جو شرک ہے۔ اس لحاظ سے مجذوبیت قوم کے لیے ایک نقصان رساں چیز ہے۔ ان تمام باتوں کے پیشِ نظر ایک مرشد کامل کا فرض ہے کہ وہ اپنے مریدوں اور طالبوں کے ظرف پر نگاہ رکھے اور ان کے جذب کو ضروری حد سے آگے نہ بڑھنے دے ورنہ اُس مُرید کے بال بچوں کی خواری اور امت رسول اللہ ﷺ کی ترکِ خدا پرستی کا ذمہ دار ہو گا۔

اگر کسی سالک میں جذب کی کیفیت خطرناک طور پر زیادہ ہونے لگے تو اسے کم کرنے یا روکنے کی ترکیب یہ ہے کہ اس کو دنیاوی کاموں میں مصروف رکھا جائے، اُس کے اذکار کم یا ضرورت پڑے تو عارضی طور پر بالکل بند کردیئے جائیں۔ جذب کی زیادتی اگر اعلیٰ مدارج پر پہنچ کر ہو تو سالک کو تفکّر کی مشق شروع کرا دینی چاہئے۔ جذب جب حدِ اعتدال پر ہوتا ہے تو اس کو بَسط کہتے ہیں اور جب بالکل نہیں رہتا تو اس کو قبض۔ قبض کی کیفیت سالکوں کے لیے قیامت ہوتی ہے۔ لیکن یہ ایک قدرتی بات ہے، ایسا کوئی سالک نہیں ہوسکتا جس کو قبض نہ ہوتا ہو۔ قبض کوئی بُری چیز نہیں، یہ طبع انسانی کا تقاضہ ہے، کوئی سالک بلکہ انسان کبھی ایک کیفیت پر قائم نہیں رہتا، ہر کیفیت تدریجاً بڑھتی یا کم ہوتی رہتی ہے، کبھی ناقابل برداشت طور پر بڑھ جاتی ہے، کبھی بالکل ختم ہوجاتی ہے۔ ہر قبض کے بعد جب بَسط ہوتا ہے تو سالک اپنے آپ کو پہلے سے آگے پاتا ہے۔ رسالتمآبؐ پر بھی قبض طاری ہوتا تھا۔ سورۂ والضحیٰ قبض کے موقع پر ہی نازل ہوئی تھی اور اس میں جو ارشاد ہوا ہے کہ ''تیری ہر آخری یعنی آنے والی حالت گزری ہوئی حالت سے بہتر اور اچھی ہوگی'' اس کا یہی مطلب ہے کہ جب بھی آپ کا قبض ختم ہوگا آپ اپنے آپ کو بَسط کی پہلی حالت سے زیادہ بہتر حالت میں پائیں گے۔ اِس لیے قبض سے ڈرنا اور گھبرانا نہیں چاہئے اور اس کو سَلب نہ سمجھنا چاہئے۔ سَلب تو گناہوں کی وجہ سے اور وہ بھی متواتر اور ارادۃً کرتے رہنے سے ہوتا ہے، اللہ ہر سالک کو اس سے محفوظ رکھے۔

بہر حال قبض اگر طویل اور ناقابلِ برداشت ہو تو اس کو دُور کردینے کی تدابیر یہ ہیں کہ سالک نماز، تلاوت اور خصوصاً تہجد کے نوافل میں زیادہ اہتمام کرے، روزے رکھے، ایسی صحبت میں بیٹھے جہاں اللہ اور رسول کا تذکرہ ہو۔ جنگل، دریا، پہاڑوں اور مرغزاروں کی سیر

کرے، سوز و گداز پیدا کرنے والی کتابیں پڑھے، اگر چشتیہ انداز کی طبیعت رکھتا ہے تو سماع کی محفلوں میں شریک ہو۔

٦۔ جو لوگ نقشبندیہ طریقہ سے ذکر وغیرہ کرتے ہیں اُن کے لطائف مثلاً قلب، روح، سر، خفی، اخفا وغیرہ جاری ہو جاتے ہیں یعنی ذکر کرنے لگتے ہیں یا روشن ہو جاتے ہیں یعنی سالک کو اُن کا نور نظر آنے لگتا ہے مثلاً زرد، سُرخ، سفید، سبز اور سیاہ وغیرہ۔ یہ نور کسی شاغل کو محض جگنو کی طرح نظر آتا ہے، کسی کو چراغ کی طرح اور کسی کو اتنا کہ سارا کمرہ منور ہو جاتا ہے اور کسی کو اتنا کہ آسمان و زمین اس میں غائب ہو جاتے ہیں اور کسی کو مطلق نظر نہیں آتا۔ ان لطائف کا ذکر تصوّف کی کتابوں میں مل سکتا ہے، اِس لیے ہم تفصیل میں نہیں جاتے۔

٧۔ سچے خواب نظر آنے لگتے ہیں۔ کشف القبور ہو جاتا ہے اور بیداری میں روحیں نظر آنے لگتی ہیں۔ یہ بھی اگرچہ ایک نعمت ہے لیکن بہت بڑی آزمائش بھی ہے۔ جذب کی طرح کشف القبور اور رویتِ ارواح میں بھی کئی بڑے خطرے ہیں۔ ایک تو یہ کہ یہ تماشا بہت دلچسپ ہوتا ہے اور اسے چھوڑ کر آگے بڑھنے کو دل ہی نہیں چاہتا۔ دوسرے یہ کہ اکثر سالکوں کے دل میں اس کی وجہ سے کِبر و غرور پیدا ہو جاتا ہے۔ تیسرے یہ کہ اکثر سالک رویتِ ارواح کو ہی انتہائے بزرگی اور مُنتہائے سلوک سمجھ لیتے ہیں۔ ان تینوں باتوں کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اُن تمام اَشغال و اوراد سے دستکش ہو جاتے ہیں جو تکمیل سلوک کے لیے ضروری ہیں۔ وہ یہ سمجھ ہی نہیں سکتے کہ یہ تو سلوک کی الف ب ت ہے، ابھی تو دائرۂ ولایت میں پہلا قدم بھی نہیں رکھا گیا۔ ہم خود کئی ایسے طالبوں کو جانتے ہیں جو اس مقام پر ایسے پھنسے کہ پھر آگے نہ بڑھ سکے اور اپنے اصلی مقصد یعنی حصولِ معرفت و رویتِ باری تعالیٰ سے

محروم ہو گئے۔ اِس لیے طالبان راہِ حق کے فائدہ کی غرض سے عرض کیا جاتا ہے کہ اگر یہ مشاہدات پیش آئیں تو انہیں پرِ پشّہ کے برابر بھی وقعت نہ دو۔ ہو سکے تو بالکل نفی کر دو۔ نہ ہو سکے تو نظر انداز کر کے برابر آگے بڑھتے رہو اور اس وقت تک قدمِ ہمت کو سُست نہ ہونے دو جب تک عدم سے پار نہ ہو جاؤ کہ اصل حقائق کا پتہ عدم سے آگے ہی لگتا ہے۔

جو لوگ مشاہدۂ ارواح کو بہت بڑی چیز سمجھتے ہیں ان کو یاد رکھنا چاہئے کہ آجکل یورپ اور امریکہ میں بیسیوں سپر یچُو ل (Spiritual) سوسائٹیاں ایسی ہیں جہاں مُردہ انسانوں کی روحوں کو بلایا جاتا ہے اور مُجسّم کر کے ان کے رشتہ داروں وغیرہ سے ملایا جاتا ہے۔ اِن روحوں کے فوٹو لیے جاتے ہیں، کئی روحیں دنیا والوں کے لیے پیغامات اور مضامین قلم بند کراتی ہیں۔ ایک روحانی میگزین میں ہم نے ایک ایسے ڈاکٹر کا حال پڑھا جو مر چکا تھا لیکن اس کی روح نے مُجسّم ہو کر ایک بیمار کا آپریشن کیا جو تندرست ہو گیا۔ ناممکن ہے کہ ایسے بیانات جو علی الاعلان اخباروں اور ماہناموں میں شائع ہوتے ہیں از سرتاپا غلط اور جھوٹ ہوں۔ ہمیں یورپ سے آنے والے کئی اعلیٰ درجہ کے تعلیم یافتہ اور ثقہ دوستوں نے بھی بتایا کہ یہ روحانی جلسے انہوں نے خود اپنی آنکھ سے دیکھے ہیں۔ ہم نے خود اوائلِ عنفوان میں ایک ایسا آدمی دیکھا جو گھر بیٹھے بیٹھے دُور دراز مقامات سے ہر وہ چیز جو آپ چاہیں اور جس کی آپ قیمت ادا کر دیں منگوا دیتا تھا۔ ہم نے اس سے دریافت کیا کہ یہ لانے والا جِنّ ہے یا ہمزاد۔ تو اس نے بتایا کہ یہ ایک روح ہے جو عرصہ سے میرے ساتھ رہتی ہے اور مرتے دم تک رہے گی۔ اس واقعہ سے پہلے ہم ان باتوں کو غلط اور جھوٹ سمجھتے تھے لیکن بچشمِ خود دیکھنے کے بعد ہمارے خیالات میں بڑا انقلاب آیا اور ہم نے بھی اس عمل کو حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن اللہ کا فضل شاملِ حال تھا کہ اُس نے ہم کو ان خرافات سے محفوظ رکھا (کیونکہ باوجود

صحیح ہونے کے یہ باتیں واقعی خرافات ہیں) اور اپنے راستہ پر ڈال دیا۔

ہاں تو ہم یہ بتانا چاہتے تھے کہ یورپ و امریکہ میں جو لوگ یہ تماشے دکھاتے ہیں اور میڈیم کہلاتے ہیں، بالکل معمولی آدمی ہوتے ہیں، ولی نہیں ہوتے۔اس سے ثابت ہوتا ہے کہ روحوں کا نظر آنا یا روحوں کو بلانے کی طاقت پیدا ہو جانا معرفت و رویتِ باری تعالیٰ کی کوشش کے مقابلہ میں پرِ کاہ جتنی بھی وقعت نہیں رکھتا اور سلوک وحکمت میں اس کا کوئی خاص درجہ نہیں ہے۔ ہاں انبیاء، اولیاء وغیرہ کی روحوں کی زیارت باعثِ سعادت و برکت ہوتی ہے یا کسی بزرگ کی روح سے فیض پہنچے (دنیاوی فوائد مراد نہیں ہیں) یا علم حاصل ہو تو یہ کام کی بات ہے، لیکن ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا ہے

۸۔ کشف وکرامات کی طاقت آجاتی ہے۔اس دَور میں اگرچہ کشف وکرامات بہت ہی معمولی قسم کی ہوتی ہیں۔لیکن مُبتدی ان کو بھی بہت زیادہ اہمیت دے دیتے ہیں اور بڑی بزرگی سمجھتے ہیں۔ یہ اگرچہ بڑی مبارک نعمت ہے لیکن اللہ کا فضل نہ ہو تو یہ چیز بھی بہت خطرناک ثابت ہوتی ہے۔اکثر سالکوں کو اس سے غرور پیدا ہو جاتا ہے۔یہ غرور نادانستہ طور پر اس طرح دل میں سما جاتا ہے کہ محسوس بھی نہیں ہوتا اور رفتہ رفتہ سالک کی ترقی بند ہو جاتی ہے۔آجکل اسی کو اعلیٰ درجے کی بزرگی سمجھا جاتا ہے اور اس سے آگے بڑھنے کا خیال تک نہیں آتا۔اس دَور میں کشف یہ ہوتا ہے کہ ماضی یا مستقبل کی کچھ باتیں معلوم ہو جاتی ہیں لیکن یہ بات تو بے انتہا غیر اولیاء کو بھی حاصل ہوتی ہے مثلاً نجومی، رمّال، جفار اور ہاتھ دیکھنے والوں کو، اِس لیے اس پر غرور و فخر بیکار ہے۔ یہ چیز حکمت کا ماحصل یا مقصود نہیں ہے بلکہ غور کیا جائے تو راستہ کی رکاوٹ ہے۔مسلمان سالک ان چیزوں کو حاصل کرنے کی کوشش نہیں کرتے، راستہ چلتے خود بخود پیدا ہو جاتی ہیں، مگر غیر مسلم بے انتہا ریاضت اور جد و جہد

سے ان کو حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یوگ کا ماحصل یہی چیزیں ہیں۔ کرامت کو معیارِ ولایت قرار دے لینے سے تین خرابیاں پیدا ہوجاتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ ولی اور یوگی میں تمیز نہیں ہوتی، دوسرے یہ کہ طالب کو ان پر غرور پیدا ہوجانے سے ترقی بند ہوجاتی ہے، تیسرے یہ کہ عوام خدا کو بھول کر کرامت دکھانے والوں کی پرستش میں لگ جاتے ہیں اور یہ خرابی سب سے بڑی اور مسلمانوں کے زوال کی ایک بہت بڑی وجہ بھی ہے۔

اب ایک اعتراض یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ سب طاقت اور غیب کا علم صرف اللہ تعالیٰ ہی کو ہے محمد رسول اللہؐ کو بھی نہیں تو پھر حضورؐ سے معجزے کیوں سرزد ہوئے اور حضورؐ کی پیشین گوئیاں کیوں پوری ہوئیں؟ اور یہی باتیں اولیاء اللہ سے کیوں ظہور میں آئیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ کرامت اور کشف بے شبہہ ولایت کا جزوِ لاینفک ہے، لیکن ہر شخص جو خوارقِ عادات دکھائے یا اگلی پچھلی باتیں بتادے ولی نہیں ہوتا۔ مختصر یہ کہ ''ہر ولی سے خوارق عادات ظہور میں آتی ہیں لیکن ہر وہ شخص جس سے خوارقِ عادات ظہور میں آئیں ولی نہیں ہوتا'' اب اصل اعتراض کا جواب یہ ہے کہ اگرچہ غیب کا علم سوائے اللہ کے اور کسی کو نہیں لیکن کبھی کبھی کسی بات کا علم اللہ تعالیٰ اپنے کسی خاص بندے کو بھی عطا فرمادیتا ہے۔ اسی طرح کبھی کبھی کوئی خرقِ عادت بھی کسی سے صادر کرادیتا ہے تاکہ لوگ اس کی طرف مائل ہوں اور تبلیغِ حق میں مدد ملے۔ کرامت اولیاء اللہ سے ارادتاً صادر نہیں ہوتی بلکہ ایک بے خودی کی حالت میں سرزد ہوجاتی ہے کہ اُن کو خود بھی معلوم نہیں ہوتا کہ ہم کیا کہہ رہے ہیں اور کیا کر رہے ہیں۔

اب رہا رسول اللہؐ کے عَالِمُ الغیب ہونے کا مسئلہ تو اس کے متعلق یہ عرض ہے کہ ایک گروہ تو حضورؐ کو عَالِمُ الغیب مانتا ہے اور دوسرا بالکل انکار کرتا ہے۔ پہلا گروہ کہتا ہے کہ

جب حضورؐ کی ساری پیشین گوئیاں پوری ہوئیں تو تم کس طرح کہہ سکتے ہو کہ حضورؐ عالم الغیب نہیں تھے۔ دوسرا گروہ جواب دیتا ہے کہ جب خود اللہ نے قرآن میں فرمایا ہے کہ ''اے محمدؐ کہہ دو کہ نہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں نہ میں عالم ُالغیب ہوں اور نہ میں فرشتہ ہوں'' (سورہ الانعام آیت ۵۰) تو ہم حضورؐ کو کیسے عالم الغیب مان سکتے ہیں؟ اب بظاہر دونوں فریق حق پر معلوم ہوتے ہیں تو پھر امرِ واقعہ کیا ہے؟ امرِ واقعہ یہ ہے کہ دونوں فریق محض عادتاً صرف ''بحث برائے بحث'' میں مبتلا ہیں ورنہ بات بہت معمولی ہے۔ وہ اس طرح کہ جہاں تک ساری کائنات کے علمِ غیب کا تعلق ہے وہ صرف اللہ ہی کو ہے، یعنی اللہ ہر وقت اس پوری کائنات کے ہر ذرّہ کا علم رکھتا ہے۔ مثلاً وہ یہاں تک جانتا ہے کہ فلاں سیّارے میں اس وقت فلاں کیڑے کو جو سمندر کی تہہ میں یا کسی درخت کے تنے میں موجود ہے، رزق کی ضرورت ہے۔ لیکن رسول اللہؐ کو صرف وہ بات معلوم ہو جاتی تھی جو اللہ تعالیٰ حضورؐ کو بتانا چاہتا تھا یا حضورؐ خود معلوم کرنا چاہتے تھے اور اس کو معلوم کرنے کے لیے اللہ کی طرف رجوع فرماتے تھے۔ قرآن کریم سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے چنانچہ فرماتے ہیں:

عَالِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖ اَحَدًا اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ

(الجن ۲۶، ۲۷)

یعنی ''اللہ غیب کا حال کسی کو بھی نہیں بتاتا مگر کسی برگزیدہ رسول کو۔'' (سورۂ جنّ)

بات اصل یہ ہے کہ اللہ کے لیے غیب کوئی چیز ہی نہیں کیونکہ وہ تو ہر شے کا ہر وقت علم رکھتا ہے، غیب تو بندوں کے لیے ہے۔

اب دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر نجوم و رمل وغیرہ کیا چیز ہیں؟ جواب یہ ہے کہ یہ وہ علوم ہیں جو کسی زمانہ میں اللہ تعالیٰ نے مخلوق کی کار براری کے لیے اپنے برگزیدہ بندوں کو

تعلیم فرمائے تھے لیکن اب چونکہ یہ بھی دوسری تعلیمات کی طرح پوری صحت کے ساتھ باقی نہیں رہے، اس لیے اُن کو ماننا اور اُن پر یقین کرنا منع ہے۔اب یہ محض برائے تفنّن ہیں، کوئی بات صحیح بھی ہو جاتی ہے کوئی غلط۔

یاد رکھیے کہ رسول اکرمؐ سے معجزے کبھی کسی مسلمان نے طلب نہیں کیئے صرف کفّار نے طلب کیے تھے۔ مسلمان تو حضورؐ سے صرف ایمان اور اخلاق کی تعلیم حاصل کرتے اور زندگی کے مسائل حل کراتے تھے۔ اسی طرح اولیاء اللہ سے کرامت بھی کوئی ارادتمند کبھی طلب نہیں کرتا، معجزے اور کرامات ہمیشہ کفّار کو مسلمان بنانے کے لیے صادر ہوتی تھیں کیونکہ کفّار انہی کو معیارِ بزرگی سمجھتے تھے، مگر آج مسلمان بھی کرامات اور خوارقِ عادات کو معیارِ بزرگی جانتے ہیں اور ہر خرقِ عادت دکھانے والے کو بزرگ سمجھ کر گمراہ ہو رہے ہیں۔

۹۔ نویں چیز جو حاصل ہوتی ہے تزکیۂ اخلاق ہے اور حکمت میں فی الحقیقت یہی ایک چیز ہے جو سب سے زیادہ ضروری اور کام کی ہے۔ اگر سالک میں صحیح اخلاقِ حسنہ پیدا نہ ہوں تو جذب، کشف و کرامات اور مشاہدۂ ارواح سب کچھ بجائے فائدے کے انفرادی اور اجتماعی دونوں حیثیتوں سے نقصان دہ ہوتا ہے جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں۔ افسوس کہ تزکیۂ اخلاق جس قدر ضروری ہے اسی قدر آج کل اس سے بے اعتنائی برتی جاتی ہے، چونکہ اس کے بغیر اجتماعی اور قومی ترقی ناممکن ہے اِس لیے ہم اس کا مفصل بیان آگے کریں گے، یہاں صرف یہ سن لو کہ رسول اللہؐ نے فرمایا ہے **بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَكَارِمَ الْاَخْلَاقِ** "یعنی مجھ کو بھیجا ہی گیا ہے اخلاقِ حسنہ کی تکمیل کے لیے" اور پھر سوچو کہ آپ لوگوں نے اخلاقِ حسنہ کی کہاں تک تکمیل کی ہے اگر نہیں کی ہے تو قوم کے زوال پر آنسو بہانا عبث ہے۔

۱۰۔ دسویں شے وصول ہے، جب سالک اوپر بتائے ہوئے قواعد پر کماحقّہٗ عمل کر لیتا

ہےاور اس کے یہ اعمال مقبول ہو جاتے ہیں تو اس کو کوئی ایسی صاف و صریح نشانی دکھائی جاتی ہے جس سے اس کو یقینِ کامِل ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے میری مساعی کو شرف قبولیت عطا فرما دیا ہے اور مجھ کو اپنے اولیاء کے حلقہ میں شامل کرلیا ہے۔ یہ نشانی عام طور پر روحانی مشاہدہ یعنی نیم خوابی کی حالت میں دکھائی جاتی ہے جو کبھی تو بالکل صاف ہوتی ہے اور کبھی تشبیہ یا استعارے کے طور پر۔ مثلاً کسی کو صاف الفاظ میں بتا دیا جاتا ہے کہ آج سے تم ہمارے اولیاء کے حلقے میں داخل کر لیے گئے، کسی کو نظر آتا ہے کہ اس کی تاجپوشی ہوئی ہے، کوئی دیکھتا ہے کہ وہ امام بنا دیا گیا ہے وغیرہ وغیرہ۔ اب دوسرے دور کا حال سنئے:۔

دوسرا دَور:

۱۔ تمام اذکار و مجاہدات اور اعمال میں انہماک اور سعی زیادہ ہو جاتی ہے اور پہلے سے کہیں زیادہ کیف حاصل ہوتا ہے۔

۲۔ عبادت میں حضوری حاصل ہونے لگتی ہے یعنی پہلے تو سالک یہ محسوس کرتا ہے کہ اللہ موجود ہے اور مجھ کو دیکھ رہا ہے، پھر کچھ مدت بعد یوں محسوس کرتا ہے کہ میں اللہ کو دیکھ رہا ہوں۔ یعنی پہلے ایمانِ کامِل کا ادنیٰ اور پھر اعلیٰ درجہ حاصل ہوتا ہے۔

۳۔ جذب اور اس کے تاثرات پہلے سے بہت بڑھ جاتے ہیں لیکن ساتھ ہی ان پر قابو بھی بہت زیادہ ہو جاتا ہے اور وہ ظاہر نہیں ہونے پاتے۔

۴۔ صفاتی تجلّیات نظر آتی ہیں، یہ انوار ہوتے ہیں جو لطائف کے انوار سے مختلف ہوتے ہیں۔

۵۔ عالمِ مثال کی سیر ہونے لگتی ہے یعنی شعاعِ روحانی ناسوت، ملکوت وغیرہ کے جس طبقہ تک لطیف ہوتی جاتی ہے اس طبقے کا نظّارہ دکھائی دیتا ہے۔ یہ مشاہدہ کسی کو کم کسی کو زیادہ

ہوتا ہے اور بعض سالکوں کو بالکل نہیں ہوتا۔ ان میں سے بعض تو اللہ کی یاد اور محبت میں اس درجہ مستغرق ہوتے ہیں کہ کسی اور چیز کے دیکھنے کی فرصت اور استعداد ہی باقی نہیں رہتی اور بعض کی آنکھوں پر اللہ تعالیٰ خود پردہ ڈال دیتا ہے ورنہ وہ ان دلفریب نظّاروں کی سیر ہی میں پھنس کر رہ جائیں، سلوک پورا نہ کر سکیں۔ ایسے سالک بہت مایوس ہوتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ہم کچھ ترقی نہیں کر رہے، مگر وہ یہ نہیں جانتے کہ اللہ کا بڑا کرم ہے کہ انہیں کچھ نظر نہیں آتا۔ ایسے سالکوں کو مایوسی ہونے لگے تو صرف یہ دیکھنا چاہیئے کہ قلب میں سوزِ محبت اور اللہ سے تعلق بڑھ رہا ہے اور اخلاق کی اصلاح ہو رہی ہے یا نہیں۔

۶۔ اعلیٰ قسم کے کشف و کرامات کی طاقت پیدا ہو جاتی ہے لیکن اُس کا ظہور کم ہو جاتا ہے یا پردے میں ہوتا ہے، یعنی اکثر اہلِ دُنیا کو یہ معلوم بھی نہیں ہونے پاتا کہ فلاں کام اس بزرگ کی ہمّت یا دعا سے ہوا ہے اور یہ بہت ہی بڑی فضیلت ہے، آپ خود فیصلہ کر لیں کہ بڑا آدمی وہ ہے جو نیکی کر کے اُسے ظاہر کرتا پھرے یا وہ جو معلوم ہی نہ ہونے دے کہ یہ نیکی اس نے کی ہے۔ اعلیٰ درجے کا کشف یہ ہے کہ لوحِ محفوظ کا لکھا نظر آ سکتا ہے اور اعلیٰ درجے کی کرامات یہ ہیں کہ مادّے پر تصرف حاصل ہو جاتا ہے، مگر سالک کو جس قدر طاقتیں اور اختیار زیادہ ملتا ہے اسی قدر وہ اللہ سے زیادہ ڈرتا اور تسلیم و رضا میں زیادہ پختہ ہوتا جاتا ہے یعنی خود کچھ نہیں کرتا جو اللہ کرے اُسی میں خوش رہتا ہے۔

۷۔ کیفیاتِ فنا اور بقا طاری ہونے لگتی ہیں۔ یہ اس طرح ہوتا ہے کہ عرصۂ دراز تک نفیٔ ماسویٰ اللہ کی مشق کرتے کرتے دن رات میں وقتاً فوقتاً ایک ایسی بے خودی طاری ہوتی ہے جس میں اُس کو اپنے ماحول کا بہت ہی دُھندلا سا احساس رہ جاتا ہے اور ذہن میں اللہ ہی کا خیال باقی ہوتا ہے۔ یہ بے خودی رفتہ رفتہ اس قدر بڑھتی ہے کہ ماحول بلکہ خود اپنے جسم کا

احساس بھی باقی نہیں رہتا مگر وہ اتنا ضرور سمجھتا ہے کہ جو کچھ مجھے محسوس ہو رہا ہے وہ اللہ ہی اللہ ہے، یعنی اسے اگر چہ اپنے جسم کا احساس نہیں ہوتا لیکن اپنی ہستی یا ذات کا احساس ضرور ہوتا ہے۔ یہاں پہنچ کر کئی کیفیتیں اور بھی طاری ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ ماحول اور اس کی اشیاء کی طرف خیال رجوع ہو جاتا ہے اور اپنی ہستی کا احساس کچھ کم ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں وہ بعض اوقات تو یہ دیکھتا ہے کہ تمام اشیاء تسبیح اور سجدے میں مصروف ہیں اور یہ سمجھ بیٹھتا ہے کہ یہ سب مجھ کو سجدہ کر رہی ہیں۔ دوسری کیفیت یہ ہوتی ہے کہ ماحول اور اشیاء کا احساس بالکل نفی ہو کر صرف اللہ کی موجودگی کا احساس باقی رہ جاتا ہے لیکن اپنی ہستی کا کچھ نہ کچھ خیال بھی موجود رہتا ہے۔ ایسی حالت میں وہ اپنے آپ کو کل کا ایک جزو محسوس کرتا ہے۔ تیسری کیفیت یہ ہوتی ہے کہ اللہ کی ہستی اور اپنی ہستی دونوں کے احساسات مدغم ہو جاتے ہیں۔ اس حالت میں وہ یہ سمجھ لیتا ہے کہ بس میں ہی سب کچھ ہوں۔ چوتھی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ اپنی ہستی کا احساس مکمّلاً غائب ہو جاتا ہے اور اللہ کا احساس بھی باقی نہیں رہتا، یعنی نہ احساس کرنے والا رہتا ہے نہ محسوسات، یہ کیفیت مکمّل فنا کی کیفیت ہے۔ پہلی کیفیات ناقص ہیں۔ فنا کی یہ کیفیت پختہ ہونے کے بعد اگر سالک کوشش میں لگا رہے اور یہیں قیام نہ کرے تو وہ اپنی ذات کا پھر احساس کرنے لگتا ہے اور رفتہ رفتہ اللہ تعالیٰ کی ہستی کو الگ اور تمام اشیاء کی اور اپنی ہستی کو الگ محسوس کرتا ہے یا دل کی آنکھوں سے دیکھتا ہے۔ اب اس کو یہ علم حاصل ہوتا ہے کہ اللہ اللہ ہی ہے اور مخلوق مخلوق۔ اللہ خالق، باقی اور قادر ہے اور مخلوق فانی اور مجبور۔ یہ بقاء کی کیفیت ہے اور یہی وہ کیفیت یا حقیقت ہے جس کی بابت حضرت مجدّد الف ثانیؒ نے اپنے مکتوبات میں وحدت الوجود کا بطلان کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ خود ان پر مکشوف ہوئی۔ اگر ان میں سے کوئی کیفیت مستقل ہو جائے تو یہی حال کہلاتی ہے۔ مگر یاد

رکھیئے کہ کوائف ہوں یا حال، ہر وقت طاری نہیں رہتے۔ کیفیت کے تاثرات دیرپا نہیں ہوتے۔ حال سے البتہ جو یقین پیدا ہوتا ہے وہ سالک کے کردار کا جزو بن جاتا ہے اور جب ہوش میں ہو تب بھی باقی رہتا ہے اور اس کے افعال واقوال سے ظاہر ہوتا رہتا ہے۔

۸۔ وَحْدَتُ الْوَجُوْدْ کی کیفیت بیان کردینا بھی بہت ضروری ہے کیونکہ اس کتاب میں ہم نے جابجا اس کا ذکر کیا ہے اور مسلمانوں کے زوال کی بہت بڑی وجہ بتایا ہے۔ سنئے اللہ تعالیٰ قرآن میں فرماتا ہے:

اِلَیْہِ یَصْعَدُ الْکَلِمُ الطَّیِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ یَرْفَعُہٗ (فاطر۱۰)

یعنی ''اللہ تعالیٰ کی طرف چڑھتے ہیں کلماتِ پاکیزہ اور نیک عمل بلند کرتا ہے عمل کرنے والے کو'' گویا یہ ایک قانون ہے کہ پاکیزہ باتیں اوپر کی طرف صعود کرتی ہیں اور نیک عمل عامل کو بلند کرتے رہتے ہیں۔ سائنس نے آج یہ پتہ لگایا ہے کہ جو آواز ایک مرتبہ پیدا ہوگئی ہو وہ فنا نہیں ہوتی، قرآن میں یہ بات چودہ سو برس پہلے بتا دی گئی تھی۔ اعمال کا پتہ ابھی تک سائنس نے نہیں لگایا کہ وہ کس طرح باقی رہتے ہیں، کسی دن یہ بھی ہو جائے گا، لیکن قرآن میں بہت پہلے سے بتایا جاچکا ہے۔ چنانچہ اس آیت کے علاوہ اور بھی بہت سی آیات اسی مضمون کی ہیں مثلاً یہ کہ ''قیامت میں تمہارے اعمال مجسّم تم کو دکھائے جائیں گے'' یا یہ کہ ''جو کوئی مثقال برابر بھی بھلائی یا برائی کرے گا تو وہ اس کو دیکھے گا'' بہرحال یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا۔ ہمارا مقصد اس آیت کے بیان کرنے سے یہ تھا کہ سالک جس قدر اپنے افکار و اوراد اور عبادت واعمال میں ترقی کرتا جاتا ہے، اُسی قدر اس قانون الٰہی کے مطابق اس کی روح (شعاع) درجہ بدرجہ اور طبقہ بہ طبقہ لطیف، مجلّٰی، حسّاس اور بیدار ہوتی جاتی ہے اور جن طبقات تک یہ لطیف اور بیدار ہوتی ہے ان کی کیفیاتِ لطیفہ کا احساس اور ماحول کا علم وعرفان

بھی اس شعاع کے ذریعہ سالک کو ہوتا رہتا ہے، گو ظاہری آنکھوں سے کچھ نظر نہ بھی آئے۔ جب یہ شعاع ہاہوت کے آخر تک مجلّٰی ہو جاتی ہے اور وہ حصّہ بیدار ہونا شروع ہوتا ہے جو عالمِ ھو میں واقع ہے تو عجب عجب کوائف پیش آتے ہیں۔ اس عالم میں چونکہ صور و اشکال کا وجود بالکل نہیں ہوتا اور صفاتی و ذاتی تجلّیات ملی جلی ہیں، اِس لیے جب ان کا علم و عرفان سالک کے دماغ پر پرتو فِگن ہوتا ہے تو اس پر عجیب عجیب کیفیتیں طاری ہوتی ہیں اور عجب عجب کلمات اس کے منہ سے نکل جاتے ہیں۔ یہی وہ مقام ہے جہاں حضرت ابنِ عربیؒ نے وحدت الوجود کا نعرہ لگایا۔ ہوا یہ کہ ابنِ عربیؒ کی روح خلقی استعداد کی وجہ سے ذاتی تجلّیات سے بہت متاثر ہوئی اور چونکہ یہاں صور و اشکال کا وجود نہ تھا، وہ ان تجلّیات کو ذات یعنی سراب کو حقیقت سمجھ بیٹھے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ ”عالم ہی خدا ہے یہ (عالم) تجلّی ہے جس میں وحدت نے اپنے آپ کو نمودار کیا ہے ان تجلّیات میں وحدت کلیۃً گم ہوگئی ہے، لیکن ان کے ماورا وحدت کا کوئی وجود نہیں“ ان الفاظ میں حضرت ابنِ عربیؒ نے اللہ یا اُس کی وحدت کا انکار مطلق نہیں کیا بلکہ صرف یہ ظاہر کیا ہے کہ اشیاء کائنات کے ماورا اللہ کا کہیں وجود نہیں ہے' یہ ان کے عرفان کی غلطی ہے۔ اللہ وہاں بھی ہے جہاں عالمِ مادّی، عالمِ مثال اور عالمِ امر سب ختم ہو جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ ”اس عالم کے بعد عدم ہے اور سالک کو عدم میں اللہ کے تلاش کرنے کی کوشش نہیں کرنی چاہئے کیونکہ وہاں سوائے رنج و تعب کے اور کچھ حاصل نہیں ہوتا۔“

یہ بات بھی انھوں نے صرف اپنے ذاتی تجربہ کی بنا پر لکھی ہے حالانکہ لطائف کے اصلی عوالم تو شروع ہی عدم سے ہوتے ہیں جیسا کہ ہم پیچھے بیان کر آئے ہیں۔ یہ بات انھوں نے اِس لیے فرمائی کہ جب وہ ”ھو“ کو طے کرنے کے بعد عدم میں داخل ہوئے تو وہاں

انہیں کچھ بھی محسوس نہ ہوا یا یوں کہیے کہ ان کو عدم کی ''تجلّیاتِ منفی'' کا عرفان نہ ہو سکا تو انہوں نے ہمت ہار دی اور اپنا سفر ختم کر دیا۔ اگر وہ عدم کی صعوبات پر صبر کرتے اور اس کو طے کر کے بسائط کے عوالم میں پہنچ جاتے تو اس غلطی میں مبتلا نہ ہوتے۔ اس قسم کی بہت باتیں انہوں نے فتوحاتِ مکیہ اور فصوص الحکم میں تحریر فرمائی ہیں لیکن اِن باتوں سے اُن پر کفر کا الزام عائد نہیں ہوتا بلکہ اس کو محض عرفانی غلط فہمی کہا جا سکتا ہے۔

حضرت ابنِ عربیؒ سے پہلے بھی ایسے کلمات کئی بزرگوں کے منہ سے بحالت سُکر نکلے، لیکن بعد میں انہوں نے ان کی تسلّی بخش تشریح کر دی، اِس لیے زیادہ چرچا نہ ہوا۔ لیکن حضرت ابنِ عربیؒ نے جس بات کو حق جانا تھا ایک ضخیم کتاب میں اپنی پوری علمی طاقت و لیاقت سے تحریر کر دیا۔ زیادہ غلطی ان صوفیاء کی ہے جو حضرت ابن عربیؒ کے بعد پیدا ہوئے۔ ان میں سے صرف چند ایسے تھے جن پر حضرت ابنِ عربیؒ کے مماثل کوائف طاری ہوئے، انہوں نے آنکھ بند کر کے حضرت ابنِ عربیؒ کے اقوال کی تائید کر دی، لیکن زیادہ صوفی ایسے گزرے ہیں اور اب بھی موجود ہیں جن پر نہ تو کبھی یہ کوائف طاری ہوئے نہ وہ ان مقامات تک پہنچے بلکہ صرف حضرت ابنِ عربیؒ اور ان کے مؤیّدین و مصدقین کے تتبع میں ہمہ اوست کے قائل ہیں اور ان حضرات کے بے شمار مرید اور معتقد جن میں بہت سے تو بالکل ہی بے علم ہوتے ہیں، اپنے پیشواؤں کی اندھی تقلید میں یہ سمجھتے ہیں کہ ''ہر چیز خدا ہے'' نعوذ باللہ۔ تعجب تو یہ ہے کہ یہ لوگ قرآن کی طرف کیوں نہیں لوٹتے جو پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ بادشاہی صرف اللہ ہی کے لیے ہے، صرف وہی اس تمام کائنات کا خالق اور اس کی ہر شے پر ہر لحاظ سے قادر ہے۔

قُلِ اللّٰہُ خَالِقُ کُلِّ شَیْءٍ وَّھُوَ الْوَاحِدُ الْقَھَّارُ (الرعد ۱۶)

عوام میں اس عقیدے کی اشاعت کا ایک اور بڑا سبب اکبر بادشاہ کی بے دینی اور اُس کے ایجاد کردہ مذہب ''دینِ الٰہی'' کی تبلیغ بھی ہے۔ کون نہیں جانتا کہ اکبر نے یہ مذہب سیاسی مصلحتوں سے اِس لیے جاری کیا تھا کہ اس کی غیر مسلم رعایا جو تعداد میں مسلمانوں سے کہیں زیادہ تھی، اس سے خوش اور راضی رہے۔ دینِ الٰہی کے سب سے بڑے داعی دربار اکبری کے ارکان خصوصاً ابوالفضل اور فیضی جیسے جیّد عالم تھے جو منطق اور فلسفہ میں دُور دُور تک اپنی نظیر نہ رکھتے تھے۔ ان کی سحر نگاری کے کئی نتیجے نکلے۔ ایک یہ کہ اکبر نے خوش ہو کر ان کو اعزاز و مراتب کے آسمان پر پہنچا دیا۔ دوسرے یہ کہ غیر مسلم خوش ہو گئے کہ مسلمانوں میں بھی روحانیت کا آخری عقیدہ وہی ہے جو ہمارے مذہب میں ہے اور ان پر جو توحید اسلامی کی فضیلت کا رعب طاری تھا جاتا رہا۔ تیسرے یہ کہ خود مسلمان بھی یہی سمجھنے لگے کہ توحید صرف ہمارے ہاں ہی نہیں، دوسرے مذاہب میں بھی ہے اور ان کے ذہن میں اپنی فضیلت کا جو احساس تھا ختم ہو گیا۔ چوتھے یہ کہ اکثر مسلمان علماء اور عوام بادشاہ اور اُمراء کی خوشنودی کے لیے ''ہمہ اوست'' کا دم بھرنے لگے۔ یہاں تک کہ دو چار نسلیں گزرنے پر ''اسلامی تصوّف'' میں اس عقیدے کو وہی درجہ حاصل ہو گیا جو مذہب ''اسلام'' میں کبھی ''توحید'' کو حاصل تھا اور آج جس تصوّف زدہ کو دیکھو وہ یہی کہتا ہے کہ کفر و اسلام میں فرق ہی کچھ نہیں۔

الغرض جس قدر نقصان مسلمانوں کو وحدت الوجود کے عقیدے سے پہنچا ہے اور کسی چیز سے نہیں پہنچا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے تمام عقائد کی بُنیاد توحید ہے اور یہ عقیدہ براہِ راست توحید کے عقیدہ پر ضرب لگاتا ہے۔ مزہ یہ ہے کہ یہ لوگ جو ہر ذرّے کو خدا مانتے ہیں، مؤحِدّ ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ عوام کو یہ باتیں اچھی طرح معلوم نہیں لیکن جو آدمی اس قسم

کے صوفیوں کی صحبت میں رہا ہو وہ جانتا ہے کہ ان کے عقائد کیا ہیں۔ چنانچہ تصوّف کی ایک کتاب میں لکھا ہے کہ ایک دفعہ چند بزرگوں نے کہا کہ ہم نے آج تک کوئی موحدِ کامل نہیں دیکھا۔ فیصلہ ہوا کہ چلو کسی موحدِ کامل کو تلاش کریں، چنانچہ چار بزرگ ایسے موحِدّ کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے اور دنیا کا گوشہ گوشہ چھان مارا۔ برسوں کی تلاش کے بعد جب مایوس ہو کر واپس لوٹ رہے تھے تو انہوں نے بیابان میں ایک شخص کو دیکھا کہ مادر زاد ننگا ایک جگہ بیٹھا ہے اور اس کے پاس اسبابِ دنیوی میں سے کوئی شے موجود نہیں ہے۔ کشف سے پتہ لگایا تو معلوم ہوا کہ موحد کامل ہے۔ چنانچہ سب اس کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مودّب کھڑے ہو گئے۔ فقیر نے آنکھ اٹھا کر دیکھا اور پوچھا کیا چاہتے ہو؟ ایک بزرگ نے جواباً کہا کہ ہم معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ کامل توحید کیا ہے؟ فقیر نے کہا ایک پیالہ لاؤ، چنانچہ پیالہ پیش کیا گیا۔ فقیر نے اس پیالہ میں پیشاب کیا اور اس کو پی گیا اور کہا ''یہ ہے توحیدِ کامل'' استغفر اللہ، یہ حرکت تو کافرِ مطلق بھی نہیں کرتے، لیکن ہمہ اوست والے ان باتوں پر ایمانِ کامل رکھتے ہیں۔ کسی کتاب میں یہ واقعہ بھی ہم نے پڑھا کہ ایک دفعہ حضرت مولانا شاہ عبدالعزیزؒ دہلی کی جامع مسجد سے جمعہ کی نماز پڑھ کر واپس گھر جا رہے تھے، جب مسجد کی پشت پر پہنچے تو دیکھا کہ سڑک کے کنارے ایک ''مجذوب'' بالکل ننگا بیٹھا ہے۔ اتفاقاً مولانا کی نظر اس پر پڑ گئی تو ان کے منہ سے بے اختیار نکلا ''استغفر اللہ'' مجذوب نے چیخ کر کہا ''مولوی یہ تیرے اللہ کا الف ہے اس سے کیوں چِڑتا ہے'' توبہ توبہ (نقل کفر کفر نہ باشد)۔ اسی طرح کے ہزار ہا قصے مشہور اور کتابوں میں درج ہیں اور ہمارے نام نہاد صوفی ان کو پڑھ کر لُطف اندوز ہوتے ہیں۔ چنانچہ ایک اور قصّہ ہم نے کسی کتاب غالباً حضرت عبدالعزیز دباغ کی اَلْاِبْرِیْزُ میں پڑھا کہ دو ولی اللہ آپس میں بہت دوست تھے۔ اتفاق سے ایک کو سفر

درپیش ہوا، فکر ہوا کہ بیوی اکیلی ہے اس کا نگراں کون ہو۔ اپنے ولی دوست کی طرف خیال گیا کہ اس سے بہتر دیکھ بھال کرنے والا کون ہوسکتا ہے، چنانچہ بیوی کو اس کے سپُرد کر کے سفر پر روانہ ہوئے۔ کئی سال بعد جب واپس آئے تو دیکھا کہ بیوی کی گود میں ایک بچہ ہے، پوچھا یہ کہاں سے آیا؟ جواب ملا کہ آپ کے اسی دوست کا ہے جس کے سپُرد آپ مجھ کو کر گئے تھے۔ بہت رنجیدہ ہوئے، دوست کے پاس گئے اور پوچھا کہ یہ کیا خیانت تم نے کی؟ جواب ملا کہ میں نے کیا بُرا کیا، تو بھی خدا، میں بھی خدا، وہ عورت بھی خدا۔ خاوند غریب چپ ہو کر بیٹھ گیا کیونکہ وہ خود بھی ہمہ اوست کا قائل تھا۔ الغرض ایسے ایسے ہزار قصے مشہور ہیں۔

ان کے علاوہ نظم میں تو ہزاروں شعر اُردو اور فارسی کے اس مضمون پر ملیں گے۔ صرف انہی شعراء کے نہیں جو تصوُّف سے نابلد محض ہیں اور صرف کتابوں میں پڑھ کر یہ مضمون نئے نئے انداز سے باندھتے ہیں بلکہ ان شعراء کے بھی جو خود بڑے صوفی مشہور تھے۔ ایسے شعر نقل کیے جائیں تو کئی دفتر درکار ہیں، اِس لیے نمونۃً دو تین شعر اور مصرعے لکھے جاتے ہیں۔ ایک صاحب فرماتے ہیں

ہیں ایک ہی شے گبر و مسلمان دونوں
ایک ہی خوانِ کرم پر ہیں مہماں دونوں

ایک مشہور شعر ہے جس پر صوفیاء کو بہت حال آتا ہے

خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گلِ کوزہ
خود برسرِ آں کوزہ خریدار بر آمد

غالب صاحب فرماتے ہیں

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن
ہم کو تقلید تنک ظرفیِ منصور نہیں

ایک شعر کا صرف ایک ہی مصرعہ یاد ہے

ہر جا ترا جلوہ ہے کعبہ ہو کہ بُت خانہ

ایک بہت مشہور صوفی شاعر فرماتے ہیں

خدا خدا نہ سہی رام رام کر لیں گے

وغیرہ وغیرہ۔ ایسے اشعار کا جو کچھ اثر جہلاء پر پڑتا ہے اس کا اندازہ ان کے اعمال اور عقائد ہی سے لگایا جا سکتا ہے۔

باخبر اولیاء کرام نے یہ بات سمجھانے کی بہت کوشش کی ہے کہ وحدت الوجود حقیقت نہیں بلکہ صرف ایک کیفیت ہے، آنی اور فانی۔ اِس لیے جن لوگوں پر یہ کیفیت طاری نہ ہو بلکہ وہ صرف کتابوں میں اس کا حال پڑھیں تو ان کو لازم ہے کہ اس پر یقین نہ کریں اور تعیّنات کی پوری نگہداشت رکھیں اور فرقِ مراتب کو کبھی نظر انداز نہ ہونے دیں ورنہ دل میں کفر بیٹھ جائے گا۔ لیکن جب تک یہ کیفیت طاری نہ ہو اور اس کے بعد سالک آگے کا راستہ طے کر کے حقیقت نہ معلوم کر لے اصل بات سمجھ میں آ ہی نہیں سکتی۔ اِس لیے جو لوگ سلوک کی الف بے تے بھی نہیں جانتے وہ کس طرح سمجھ سکتے ہیں کہ وحدت الوجود کا جو بیان حضرت محی الدین عربیؒ یا دیگر اکابر اولیاء نے کیا ہے اُس سے اُن کی مراد کیا ہے۔ حضرت ابنِ عربیؒ اتنے بلند مرتبہ بزرگ تھے کہ ان کے بعد عرصۂ دراز تک کسی کو ہمت ہی نہ پڑی کہ وحدت الوجود کے خلاف کچھ کھل کر کہتا یا لکھتا۔ یہ سعادت صرف ہمارے پیشوا جناب شیخ احمد مجدّد الفِ ثانیؒ کے نصیب میں تھی کہ آپ نے بہت پُر زور طریقے سے اس عقیدے کی تکذیب کی۔ جس کا اثر یہ ہوا کہ کفر والحاد کا جو غبار اکبری تُرکتاز کی وجہ سے دنیائے اسلام پر چھا گیا تھا بہت کچھ چھَٹ گیا، لیکن افسوس کہ بعد میں کسی نے اس زور شور سے مجدّد صاحب

کی تائید نہیں کی۔ چنانچہ آج پھر وہی عقائد مسلمانوں کے دین و ایمان کو تاخت و تاراج کر رہے ہیں اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو توفیق دے کہ صحیح اور خالص توحید کو مانے۔

قوم کی جہالت کا یہ عالم ہے کہ آج قرآن کے مقابلہ میں شعراء کے کلام اور صوفیاء کے اقوال کو بطور سند پیش کیا جاتا ہے۔ یاد رکھیئے وحی کے مقابلہ میں اولیاء کا کلام بھی رد کیا جاسکتا ہے شعراء کا تو ذکر ہی کیا؟۔ موٹی عقل کی بات ہے کہ اگر کفر و اسلام میں فرق ہی کچھ نہیں تو اللہ تعالیٰ کو قرآن کریم نازل کرنے اور حضور محمد مصطفیٰ ؐ کو مبعوث فرمانے کی ضرورت کیا تھی؟

ہم اوپر لکھ چکے ہیں اور ایک مرتبہ پھر لکھتے ہیں کہ وحدت الوجود کی کیفیت مقام ھُو میں طاری ہوتی ہے جو بہت ہی بلند مقام ہے، یہاں صور و اشکال یعنی تعیّنات غائب ہو جاتے ہیں اور نا قابلِ بیان لطف و سرور حاصل ہوتا ہے۔ اِس لیے بہت سے سالک یہاں سے آگے بڑھ کر اگلے طبقہ یعنی عدم میں جانے اور وہاں کی صعوبات میں مبتلا ہونے کو پسند نہیں کرتے یا کوئی راہبر میسر نہیں آتا، اِس لیے وہ یہیں مقام کر لیتے ہیں اور اس ''کیفیت'' کو ''حقیقت'' سمجھ بیٹھتے ہیں۔ اگر کوئی سالک ''ھُو'' کے کوائف اور لذائذ کی نفی کر کے عدم میں داخل ہو جائے اور مجاہدہ جاری رکھے تو عدم کے خاتمہ پر جب وہ نفس بسیط کے عالم میں داخل ہوگا، اس کو اپنی روح اس شعاع یعنی پرچھائیں یا ظِلّ کی شکل میں نظر آئے گی جس کا ذکر ہم پیچھے کر چکے ہیں۔ یہاں سالک یہ سمجھنے لگے گا کہ وہ ذات کا سایہ یا ظِلّ ہے۔ لیکن اگر وہ سلوک جاری رکھے اور اس کی روح مجرّد اپنا عرفانِ کامل حاصل کر لے تو اس پر یہ حقیقت روشن ہو جائے گی کہ وہ اور باقی سب کچھ عبدِ محض اور مخلوق ہے۔ حضرت مجدّد الفِ ثانیؒ پر بھی یہی کیفیت طاری ہوئی تھی، چنانچہ آپ نے پہلے کچھ عرصہ تک انسان کو اللہ کا ظِلّ خیال کیا۔

لیکن جب آخری نقطے تک سلوک طے کر لیا تو پھر آپ علی الاعلان یہی فرماتے تھے کہ انسان اور باقی تمام مخلوقات عبد محض ہے اس کے سوا اور کچھ نہیں۔ شاید اہلِ علم حضرات کی سمجھ میں اب کچھ حقیقت آ گئی ہو کہ وحدت الوجود کیا ہے۔ ہم اس سے زیادہ وضاحت سے لکھنے اور بیان کرنے کی قدرت نہیں رکھتے۔

۹۔ تجلّیاتِ ذاتی:

ان کی ابتدا لاہوت سے ہوتی ہے۔ یہ انوار نہیں بلکہ معنوی تجلّیات ہیں، انکے ورود سے سالک کو ان تمام باتوں کا عرفان ہونے لگتا ہے جو عقل سے کسی طرح بھی سمجھ میں نہیں آ سکتیں۔

۱۰۔ تزکیۂ اخلاق:

اب سالک کا اخلاق اس قدر مزکّٰی ہو جاتا ہے کہ بال برابر نقائص بھی اس کو محسوس ہونے اور ناگوار گزرنے لگتے ہیں اور وہ اُن کی اصلاح کرتا رہتا ہے۔ اس کے بعد انسان کے لیے خدمتِ خلق کے سوا اور کوئی کام باقی نہیں رہتا۔ یہ ولایتِ کبریٰ اور کمالِ انسانیت کی ابتدا ہے۔

تیسرا دَور:

دوسرے دَور میں سالک جو کچھ دیکھتا اور حاصل کرتا ہے اس دَور میں اس کا عرفان حاصل ہو جاتا ہے، ان بزرگوں کو عارف کہتے ہیں۔ ان سے کرامتیں بہت کم یا پردے میں صادر ہوتی ہیں، یہ لوگ ارشاد و اصلاح میں زیادہ وقت صرف کرتے ہیں، یہ کمالِ انسانیت کا عروج ہے۔ اہلِ تصوّف کا جو ایک مشہور مقولہ ہے کہ ذکر سے جنت اور فکر سے اللہ ملتا ہے، اس کے معنی اسی دَور کے آخر میں سمجھ میں آتے ہیں۔

چوتھا دَور:

جو کچھ تیسرے دَور میں حاصل ہوا ہے اس دَور میں اس کی حقیقت آشکار ہو جاتی ہے۔ یہ بزرگ محققین کہلاتے ہیں۔ یہ سوائے خدمتِ خلق یعنی ارشاد و اصلاح کے اور کچھ نہیں کرتے۔

یہ تھا سلوک و حکمت کا بیان جو الحمد للہ ختم ہو گیا۔ اب ہم عبادات کا بیان کریں گے لیکن اس سے قبل یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں سلوک اور معرفت و حکمت کی افادیت کے متعلق خود ہمارا جو خیال ہے وہ بھی ظاہر کر دیا جائے۔

اس میں شک نہیں کہ ''حکمت'' اشرف اور افضل ترین علم ہے۔ اس سے حقیقت الاشیاء معلوم ہو جاتی ہے، بڑے بڑے اسرار ظاہر ہوتے ہیں، عقلِ سلیم اور فراستِ کاملہ پیدا ہوتی ہے، روحیں نظر آنے لگتی ہیں، رسول اکرمؐ اور دوسرے انبیائے عظام کی زیارت میسّر آتی ہے، عالمِ مثال کی سیر اور انوار و تجلّیات کا نظّارہ ہوتا ہے، کشف و کرامات کی طاقت حاصل ہو جاتی ہے، مادّہ پر تصرّف حاصل ہو جاتا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ خود حضرت احدیّت کی معرفت اور حضوری سے انسان مشرّف ہوتا ہے۔ لیکن ہمارے نزدیک یہ سب کچھ مل جانے کے باوجود بھی اگر کوئی عارف دین و دُنیا میں امتِ محمّدیہ کی اجتماعی ترقی اور کامیابی کے لیے کچھ نہ کرے تو وہ اپنی ذات کے لیے سب کچھ ہوتے ہوئے بھی مِلّتِ اسلامیہ کے لیے بیکار ہے۔ مِلّت کو آج ایسے بزرگوں کی ہرگز ضرورت نہیں جو تعویذ گنڈوں اور دم درود سے کچھ مریضوں کو تندرست کر دیں یا چند غریب ان کی دعا سے امیر کبیر بن جائیں یا کچھ لوگ مقدمے جیت جائیں یا چند بے اولادوں کے اولاد پیدا ہو جائے یا کچھ

کفّار و مشرکین مسلمان ہو کر ملّت کی تعداد میں بیکار لوگوں کا اضافہ کر دیں۔ آج کل تو ضرورت ایسے اولیاء کی ہے جو فاسق و فاجر مسلمانوں کو سچّا مسلمان اور سچّے مسلمانوں کو پکّا مومن اور موحِّد بنا سکیں، جو اپنی تعلیم و توجہ سے مسلمانوں میں ایسی فراست و بصیرت پیدا کر سکیں کہ وہ اپنے تمام تفرقے اور اختلافات مٹا کر ایک جان اور ایک قالب کی طرح مربوط و متحدّ ہو جائیں، حق و باطل میں تمیز کر سکیں، سُستی و کاہلی چھوڑ کر کام کرنا اور کام کرتے رہنا سیکھیں۔ اللہ اور رسولؐ کی سچی محبت کا جنون اُن کے لیے سرمایۂ دانش ہو۔ وہ بقائے ملّت کے لیے جان و مال قربان کرنا اپنی زندگی کا مقصد جانیں اور ہر طرف سے اپنا منہ موڑ کر صرف اللہ کی طرف کر لیں۔ اب عبادات کا بیان سنئے۔

عبادات

اسلامی عبادتیں بھی عقائد کی طرح دوسرے مذاہب کی عبادتوں سے کہیں بہتر اور افضل ہیں۔ دوسرے مذاہب کی عبادتیں محض تسکینِ روحانی اور نجاتِ اُخروی کے واسطے ہیں لیکن اسلامی عبادتیں تسکین ونجات کے علاوہ دنیاوی اعمال وافعال پر بھی براہِ راست زبردست نفسیاتی اثر ڈالتی ہیں اور ہماری دنیوی زندگی کو سدھارنے اور ہمارے اندر ایک عالیشان کردار پیدا کرنے کا موجب ہوتی ہیں۔ جو لوگ عبادت کے قائل نہیں وہ اکثر کہا کرتے ہیں کہ اللہ کو ہماری عبادت کی کیا ضرورت ہے۔ اُن کو بتاؤ کہ ہم کب یہ کہتے ہیں کہ اللہ کو ہماری عبادت کی ضرورت ہے یا کسی اور چیز کی۔ وہ تو دونوں عالموں کی ہر چیز سے بے نیاز ہے۔ اس کو اس بات کی بھی پروا نہیں کہ سارا جہان اسے پوجنے لگے یا اس سے منکر ہو جائے۔ عبادت کے معنی ہیں اللہ کی تابعداری، بندگی یا فرمانبرداری اور یہی اصل دین ہے۔ اس لحاظ سے قرآن میں جن باتوں کے کرنے کا حکم دیا گیا ہے ان کا کرنا اور جن کو نہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے ان کو نہ کرنا بھی عبادت ہے۔ لیکن عرفاً جن باتوں کو عبادت کہا جاتا ہے وہ چھ ہیں:

۱۔طہارت	۲۔نماز	۳۔روزہ
۴۔زکوٰۃ	۵۔حج	۶۔جہاد

ہم انہی چھ باتوں کا ذکر اس جگہ کریں گے، لیکن یہ ذکر ان عبادات کے اسرار و رموز یعنی فوائد اور تاثراتِ نفسیاتی پر مشتمل ہوگا، شرعی نقطۂ نظر سے ان کے اُصول و ارکان اور قواعد و آداب پر نہیں، کیونکہ یہ باتیں تو متقدّمین کی کتابوں میں مفصل بتائی جا چکی ہیں۔ ہم تو

صرف یہ بتائیں گے کہ ان عبادات سے ہماری روزمرّہ کی زندگی پر کیا تعمیری یا اصلاحی اثر پڑتا ہے۔

طہارت:

طہارت اسلام میں اس قدر اہم اور ضروری ہے کہ نماز جیسی اہم ترین عبادت بغیر طہارت کے ادا نہیں کی جاسکتی۔ طہارت کے معنی ہیں پاکیزگی، ستھرائی اور صفائی۔ اللہ بھی صاف ستھرا رہنے والوں کو پسند کرتا ہے، چنانچہ سورۂ توبہ میں فرماتا ہے:۔

وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ (التوبہ ۱۰۸)

اسلامی طہارت میں یہ باتیں شامل ہیں: بدن اور لباس پاک صاف اور سُتھرا ہو، اس پر کوئی ناپاکی اور گندگی لگی ہوئی نہ ہو۔ غُسلِ جنابت فرض ہے جب تک کر نہ لیا جائے نماز نہیں ہوسکتی۔ اس کے علاوہ ویسے بھی روز نہانا اور خصوصاً جمعہ کے دن بہ نیتِ نماز غُسل کرنا بہت ضروری ہے۔ مسلمانوں میں روزانہ نہانے کو کوئی خاص اہمیّت نہیں دی جاتی جو قابلِ افسوس ہے، حالانکہ دوسرے مذاہب کے لوگ اب عام طور پر روزمرّہ ہی غسل کرتے ہیں۔ یورپ کے عیسائیوں میں اسلام سے پہلے نہانا تو کیا منہ دھونا بھی بُرا سمجھا جاتا تھا، لیکن جب یورپ نے ہوش سنبھالا اور اسلامی ممالک خصوصاً اسپین کے مسلمانوں کو روزانہ نہاتے دھوتے دیکھا اور اس نہانے کے طریقوں خصوصاً گرم و سرد حماموں کا نظّارہ کیا تو انہوں نے بھی روزانہ نہانا شروع کردیا۔ لیکن ہماری پستی کے ساتھ ساتھ ہمارے ہاں یہ دستور کم ہوتے ہوتے بالکل ناپید ہوگیا۔ غسل سے صحت پر جو اثر پڑتا ہے اس سے کون انکار کرسکتا ہے۔ اس سے بدن میں چُستی اور پُھرتی آتی ہے اور سُستی جو تمام بے عملیوں کی جڑ ہے، دُور ہوتی ہے، طبیعت تازہ اور بشّاش رہتی ہے۔ الغرض حفظانِ صحت کے اُصولوں میں یہ سب سے پہلی چیز

ہے جو ضروری ہے۔ جہاں پانی کم ہو وہاں البتہ روزانہ غسل پر اتنا زور نہیں دیا جا سکتا۔ پانچ وقت نماز کے لیے وضو کرنے سے بھی بہت فائدہ حاصل ہوتا ہے۔

غسل اور وضو سے جسم صاف سُتھرا اور میل کچیل سے پاک رہتا ہے۔ اس کے علاوہ روزانہ مسواک کرنا، بالوں میں کنگھی کرنا اور تیل ڈالنا، سرمہ لگانا وغیرہ جو سب ہمارے رسولؐ کی سنّتیں ہیں صحت کے قیام کے لیے بے انتہا مفید ہیں۔ ان باتوں کے علاوہ صحت کے لیے کپڑوں کی پاکیزگی بھی بہت ضروری ہے اور ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ نماز پاک اور صاف کپڑے پہن کر پڑھنی چاہیے۔ یہی نہیں بلکہ اللہ نے تو یہ فرمایا ہے کہ:۔

يَا بَنِیٓ آدَمَ خُذُوا زِيْنَتَكُمْ عِندَ كُلِّ مَسْجِدٍ (الاعراف ۳۱)

اے آدمیو! ہر نماز کے وقت زینت اختیار کر لیا کرو۔

ظاہر ہے کہ یہاں لفظِ زینت سے صرف معمولی لباس ہرگز مراد نہیں بلکہ ایسا لباس مراد ہے جو واقعی خوبصورت اور بدن کی زینت و آرائش کا باعث ہو۔ عقل بھی یہی کہتی ہے کہ جب تم کسی دنیاوی تقریب میں شامل ہوتے ہو یا کسی بڑے آدمی سے ملنے جاتے ہو تو بہترین لباس پہن کر جاتے ہو، پھر کوئی وجہ نہیں کہ جب اللہ تعالیٰ کے سامنے حاضر ہو تو بہترین زیبائش و آرائش کے ساتھ نہ جاؤ۔

یہ ہماری کس قدر بدنصیبی ہے کہ مسجدوں میں زیادہ تر غریب اور مفلس ہی جاتے ہیں۔ اُمراء بہت سے تو نماز ہی نہیں پڑھتے اور جو پڑھتے ہیں وہ اپنے گھروں ہی میں ادا کر لیتے ہیں۔ غریب لوگ جو مسجدوں میں نظر آتے ہیں اکثر اس قدر میلے اور گندے ہوتے ہیں کہ بدبو آتی ہے۔ غیر مسلموں نے ان غریبوں کو ان گندے کپڑوں میں دیکھ کر نماز اور خود اسلام کے متعلق یہ غلط خیال قائم کر لیا ہے کہ اسلام صفائی اور پاکیزگی کی تعلیم نہیں دیتا۔ اِس لیے جو

لوگ صاف اور سُتھر الباس پہن کر مسجدوں میں نہیں جاتے وہ اسلام کی تذلیل اور بدنامی کے مجرم ہیں، ان کو توبہ کرنی چاہیۓ اور خوب سج سجا کر مسجدوں میں جانا چاہیۓ تاکہ دوسری قوموں کی نظر میں اسلام کی وقعت اور مسلمانوں کی عظمت کا سکہ بیٹھے۔ یہ بھی تبلیغِ اسلام کی ایک عملی صورت ہے۔

صاف ستھرے کپڑے نہ پہننے کے لیے غربت کا عذر بالکل غلط ہے۔غربت صفائی کے راستہ میں ہرگز حائل نہیں ہوسکتی، سُستی اور کاہلی البتہ انسانوں کو میلا اور غلیظ رکھتی ہے۔ اصل وجہ ہمارے بھائیوں کے میلا اور گندا رہنے کی یہی سُستی اور کاہلی ہے، ورنہ کون شخص ہے جو گھر میں یا تالاب و دریا وغیرہ پر اپنے کپڑے اپنے ہاتھ سے نہیں دھو سکتا اور صاف سُتھرا نہیں رہ سکتا۔

طہارت و پاکیزگی کے فوائد اس قدر واضح اور ظاہر ہیں کہ زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں۔ کون نہیں جانتا کہ:۔

۱۔ نہانا دھونا اور پاک صاف رہنا اُصولِ صحت کے لحاظ سے تندرستی کے لیے ناگزیر ہے۔

۲۔ اس سے دل خوش، طبیعت بشاش اور انسان چُست و چالاک رہتا ہے۔

۳۔ دماغ حاضر رہتا ہے اور کام خوب ہوتا ہے۔

۴۔ طبیعت میں اُمنگ اور اُپج پیدا ہوتی ہے اور زیادہ کام کرنے کو دل چاہتا ہے۔

۵۔ خلاصہ یہ کہ طہارت و پاکیزگی انسان کو عملی آدمی بنانے میں بڑی مدد دیتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ اسلام نے اس کو عبادت میں شامل کیا ہے۔

نماز:

نماز ہماری سب سے زیادہ اہم اور لازمی عبادت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں جتنی

تاکید نماز کی فرمائی ہے اور کسی عبادت کی نہیں فرمائی۔ نماز کے فوائد بے شمار ہیں لیکن ہم صرف چند بڑے بڑے فوائد کے بیان پر اکتفا کریں گے۔ یہ فوائد دوگونہ ہیں یعنی نماز نہ صرف ہمارے روحانی ارتقاء کا باعث ہوتی ہے بلکہ دنیاوی زندگی کو سدھارنے اور کامیاب بنانے میں بھی انفرادی اور اجتماعی دونوں حیثیتوں سے بے انتہا مدد دیتی ہے۔

ا۔ نماز صحیح انسانی کردار پیدا کرتی ہے:

عقائد کے بیان میں ہم بتا چکے ہیں کہ اسلام کا بُنیادی اُصول اللہ کی وحدانیت پر ایمان رکھنا ہے اور یہ ایمان اگر ہمارے پچیس فیصدی آدمیوں میں بھی کامِل درجے کا ہو تو ہماری قوم ہرگز پستی کی حالت میں نہیں رہ سکتی۔ ایمان کی شناخت بھی ہم نے بتائی تھی اور وہ یہ کہ مومن نہ تو اللہ کے سوا کسی اور سے ڈرتا ہے نہ کوئی توقع رکھتا ہے لیکن آپ غور کریں تو معلوم ہوگا کہ ایسا آدمی جو نہ تو اللہ کے سوا کسی سے ڈرتا ہو نہ کوئی توقع رکھتا ہو، دوسرے آدمیوں کے ساتھ مل جل کر نہیں رہ سکتا۔ معاشرہ میں ہر ایک انسان دوسرے انسان سے کوئی نہ کوئی توقع اور کسی نہ کسی قسم کا خوف ضرور رکھتا ہے، بغیر اس کے معاشرہ کا نظام ہی قائم نہیں رہ سکتا۔ اِس لیے جو شخص بالکل نڈر، بے باک اور بے غرض ہو وہ سوسائٹی میں بالکل ایک جانور یا درندے کی طرح ہوگا اور کسی سے تعاون نہ کر سکے گا۔ ظاہر ہے کہ اگر کسی قوم میں سارے ہی آدمی ایسے ہوں تو وہ قوم کبھی بھی ایک جماعت میں منظّم اور مربوط نہ ہو سکے گی۔ اس دشواری کا علاج اللہ تعالیٰ نے نماز سے کیا ہے۔ نماز کیا ہے؟ ہمہ تن عجز و انکساری اور خشوع و خضوع۔ غلاموں کی طرح ہاتھ باندھ کر کھڑے ہونا، چوپایوں کی طرح رکوع میں جھکنا اور کیڑے مکوڑوں کی طرح زمین پر ماتھا اور ناک رگڑنا، ہمہ تن عجز و انکساری نہیں تو اور کیا ہے؟ اس طرح مومن کے کردار میں بے خوفی اور بے تعلقی کی وجہ سے جو خشونت اور

درشتی پیدا ہوتی ہے وہ پانچ وقت کی نماز میں اس عجز و انکسار کی عملی مشق کرنے سے مائل بہ اعتدال ہو جاتی ہے اور ایک ایسا معتدل کردار پیدا ہو جاتا ہے جو انسانِ کامل ہی کا ہو سکتا ہے۔ جماعت کی نماز سے اس کے کردار کی تعمیر میں اور بھی زیادہ مدد ملتی ہے۔ جب تمام آدمی اپنے ہی جیسے ایک آدمی کے پیچھے بلا امتیاز کمتری و برتری صف بستہ ہو کر ایک ہی طرح کی حرکتیں دن میں پانچ مرتبہ کرتے ہیں تو ان میں ایک دوسرے کے ساتھ موالفت و موانست کے جذبات پیدا ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

یوں سمجھنا چاہئے کہ توحید گویا ایک زہر ہے اور نماز ایک ایسا بدرقہ جو اس کی تمام خرابیوں کو دُور کر کے مدبّر کر دیتا ہے، اور کون نہیں جانتا کہ جب زہر مدبّر ہو جائے تو اس سے بہتر کوئی دوا نہیں۔ یا یوں کہیے کہ بہت سے شیر صفت انسان ایک جگہ اکٹھے ہو کر عجز و انکسار اور محبت و پیار کی تربیت حاصل کرتے ہیں اور اُن میں وہ کردار پیدا ہو جاتا ہے جو

اَشِدَّاء عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَاء بَیْنَھُمْ (الفتح ۲۹)

کی تفسیر مجسّم ہوتا ہے۔ ایسے افراد کے کردار کی قوّت اور لچک کا اندازہ آج کل کے بڑے سے بڑے ماہرِ نفسیات بھی نہیں کر سکتے، پھر اُن کی جماعت کے کردار کا تو ذکر ہی کیا۔ یہی وہ لوگ ہیں کہ ایک طرف تو کسی کی غلامی قبول نہیں کر سکتے، دوسری طرف کبھی کسی پر ظلم نہیں کرتے۔

۲۔ نماز ڈسپلن پیدا کرتی ہے:

جو ایک اعلیٰ جماعت کی مکمّل تنظیم و ارتباط کے لیے ناگزیر ہے۔ نماز باجماعت میں وقت اور حرکات و سکنات کی پابندی اور امام یا لیڈر کے اشاروں کی متابعت اشد ضروری ہے۔ یہ نہ ہو تو نماز فاسد یا ساقط ہو جاتی ہے۔ ڈسپلن کیا ہے؟ ضابطہ اور قواعد کی پوری

پابندی اور لیڈر یا کمانڈر کے حکم کی بے چون و چرا تعمیل۔ کیا نماز میں پانچ وقت انہی باتوں کی عملی مشق نہیں کرائی جاتی؟ یا یہ باتیں نماز کی نسبت کسی اور طریقے سے زیادہ اچھی طرح حاصل ہوسکتی ہیں یا دنیا کا کوئی مذہب ایسی پُر از عمل و حکمت عبادت کی مثال پیش کرسکتا ہے۔

۳۔ نماز تنظیم کا ذریعہ ہے:

اسلام نے نماز کی ترکیب ایسی مکمّل اور پُر از حکمت رکھی ہے جس کی مثال نہیں۔ پہلے چھوٹی چھوٹی جماعتوں کی تنظیم و تربیت محلّہ کی مسجدوں میں ہوتی ہے، پھر تمام شہر کے مسلمانوں کی مساجد جامع میں، پھر شہر و مضافات کے مسلمانوں کی عیدگاہوں میں آخرکار تمام دُنیا کے مسلمانوں کی بیت اللہ میں۔ یہ ایک ایسا مکمّل نظام اور بنی بنائی تنظیم ہے جس سے فائدہ اٹھانا کچھ بھی مشکل نہیں۔ سوچنے کی بات ہے کہ جو لوگ اس طرح مذہبی تقدس و خلوص کے ساتھ جمع ہوتے ہیں ان کے دل محبت و اخوت اور باہمی تعاونِ عمل کے جذبات سے کبھی عاری نہیں ہوسکتے۔ تو کیا ان اجتماعات میں قومی مذلّت و پستی کی وجوہات پر غور و خوض کر کے آئندہ ترقی کا کوئی منصوبہ بنا لینا اور اس پر عمل درآمد کر گزرنا کوئی محال یا مشکل کام ہے؟ یہ کام صرف ہمارے مذہبی اور سیاسی رہنما ہی کر سکتے ہیں۔ اگر وہ ایسا کریں تو ان کا ذاتی اقتدار اور مرتبہ اور بھی زیادہ بلند ہوجائے گا، محنت اور خلوص البتہ درکار ہے۔

۴۔ نماز قوّتِ عمل پیدا کرتی ہے، کس طرح؟

صبح کو جب نرم گرم بچھونوں میں میٹھی میٹھی نیند تھپک تھپک کر سلانے کی کوشش کرتی ہے۔ خدائے ذوالجلال کے دربار میں حاضری کا خیال مسلمان کو بستر سے اٹھا کر کھڑا کر دیتا ہے اور وہ ضروریات سے فارغ ہوکر غسل یا وضو کر کے مسجد میں چلا جاتا ہے اور نماز میں اپنے خالق و

مالک کی حمد و ثنا کرتا ہے، جس نے رات آرام سے گزروائی اور جیتا جاگتا کھڑا کیا۔ یا ظہر کے وقت جب صبح سے کام کرتے کرتے تھک جاتا ہے اور سوائے کھانا کھانے یا آرام کرنے کے اور کسی بات کو دل نہیں چاہتا تو وہ اپنی قوّتِ ارادی سے بھوک اور تکان کے تمام احساسات کو مغلوب کر کے نماز پڑھتا ہے۔ یا عصر و مغرب کے وقت جب کہ تمام دن کی محنت و مشقت سے بدن چُور چُور اور طبیعت راحت و آرام کی طالب ہوتی ہے، وہ سُستی اور کاہلی کو لات مار کر مسجد میں جاتا ہے اور خالقِ ارض و سما کے آگے سجدہ ریز ہو جاتا ہے۔ اسی طرح عشاء کی نماز کے وقت جب کہ ہاتھ پاؤں کام کرنے سے انکار کر دیتے ہیں اور نیند کا غلبہ ہوتا ہے تو وہ قوّتِ ارادی سے سوتے ہوئے حواس کو جگاتا اور نماز ادا کر کے اُس رحمٰن و رحیم کا شکر بجالاتا ہے جس نے دن میں اُس کو کام کرنے کی قوّت عطا کی اور طرح طرح کی نعمتوں سے سرفراز کیا۔ اس پنج وقتہ عمل سے قوّتِ ارادی طاقتور ہوتی اور عمل کی طاقت ترقی کرتی چلی جاتی ہے۔ چُستی پیدا ہوتی ہے، دماغ تیز ہو جاتا ہے اور صحت اچھی رہتی ہے۔ رات کو عام طور پر کھانا خوب کھایا جاتا ہے۔ اکثر آدمی کھانا کھاتے ہی لیٹ جاتے ہیں، چلنے پھرنے کا کوئی کام نہیں کرتے جس سے سوء ہضم اور دائمی قبض پیدا ہوتا ہے۔ اگر وہ کچھ بھی نہ کریں مسجد تک جا کر صرف سترہ رکعت عشاء کی پڑھ لیں تو یہ تکالیف پیدا نہیں ہو سکتیں۔

۵۔ نماز کا دوہرا فائدہ:

جو آدمی دولت کی زیادتی یا دوسری وجوہات سے بیکار ہوں اور صبح سے شام تک سوائے کھانے پینے اور پڑے رہنے کے اور کوئی شغل نہ ہو تو نماز ان کے لیے عین عمل بن جاتی ہے اور پڑے رہنے سے جو کسل اور سُستی پیدا ہوتی ہے اس کو دُور کر دیتی ہے۔

برخلاف اس کے جن آدمیوں کو بے انتہا کام ہو اور سر اٹھانے کی فرصت بھی نہ ملے ان کے لیے دَورانِ کار میں نماز پڑھنا عین آرام وراحت اور سکون کا باعث ہوتا ہے۔ یادرکھئے حقیقی سکون و آرام اسی وقت ملتا ہے جب دماغ تفکّرات سے بالکل پاک ہو اور یہ بات نماز میں بدرجۂ اولیٰ حاصل ہوتی ہے۔

٦۔ نماز سے سکون واطمینانِ قلب حاصل ہوتا ہے:

جب تفکّراتِ دنیا انسان کو حد سے زیادہ پریشان کردیں، چاروں طرف مایوسی اور بیچارگی کا عالَم ہو اور کوئی یارو مددگار نظر نہ آئے تو نماز ہی سے انسان کو سکونِ قلب حاصل ہوتا ہے۔ اکثر انسان ایسے حالات میں خودکشی تک کو تیار ہو جاتے ہیں، لیکن نماز اُن خیالات کو بدل دیتی اور پائے ثبات کو ڈگمگانے سے روک لیتی ہے۔ خود اللہ تعالیٰ نے قرآن میں فرمایا ''بے شک اطمینانِ قلب اللہ کی یاد ہی سے میسر آتا ہے'' اور یہ بھی کہا کہ جب تم پر کوئی مصیبت پڑے تو صبر اور نماز سے مدد لو۔

٧۔ نماز بُرائیوں سے بچاتی اور اخلاق کو سدھارتی ہے:

چنانچہ قرآن میں ہے

اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْکَرِ (العنکبوت ٤٥)

لیکن افسوس کہ مشاہدہ اور تجربہ آج کل اس کے خلاف ہے۔ اکثر مغرب زدہ اصحاب اس مشاہدہ اور تجربہ کی بنا پر اس آیت کی صداقت ہی کا انکار کرتے ہیں اور نہ صرف نماز کے فوائد بلکہ خود نماز ہی سے منکر ہیں۔ اب بتایئے ہم انہیں کیسے سمجھائیں، کلامِ ربّانی تو غلط ہو ہی نہیں سکتا۔ یہی سمجھ میں آتا ہے کہ جو لوگ باوجود نمازی ہونے کے دُنیا بھر کے جھوٹے، چور اور دغاباز ہوتے ہیں، رشوت لیتے ہیں، کم تولتے ہیں، کم ناپتے ہیں، چور بازاری کرتے

ہیں، غیبت کرتے اور چغلیاں کھاتے ہیں، دوسروں کے اعمال کی جستجو میں رہتے ہیں، وعدہ کر کے کبھی پورا نہیں کرتے، مسلمانوں میں انفرادی اور اجتماعی تفرقے ڈلواتے اور مسلمانوں کو آپس میں لڑا کر اپنا الّو سیدھا کرتے رہتے ہیں، ان کی ''نماز'' نماز ہی نہیں ہوتی۔ وہ یا تو ریا کاری سے محض دُنیا کے دکھاوے کی نمازیں پڑھتے ہیں یا پھر ان کی نماز فقط رسمی ہوتی ہے، جس میں نہ خلوص ہوتا ہے نہ خشوع وخضوع نہ یادِ باری تعالیٰ۔ یہی ہیں وہ نمازی جن کی نمازیں قیامت کے دن اُن کے منہ پر مار دی جائیں گی اور کسی کام نہ آئیں گی۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر وہ نماز کونسی ہے جو بُرائیوں سے بچاتی اور اخلاق سدھارتی ہے؟ سنئے! بات یہ ہے کہ نماز نہ تو شعائرِ اسلام کا سب سے پہلا رکن ہے نہ سب سے آخری، نہ یہ بذاتہٖ مقصود ہے۔ شعائرِ اسلام میں سب سے پہلی چیز ہے ایمانِ محکم اور سب سے آخری چیز ہے اخلاقِ کامل۔ اور نماز جیسا کہ اوپر بیان کی ہوئی آیت سے ثابت ہوتا ہے ذریعہ ہے اس اخلاق کے حصول کا۔ ایمان پہلی چیز اِس لیے ہے کہ اگر آدمی ایمان ہی نہ لائے تو نہ اس پر نماز فرض ہو نہ ارکانِ مذہب میں سے کوئی اور رُکن۔ اخلاق آخری چیز اس واسطے ہے کہ اگر ساری عمر نماز پڑھنے کے باوجود انسان کی برائیاں دُور نہ ہوں اور وہ ایک نیک شہری نہ بن سکے تو یہ نماز معیارِ قرآنی کے مطابق بیکار ہے حتیٰ کہ اس کی بخشش کا سبب بھی نہ ہو سکے گی۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسے لوگ نماز نہیں پڑھتے بلکہ نماز کی نقل اتارتے یا نماز کا مذاق اڑاتے یا بیگار ٹالتے ہیں، اِس لیے اصل نماز جس سے اخلاق سدھرتا ہے وہ ہے جس کی بابت رسولِ کریمؐ نے فرمایا ہے

لَا صَلٰوۃَ اِلَّا بِحُضُوْرِ الْقَلْبِ (نماز نہیں ہوتی مگر قلب کی حضوری کے ساتھ)

یا اللہ نے بتایا ہے کہ

اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکۡرِیۡ (طٰہٰ۔۱۴) میری یاد کے لیے نماز پڑھا کرو۔

یعنی وہ نماز جس میں اللہ کی حضوری حاصل ہو یا اللہ کی یاد دل میں بسی ہوئی ہو، ایسی نماز کوئی پڑھے تو دیکھیں کیوں کر اس کے اخلاق نہیں سدھرتے۔ ایسی نماز کا طریقہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ چوبیس گھنٹے اللہ کو یاد رکھو تب ایسی نماز ہو سکتی ہے۔ نفسیات کا سیدھا سا مسئلہ ہے کہ دن بھر جو خیالات دماغ میں بسے رہتے ہیں، ارتکازِ خیال کے وقت ردِّ عمل کی وجہ سے وہی دماغ میں بار بار آتے ہیں۔ پس اگر دماغ میں چوبیس گھنٹے اللہ ہی کا خیال جاگزیں رہے گا تو نماز میں بھی اللہ ہی یاد آئے گا۔

۸۔ نماز احساسِ فرائض پیدا کرتی اور اس کو قائم رکھتی ہے:

نماز فرض ہے اور اس کی ادائیگی پر اس قدر زور دیا گیا ہے کہ کسی حالت میں بھی معاف نہیں۔ تم بسترِ مرگ پر ہی کیوں نہ ہو اور ہاتھ پاؤں جواب دے چکے ہوں لیکن ہوش باقی ہو اور نماز کا وقت آ جائے تو اشاروں ہی سے پڑھ لینے کا حکم ہے۔ اس سختی اور تشدّد سے مقصود یہی احساس پیدا کرنا ہے کہ دنیاوی امور میں بھی جو چیز تم پر فرض ہے اس کو مرتے مرتے بھی ادا کرنا ہے۔ کیا کوئی مذہب اس قسم کی عبادت پیش کر سکتا ہے؟

۹۔ نماز روحانیت پیدا کرتی ہے:

نماز اگر نماز کی طرح پڑھی جائے یعنی اس میں اللہ یاد ہو تو اس سے رفتہ رفتہ حضوریٔ قلب کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور یہی کیفیت بڑھتے بڑھتے اس احساس میں تبدیل ہو جاتی ہے کہ اللہ موجود ہے اور مجھ کو دیکھ رہا ہے، یہی ایمان ہے جیسا کہ پیچھے بتایا جا چکا ہے۔

۱۰۔ نماز ہی ولیٔ کامل بناتی ہے:

یعنی جب ایمان پیدا ہو جاتا ہے تو یہی نماز رفتہ رفتہ اس کو مرتبۂ احسان تک پہنچا دیتی

ہے جو ولایت ہے، اس کا بیان پیچھے آ چکا ہے۔

یہ ہیں نماز کے فوائد اور نفسیاتی اثرات۔ اب ہم دُعا کا کچھ بیان کرنا چاہتے تھے لیکن ایک بات یاد آ گئی وہ بیان کرتے ہیں پھر دُعا کا بیان کریں گے۔ وہ یہ کہ ساتویں فقرے میں جو ہم نے لکھا ہے کہ نماز اخلاق کو سدھارتی ہے اور بُرائیوں سے بچاتی ہے اس کے متعلق قرآن میں پوری آیت یوں ہے

اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنۡھٰی عَنِ الۡفَحۡشَآءِ وَالۡمُنۡکَرِ وَ لَذِکۡرُ اللّٰہِ اَکۡبَر (العنکبوت:۴۵)

ترجمہ ''بے شک نماز فحش اور بُری باتوں سے روکتی ہے اور اللہ کی یاد تو سب سے بڑی (عبادت) ہے'' تو اس آخری ٹکڑے کو آڑ بنا کر بہت سے مغرب زدہ اور نماز کے چور یوں کہتے ہیں کہ جب اللہ کو یاد کر لینا ہی سب سے بڑی عبادت ہے تو اتنا کافی ہے کہ چلتے پھرتے اس کو یاد کر لیا جائے، نماز کی کیا ضرورت باقی رہ جاتی ہے۔ ان کو یاد رکھنا چاہئے کہ جس اللہ نے یہ فرمایا ہے، اسی نے یہ بھی کہا ہے اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکۡرِیۡ ''یعنی قائم کرو نماز کو میری یاد کے لیے''۔ مطلب یہ ہے کہ نماز کو نماز کی طرح پڑھنا اور اس کے پورے فوائد سے متمتع ہونا چاہتے ہو تو نماز میں اللہ کو یاد رکھو، کیونکہ یاد رکھنا ہی سب سے بڑی عبادت ہے اور چونکہ آیت میں وَلَذِکۡرُ اللّٰہِ اَکۡبَر بعد میں آیا ہے، اُس کا مفہوم بھی یہی ہے کہ نماز بے شک بُرائیوں اور فواحش سے بچاتی ہے، مگر یہ بات اسی حالت میں بدرجۂ اتم حاصل ہو سکتی ہے جب کہ تم نماز میں اللہ کو یاد رکھو۔ اس کے علاوہ ہم ایسے لوگوں سے دریافت کرتے ہیں کہ آپ کا فرمانا بجا کہ اللہ کی یاد سب سے بڑی عبادت ہے، لیکن قرآن میں اور جو سینکڑوں جگہ نماز کا حکم دیا گیا ہے تو کیا آپ قرآن کی بعض باتوں کو تو مانیں گے اور بعض سے انکار کر دیں گے۔ اب ہم دُعا کا بیان کرتے ہیں۔

دُعا:

اگرچہ نماز خود ثناء اور دُعا ہے، لیکن نماز کے بعد اپنے اغراض و مقاصد کی دُعا مانگنا بھی بہت ہی اہم ہے۔ وجہ یہ ہے کہ نماز میں جو حضوری اور قُربتِ خداوندی حاصل ہوتی ہے، اس کیفیت میں اگر دُعا مانگی جائے تو اکثر قبول ہوتی ہے۔ بہت سے مسلمان دُعا کے بھی منکر ہیں۔ وہ عجیب عجیب دلیلیں دیتے ہیں مثلاً وہ کہتے ہیں کہ ایک چیز کے لیے ایک ہی وقت میں دس یا سو آدمی دُعا کرتے ہیں تو کیسے ممکن ہے کہ وہ چیز سب کو مل جائے، وہ تو ایک ہی کو ملے گی۔ سبحان اللہ کیا منطق ہے۔ اس دلیل سے اتنا ہی تو ثابت ہوتا ہے کہ اس بارے میں صرف ایک ہی آدمی کی دُعا قبول ہوگی، باقی کی نہیں ہوگی۔ یہ کہاں سے ثابت ہوگیا کہ دُعا ہی نہ مانگو۔ کیا اللہ تعالیٰ نے اس بات کا ٹھیکہ لے رکھا ہے یا وہ مجبور ہے کہ آپ جو دُعا مانگیں وہ ضرور ہی قبول کرلے ورنہ آپ اُس سے ناراض ہو جائیں گے اور دُعا مانگنا چھوڑ دیں گے، کیا دھونس ہے۔ بات یہ ہے کہ اگر ایک ہی چیز کے لیے بہت سے آدمی دُعا کریں تو اللہ تعالیٰ جو علیم ہے صرف اسی شخص کی دُعا قبول فرمائے گا جو اس چیز کا سب سے زیادہ مستحق ہوگا۔ اگر ایسا نہ ہو اور نعوذ باللہ، اللہ مجبور ہو کر آپ کی ہر دُعا قبول کرلے تو پھر آپ ایسے ایسے ناپاک مقاصد بھی دُعائیں مانگ کر حاصل کرلیں گے جن سے خود آپ کو بھی نقصان پہنچے گا اور نظامِ عالم بھی تباہ ہو جائے گا۔ ہر شخص بغیر عمل کے رزق اور روپیہ پیسہ حاصل کرلے گا اور عمل مفقود ہو جائے گا یعنی تمدّن کا نام و نشان بھی نہ رہے گا۔ دراصل دُعا کی سب سے بڑی ضرورت اور اہمیت یہ ہے کہ دُعا سے ایک تو انسان کو اللہ کے آگے اپنی عاجزی اور محتاجی کا احساس اور یقین رہتا ہے، دوسرے دُعا مانگتے وقت وہ اللہ سے اس قدر قریب ہو جاتا ہے اور ایک ایسا روحانی کیف اور یقین حاصل کرتا ہے جس کا بیان ممکن نہیں۔ اب رہے وہ لوگ جن

کی دُعا قبول نہیں ہوتی تو اگر وہ مومن اور بندے ہیں تو اُن کو یقین کر لینا چاہیئے کہ اس چیز کو اللہ ہمارے لیے مفید نہیں سمجھتا اِس لیے ہماری دُعا قبول نہیں کرتا۔ یہ سمجھ کر اُن کو خدا کا شکر بجالانا چاہیئے کہ اس نے ہمیں ایک مُضر شے سے محفوظ رکھا۔

روزہ:

۱۔ اسلام کی تمام عبادتوں میں صرف روزہ ہی ایک ایسی عبادت ہے جس میں انسان اللہ کی ایک صفت کی نقل کرتا ہے۔ یعنی جس طرح اللہ جلّ مجدہٗ خور و نوش سے پاک ہے، اسی طرح روزہ دار بھی رمضان کے دنوں میں صبح سے شام تک نہ کچھ کھاتا ہے نہ پیتا ہے۔ گویا وہ اللہ کی ایک سنّت پر کچھ دیر کے لیے عمل کرتا ہے۔ اگر روزہ دار اس نکتہ کو ملحوظ رکھے تو اللہ تعالیٰ دن بھر اس کو یاد رہے گا اور اللہ کو یاد رکھنا ہی سب سے بڑی عبادت ہے، اس سے روزہ کو چار چاند لگ جائیں گے۔

۲۔ پاکیزگی اور طہارت روزے میں لازمی ہے۔ روزے میں نہ صرف جسمانی بلکہ قلبی پاکیزگی بھی بہت ضروری ہے۔ مہینہ بھر قلب کو پاکیزہ اور گندے خیالات سے بچائے رکھنے سے اس قدر روحانی لطافت اور طاقت پیدا ہوتی ہے جو برسوں میں بھی نہیں ہوسکتی۔

۳۔ صبر و تحمل اور قوّتِ برداشت پیدا کرنے کی بڑی مشق ہوتی ہے جو اعلیٰ انسانی کردار پیدا کرنے کے لیے سب سے ضروری ہے، مگر افسوس کہ ہمارا مشاہدہ اس کے خلاف ہے۔ روزے میں مسلمانوں کو غصّہ بہت زیادہ آتا ہے اور اس کے گھناؤنے مظاہر ہر گھر میں دیکھنے میں آتے ہیں۔ ایسے روزے سے کیا فائدہ؟ روزے میں تو غصہ بالکل مر جانا چاہیئے، مگر یہ تب ہی ہوسکتا ہے جبکہ روزے میں اللہ یاد ہو۔

۴۔ بھوک پیاس کو روکنے یعنی باوجود بھوک پیاس کے کچھ نہ کھانے پینے اور دوسری

نفسانی خواہشوں کو نفی کرنے سے قوّتِ ارادی بہت بڑھ جاتی ہے اور یہ چیز بھی اعلیٰ انسانی کردار پیدا کرنے کے لیے بہت ضروری ہے۔

۵۔ نماز کی طرح روزہ بھی ادائیگی فرض کا احساس پیدا کرتا ہے اور یہ سکھاتا ہے کہ خواہ کتنی تکلیف اور مشقّت آن پڑے، فرض کو پورا کر کے دم لو۔

۶۔ غریبوں کی بھوک پیاس اور فاقہ زدگی کا احساس اور ان کی مدد اور خدمت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے جو تنظیم و ارتباط ملّت کے لیے بہت ضروری ہے۔

۷۔ گردو پیش کے تمام مسلمانوں کو روزے سے دیکھ کر نادانستہ طور پر یک جہتی اور اجتماعیت کی روح ترقی کرتی ہے۔

۸۔ دن بھر بھوکے پیاسے رہتے ہوئے جب انسان اپنے روزمرہ کے کام انجام دیتا رہتا ہے مثلاً کوئی دفتر میں کام کرتا ہے، کوئی کارخانے میں، کوئی ہل چلاتا ہے، کوئی پتھر توڑتا ہے تو اس سے مشکلات میں رہتے ہوئے بھی عمل کرنے کی بے پناہ قوّت پیدا ہوتی ہے۔

۹۔ رمضان کے بعد عید کے دن جب سب مسلمان نماز کے لیے جمع ہو کر خوشی مناتے اور بے تکلفی سے کھاتے پیتے ہیں تو اس سے نہ صرف آپس کی محبت و اخوت میں اضافہ ہوتا ہے بلکہ اللہ کی نعمتوں کی صحیح قدر بھی ذہن نشین ہوتی ہے۔

۱۰۔ ماہِ رمضان کا مجاہدہ یہ سکھاتا ہے کہ اگر تم زندگی میں اللہ کی نعمتیں یعنی دنیاوی راحت و آسائش حاصل کرنا چاہتے ہو تو کچھ عرصہ بھوک پیاس کی تکلیف اٹھاؤ، نفسانی خواہشوں پر قابو حاصل کرو، اخوت و محبت سے رہو، صبر یعنی برداشت کی قوّت پیدا کرو اور اللہ کو یاد کرتے ہوئے برابر عمل کرتے چلے جاؤ۔ آخر میں تم دیکھو گے کہ تمہارا ہر روز روزِ عید ہے اور ہر شب شبِ براَت۔

اب سوال یہ ہے کہ مسلمانوں میں نمازیوں کی نسبت روزہ دار بہت زیادہ ہوتے ہیں۔ بڑے بڑے اوباش اور عیاش بلکہ چور اور ڈاکو تک رمضان کے مہینے میں پکے روزہ دار بلکہ پرہیز گار بن جاتے ہیں، لیکن اِدھر رمضان ختم ہوا، اُدھر سب برائیاں اسی طرح موجود۔ یہ کیا بات ہے؟ کیوں ان لوگوں کے اخلاق کی اصلاح نہیں ہوتی؟ اس کا جواب بھی یہی ہے کہ دراصل ان مسلمانوں کو اللہ پر ایمانِ کامل نہیں، یعنی عقائد کی بُنیاد کمزور ہے تو باقی عمارت کس طرح مضبوط ہوسکتی ہے۔ روزے کے دَوران بلکہ تمام رمضان میں شاید ہی صحیح طور پر کسی کو احساس ہوتا ہو کہ اللہ موجود ہے اور ہم کو دیکھ رہا ہے، یہی وجہ ہے کہ بجائے صبر و تحمل اور قوّتِ برداشت کے عام طور پر روزہ داروں میں گھبراہٹ، چڑ چڑا پن اور غصّہ بہت زیادہ پیدا ہوجاتا ہے۔ چنانچہ رمضان میں سینکڑوں مرتبہ یہ فقرہ سننے میں آتا ہے کہ ''اس سے نہ بولنا اس کو روزہ لگ رہا ہے'' یا ''اس پر اس وقت روزہ سوار ہے'' وغیرہ وغیرہ۔

مسلمانو! خدا کے لیے اتنا تو سوچو کہ عبادت کرتے بھی ہو، تکلیف اٹھاتے بھی ہو لیکن وہ مقصد حاصل نہیں کرتے جس لیے یہ سب کچھ فرض کیا گیا ہے۔ خدارا ذرا کوشش کرو، اپنی عبادتوں کو صحیح طور پر انجام دو تاکہ انفراداً اور اجتماعاً دونوں طرح دین اور دُنیا میں سرخرو اور کامران ہوجاؤ۔

حج:

اسلامی عبادات میں حج بھی ایک بے مثال اور مفید ترین عبادت ہے۔ حج صرف اس کا نام نہیں کہ مکہ معظّمہ پہنچے، طواف کیا اور دوسرے مناسک حج ادا کرکے جیسے کورے گئے تھے ویسے ہی واپس چلے آئے اور سمجھ لیا کہ ہمارے سب اگلے پچھلے گناہ معاف ہوگئے اور جنت کا پروانہ مل گیا، بلکہ حج سے مندرجہ ذیل فوائد حاصل ہوسکتے ہیں۔

۱۔ حج میں سفر کرنا پڑتا ہے اور سفر سے حوصلہ، عقل اور تجربہ بڑھتا ہے، جھجک دُور ہوتی ہے، معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔

۲۔ سفر میں جو صعوبتیں اور تکالیف پیش آتی ہیں اُن کو ایک فریضۂ مذہبی کی ادائیگی کے خیال سے بخوشی برداشت کرنا پڑتا ہے جس سے تکلیفیں اٹھانے کی عادت پیدا ہوتی ہے اور قوّتِ برداشت بڑھتی ہے۔

۳۔ چونکہ اکثر اوقات آدمی اکیلا ہی جاتا ہے اور ہر کام کے لیے خود اپنے ہی اوپر بھروسا کرنا پڑتا ہے، اس سے خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے جو اعلیٰ کردار انسانی پیدا کرنے کے لیے بہت ہی ضروری صفت ہے۔

۴۔ سُستی اور کاہلی رفع ہوتی ہے اور قوّتِ عمل پیدا ہوتی ہے۔

۵۔ انسان جب حج کو جانے کا ارادہ کرتا ہے تو حضور رسالتمابؐ کے روضہ پر حاضری کی تمنّا بھی ضرور ہوتی ہے، اس لیے وہ تمام گناہوں سے توبہ کر لیتا ہے اور پاک صاف دل لے کر جاتا ہے۔ ان میں اکثر ایسے ہوتے ہیں جو عمر بھر اس توبہ پر قائم رہتے ہیں اور نیک مرتے ہیں، یہ بہت بڑی بات ہے۔

۶۔ چونکہ دَورانِ سفر میں دل نیکی اور محبت کے جذبات سے معمور ہوتا ہے، ہر آدمی دوسرے ہمراہیوں کی مدد کرتا ہے جس کی وجہ سے ہمدردی اور خدمت کا جذبہ ترقی پاتا ہے۔

۷۔ حج نیکی اور بدی کی کسوٹی ہے۔ جو لوگ محض دُنیا دکھاوے کے لیے حج کرتے ہیں یا اپنی بدیوں کو حج کے مقدس پردے میں چھُپانا چاہتے ہیں وہ واپس آ کر پہلے سے بھی زیادہ فسق و فجور میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ برخلاف اس کے جو لوگ سچ مچ نیک ہوتے ہیں واپس آنے کے بعد سب پر اُن کی نیکیاں ظاہر ہو جاتی ہیں۔

۸۔ حاجی مکہ معظّمہ اور مدینۂ منوّرہ میں پرانے اماکنِ مقدّسہ اور تاریخی مقامات کو دیکھتا اور قبورِ صحابہؓ وغیرہ کی زیارت کرتا ہے۔ اس کی وجہ سے ابتدائی تاریخِ اسلام کی واقفیت پیدا ہوتی ہے اور دل میں ترقّیٔ مِلّت کا جذبہ اور جوش پیدا ہوتا ہے اور اگر دل میں ذرّہ برابر بھی ایمان ہو تو وہ جوش و جذبہ مستقل ہو جاتا ہے۔

۹۔ حاجی حضور سرکارِ دو عالمؐ کے روضۂ اقدس پر بھی حاضر ہوتا ہے اور آپ کی سچی محبت اور فیضِ روحانی سے مالا مال ہو کر واپس آتا ہے۔ اس نعمت کا مقابلہ اور کوئی چیز بھی نہیں کر سکتی۔

۱۰۔ کعبۃ اللہ تمام ملّتِ اسلامیہ کا مرکز ہے۔ شمال جنوب، مشرق مغرب ہر طرف کے مسلمان اسی طرف منہ کر کے نماز ادا کرتے ہیں۔ اِس لیے کعبہ کی جو عظمت و بزرگی مسلمانوں کے دل میں ہے اُس کے بیان کی ضرورت نہیں، وہ امیر ہوں یا غریب، نیک اور پارسا ہوں یا گنہگار اور فاسق و فاجر، کعبہ کی حفاظت و دفاع کے لیے بے تامّل اپنا جان و مال اور آل و اولاد قربان کر سکتے ہیں۔ اسی کعبہ کے طواف کو ہر سال ہزار ہا مسلمان اطرافِ عالم سے اکٹھے ہوتے ہیں، اگر ہمارے مذہبی اور سیاسی رہنماء تھوڑے سے خلوص اور محنت سے کام کریں تو یہاں ایک ایسا مرکز قائم ہو سکتا ہے جس سے تمام دُنیا کے مسلمانوں میں ارتباط و تعلّق پیدا کر کے اُن کی عالمگیر تنظیم کی جا سکتی ہے۔ یہ کام کچھ بھی مشکل نہیں، ایک دن ہو گا اور ہو کر رہے گا، دیکھنا صرف یہ ہے کہ یہ سعادت کس کی قسمت میں لکھی ہے۔

زکوٰۃ:

اور عبادات کی طرح زکوٰۃ بھی ایک ایسی مفید عبادت ہے جس کی مثال دُنیا کا اور کوئی مذہب پیش نہیں کر سکتا۔ زکوٰۃ میں ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس کے اجتماعی فوائد انفرادی

فائدوں سے کہیں زیادہ ہیں:۔

۱۔ زکوٰۃ دینے والوں میں ہمدردی، ایثار اور خدمت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے جو قومی بقا کے لیے ناگزیر ہے۔

۲۔ اگر ہمارے اُمراء زکوٰۃ نکالتے اور اُس کے ساتھ ہی خیرات بھی کرتے رہیں جس کا قرآن میں جا بجا حکم دیا گیا ہے تو ہماری قوم میں روپیہ کی تقسیم اس طرح ہو سکتی ہے کہ نہ تو کوئی اتنا مالدار بن سکتا ہے جتنے کہ یورپ، امریکہ اور ہندوستان کے سرمایہ دار، نہ اس قدر غریب رہ سکتا ہے کہ کھانے کو روٹی، پہننے کو کپڑا اور سر چھپانے کو جھونپڑا تک نہ ہو۔ اسلام نے دولت کی تقسیم کا یہ طریقہ جو رکھا ہے، عملی ہے۔ کمیونزم میں دولت کی تقسیم کا جو قاعدہ ہے اگرچہ بظاہر بڑا دل پسند ہے لیکن عملی و فطرتی ہرگز نہیں۔ یہ طریقہ کچھ عرصہ تک طاقت کے زور سے قائم رکھا جا سکتا ہے اور کون نہیں جانتا کہ جو قانون اور قاعدے صرف ڈنڈے کے بل بوتے پر نافذ کیے اور جاری رکھے جاتے ہیں اُن کی بُنیاد ریت پر ہوتی ہے۔ برخلاف ازیں جو قانون اور قاعدے عوام کی رضا اور خوشی پر قائم کیے جاتے ہیں ہمیشہ دیرپا ہوتے ہیں۔ عوام میں سے فطرتاً اور طبعاً کوئی برضا و رغبت اس بات کو نہیں مان سکتا کہ دن رات محنت اور خون پسینہ ایک کر کے جو کچھ کمائے گورنمنٹ کے حوالے کر دے، جس سے بڑے بڑے افسر تو مزے اُڑائیں اور وہ معمولی روٹی کپڑے پر گزارہ کرتا رہے۔

۳۔ ہمارے ہاں زکوٰۃ ادا کرنے کا طریقہ انفرادی ہے، جو شخص زکوٰۃ نکالتا ہے وہ اپنی مرضی سے جس کو مستحق سمجھتا ہے دے دیتا ہے۔ اگرچہ یہ بات بھی بہت اچھی ہے لیکن اگر ہر اسلامی مُلک میں ایک بیت المال بنایا جائے اور تمام مُلک کی زکوٰۃ کا روپیہ اس میں جمع کر کے انفرادی اور اجتماعی دونوں قسم کی ضرورتوں پر خرچ کیا جائے تو چند ہی سال میں قوم نہ

صرف اقتصادی بلکہ اخلاقی اور سیاسی اعتبار سے بھی ترقی کے چرخِ چہارم پر پہنچ سکتی ہے۔

۴۔ انفرادی فوائد یہ ہیں کہ مستحق غریبوں اور محتاجوں کو فرداً فرداً اتنی مدد دی جاسکتی ہے کہ انہیں بھیک نہ مانگنا پڑے، یہی نہیں بلکہ ان کو ایسی مدد بھی دی جاسکتی ہے جس سے وہ اپنے گزارے کا کوئی مستقل ذریعہ قائم کرلیں اور آئندہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے افلاس اور دریوزہ گری سے مامون ومحفوظ ہوجائیں۔

۵۔ سڑک پر پڑے ہوئے اندھوں، لنگڑے لولے محتاجوں اور اپاہجوں کے لیے محتاج خانے قائم کیے جاسکتے ہیں۔ اس سے دوگونہ فائدہ ہوسکتا ہے، ایک تو یہ کہ ان اپاہجوں کی زندگی آرام سے گزرے گی، دوسرے یہ کہ بیرونی مہذّب ممالک کے باشندے بازاروں اور شاہراہوں پر ان محتاجوں اور اپاہجوں کے لشکر کو دیکھ کر ہمارے متعلق جو حقارت آمیز خیال قائم کرلیتے ہیں، نہ کرسکیں گے اور ہمارے قومی وقار کو ٹھیس نہ لگے گی۔ تیسرا فائدہ یہ بھی ہوگا کہ ہمارے آوارہ اور کاہل نوجوانوں کے دل میں ان گداگروں کو دیکھ کر جو بے محنت ومشقت رزق پیدا کرنے کا خیال پیدا ہوسکتا ہے، نہ ہوسکے گا۔

۶۔ یتیم خانے قائم کیے جاسکیں گے اور قوم کے ہزاروں قابل دماغ بچے جو بے یار و مددگار ہونے کی وجہ سے غربت وذلّت کی زندگی بسر کرتے کرتے برباد ہوجاتے ہیں، تباہی سے بچ جائیں گے اور قوم کے اچھے شہری ثابت ہوں گے۔

۷۔ ہونہار طلباء کو جو غربت کی وجہ سے اعلیٰ تعلیم سے محروم رہتے ہیں، وظیفے دے کر اعلیٰ تعلیم دلائی جاسکے گی۔

۸۔ قرضہ کے فکر سے انسان ہمیشہ پریشان رہتا ہے اور اس کی قوّتِ عمل دماغی کوفت کی وجہ سے مفلوج ہوجاتی ہے۔ لیکن زکوٰۃ کا روپیہ چونکہ قرض نہیں دیا جاسکتا امداداً دیا جائے

گا، اِس لیے لینے والوں کے سر پر کوئی بوجھ نہ رہے گا اور وہ بے فکری سے کام کرسکیں گے۔

۹۔ قوم میں غربت کے فقدان سے جو عام اُمنگ اور اُپج ترقی کے لیے پیدا ہوتی ہے وہ بڑی آسانی سے عوام میں پیدا ہو جائے گی۔

۱۰۔ بیت المال کے روپیہ سے ایسے مجاہدین کے اہل وعیال کی کفالت ہو سکے گی جو میدانِ جنگ میں شہید ہوں یا قوم کے لیے کوئی دوسرا خطرناک کام کرتے ہوئے مرجائیں یا مارے جائیں۔ مسلمانوں میں اسلامی عزت ووقار کے لیے خطرناک کام کرنے اور میدان جہاد میں جان قربان کر دینے والوں کی ہرگز کمی نہیں۔ کونسا مسلمان ہے جو رسول کریمؐ سے محبت نہیں کرتا اور حضورؐ کی امّت یا حضورؐ کی تعلیم کو تباہی سے بچانے کے لیے جان قربان نہیں کرسکتا؟ لیکن یہ خیال کہ ہمارے بعد بال بچے کیا کریں گے، ایسی رکاوٹ ہے جو بڑے سے بڑے بہادروں کے پاؤں میں زنجیر ڈال دیتی ہے۔ اِس لیے جب اُن کو یقین ہو جائے گا کہ مرنے کے بعد ہمارے پسماندگان کو کوئی تکلیف نہ ہوگی تو یقیناً کسی مسلمان کو بھی شہادت جیسی نعمت حاصل کرنے میں تامل باقی نہ رہے گا۔

اکثر علمائے دین کی رائے ہے کہ زکوٰۃ کا روپیہ حکومت کے نظم ونسق اور ترقیات کی دوسری مدوں پر خرچ نہیں کیا جاسکتا، صرف غریبوں اور محتاجوں کی مدد کے لیے ہی دیا جاسکتا ہے۔ ان بزرگوں کی توجہ ہم مندرجہ بالا نکات کی طرف خاص طور سے مبذول کراتے ہیں کہ یہ تمام مَدّات ایسی ہیں جن میں صرف غریبوں اور محتاجوں ہی پر روپیہ خرچ کرنے کا مشورہ دیا گیا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ اب انفرادی طور پر بے قاعدہ اور بے ڈھنگے طور سے خرچ ہوتا ہے، بیت المال کے ذریعہ باقاعدہ اور زیادہ مفید طور پر خرچ ہو سکے گا۔

جہاد:

جہاد بھی اسلام کی ایک عدیمُ النّظیر عبادت ہے۔ اس کی اہمیت اور قدر و قیمت کا صحیح

اندازہ ناممکن ہے۔ دوسری تمام عبادتوں سے مسلمانوں میں جو اخلاقی خوبیاں اور قوّتیں پیدا ہوتی ہیں اور جو کردار بنتا ہے، جہاد اُن سب کی کسوٹی اور امتحان ہے۔ اگر دوسری عبادتیں انفرادی اور اجتماعی تعمیر کے لیے ہیں تو جہاد اس تعمیر کو قائم اور باقی رکھنے کے لیے ہے۔ اور عبادتیں اگر زندہ رہ کر کی جاتی ہیں تو یہ جان دے کر ادا ہوتی ہے۔ جب تک جہاد کی روح زندہ رہی مسلمانوں کے تمام مخالف لرزہ براندم رہے۔ جب یہ روح مر گئی، قوم بھی مر گئی۔ یہ روح کیوں مری؟ ایمان کی کمزوری، عبادات سے تغافل، قرآن سے بے اعتنائی اور چار دن کی زندگی کے عشق سے۔ دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ مذہب اور تعلیمِ قرآنی کی طرف سے بے پروائی اور حالاتِ جہاں سے بے خبری کے سبب پیروانِ اسلام اُس پروپیگنڈے کا شکار ہو گئے جو صدیوں تک یورپ اور بالخصوص انگریز کی طرف سے مسلمانوں میں مذہبِ اسلام اور خصوصاً جہاد کے خلاف بڑے زور و شور سے ہوتا رہا۔ اس پروپیگنڈے کا نقطۂ ماسکہ یہ تھا کہ مسلمان غیر مسلموں کو بنوکِ شمشیر اسلام لانے پر مجبور کرتے ہیں اور جو کوئی انکار کرتا ہے اسے تہِ تیغ کر دیتے ہیں، اسی کا نام جہاد ہے اور یہ بات پرلے درجے کی وحشت و بربریّت اور ننگِ انسانیت ہے۔ لطف یہ ہے کہ یہ پروپیگنڈہ وہ یورپ اور انگریز کر رہا تھا جو خود دو سو برس تک مذہب کے نام پر مسلمانوں سے صلیبی لڑائیاں لڑتا رہا۔ اس پروپیگنڈے کا اصل مقصد تو یہ تھا کہ تمام دنیائے عیسائیت کو مسلمانوں کے خلاف میدانِ جنگ میں اکٹھا کر دیا جائے لیکن بعد کی صدیوں میں جب مسلمانوں میں مذہب کی طرف سے بہت زیادہ بے پروائی پیدا ہو گئی تو وہ خود اس سے متاثر ہونے لگے اور الزام کا جواب دینے کی بجائے خود جہاد کی افادیت کی طرف سے ہی شک میں پڑ گئے۔ نہ صرف یہ بلکہ بہت سے لوگوں نے تو جہاد کے جواز یا فی الوقت ضروری ہونے ہی سے انکار کر دیا۔

اب مسلمانوں کو اگر بحیثیت مسلمان زندہ رہنا ہے تو اس روح جہاد کو پھر زندہ کرنا چاہئے۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے اور بیرونی دُنیا کو بھی سمجھا دینا چاہئے کہ جہاد غیر مسلم ممالک پر قبضہ جمانے، لوٹ مار سے روپیہ اور مالِ غنیمت یا دوسرے دنیاوی منافع حاصل کرنے کے لیے ہرگز نہیں کیا جاتا۔

قرآنی اور اسلامی تعلیم کے مطابق جو مسلمان اس نیّت سے جنگ کرتے ہیں ان کو ہرگز جہاد کا ثواب اور مجاہد یا شہید کا مرتبہ نہیں ملتا۔ جہاد کسی حیثیت سے بھی جارحانہ اقدام نہیں بلکہ اس کی حیثیت خالصتاً مدافعانہ ہے۔ سرورِ کائناتؐ کے زمانہ میں جس قدر غزوات یا سریات ہوئے سب کی نوعیت مدافعانہ تھی۔ قصّہ مختصر جہاد صرف دفاعی جنگ ہے جو صرف اس وقت لڑی جاتی ہے جب کسی اسلامی مُلک پر کوئی غیر مسلم طاقت حملہ کردے یا اپنے مُلک میں ایسی تیاریاں کرے جس سے مسلمانوں یعنی اسلام کو خطرہ ہو۔ بہت سے مسلمان یہاں تک کہہ گزرتے ہیں کہ اگر دُنیا میں ایک بھی مسلمان باقی نہ رہے، اسلام تب بھی فنا نہیں ہو سکتا، اللہ تعالیٰ کسی اور قوم کو مسلمان کردے گا۔ ایسے فقرے یہ لوگ درحقیقت بُری نیّت سے نہیں کہتے بلکہ مقصود اسلام کی حقانیت جتانا ہوتا ہے، لیکن اہلِ نظر جانتے ہیں کہ کون سی چیز ان کے دل و دماغ کی گہرائیوں میں چھپی ہوئی ہے جو اس قسم کے الفاظ اُن کے منہ سے نکلواتی ہے۔ یہ چیز ہے ایمان کی کمزوری، اپنے اوپر انتہائی بے اعتمادی، بے عملی، سُستی، کاہلی اور دنیائے فانی کے مال ومنال اور اہل وعیال کی محبت۔ مومن کبھی ایسا خیال بھی نہیں کر سکتا، وہ تو اسلام کی عزت کو بچانا اپنا فرض اور سعادت سمجھتا ہے اور جب ضرورت ہوتی ہے اس یقین کے ساتھ جہاد میں شریک ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نصرت اور فتح ہمارے ساتھ ہے اور ہم ضرور کامیاب ہوں گے۔ جب تک مومن اس سطحِ زمین پر باقی تھے، دُنیا نے ہزاروں

مرتبہ انکے اس عقیدے پر مُہرِ تصدیق ثبت کی ہے۔

اب رہا غیر مسلموں کا اعتراض تو اُس کا ایک جواب تو اوپر دیا جا چکا ہے کہ جہاد ہرگز ہرگز جارحانہ نہیں بلکہ مدافعانہ جنگ کو کہتے ہیں۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ تم خود کیوں دوسو برس تک مذہب کے نام پر مسلمانوں سے صلیبی لڑائیاں لڑتے رہے ہو۔ تیسرا جواب یہ ہے کہ اگر مذہب کے نام یا مذہب کے تحفظ کے لیے جنگ کرنا شیوۂ بربریّت ہے تو آج بے دین کمیونزم کے خلاف ''دیندار'' ملکوں کا اتّحاد کیوں کرایا جا رہا ہے۔

الحمدللہ کہ عبادات کا بیان ختم ہوا۔ اب معاملات اور اخلاق و آداب کا بیان سنئے:۔

معاملات اور اخلاق و آداب

انسان صبح سے شام اور شام سے صبح تک کچھ نہ کچھ کرتا رہتا ہے۔ اُس کے یہ تمام افعال تین حصوں میں تقسیم کیے جاسکتے ہیں۔

۱۔ وہ فعل جن میں اس کا واسطہ صرف خدا سے ہوتا ہے، یہ حقوق اللہ کہلاتے ہیں۔

۲۔ وہ فعل جو صرف اُس کی اپنی ذات تک محدود ہوتے ہیں، ان کو حقوقِ ذاتی یا حقوقِ نفسی کہتے ہیں۔

۳۔ وہ فعل جو اُس کی ذات اور مخلوق کے کسی دوسرے فرد یا افراد سے متعلق ہوتے ہیں، ان کو معاملات کہا جاتا ہے۔ اِن حقوق کو انسان جس طریقے اور نہج سے ادا کرتا ہے اس کا نام اخلاق ہے۔ مثلاً اگر کوئی آدمی اپنے کسی حق کو نرمی، خوش اسلوبی اور بخوشیٔ خاطر ادا کردے تو یہ اخلاقِ حسنہ یا خوش خُلقی کہلائے گا اور اس آدمی کو خوش خُلق کہیں گے۔ لیکن اگر کوئی آدمی اپنے حقوق ادا تو کرے لیکن سختی و درشتی، بداسلوبی، کراہت یا لیت و لعل سے ادا کرے تو اس طریقہ کو بد اخلاقی اور ایسے آدمی کو بد اخلاق کہا جائے گا۔

ہر قوم اور مذہب میں اِن حقوقِ سہ گانہ کو بجا لانے کا ایک دستور ہوتا ہے۔ جس قوم کی اکثریت اپنے دستور پر جس قدر ہم آہنگی، یکسانیت اور سرگرمی سے عمل کرتی ہے اسی قدر وہ قوم آرام و آسائش اور راحت و عزّت سے زندگی گزار سکتی ہے۔ ہر قوم کی طاقت و قوّت اس دستور کی ساخت پر بھی منحصر ہوتی ہے، یعنی جس قدر یہ دستور کسی قوم کی مقتضیاتِ ذہنی و

جسمانی کے مطابق ہوتا ہے، اسی قدر وہ قوم طاقتور اور خوش حال ہوتی ہے۔ ملتِ اسلامیہ کا دستور قرآن ہے جو الہامی کتاب ہے۔ ظاہر ہے کہ انسان کی فطرت وطبیعت اور مقتضیات کو جس قدر انسان کا بنانے والا سمجھ سکتا ہے خود انسان بھی ہرگز نہیں سمجھ سکتا۔ اِس لیے ہمارا دعویٰ ہے کہ ہمارا یہ دستور دنیا کا سب سے مکمّل اور بے نقص دستور ہے۔ خصوصاً اِس لیے کہ یہ دُنیا کا آخری اور مکمّل ترین دستور ہے۔ جو لوگ اس دستور کو ماننے کا دعویٰ کرتے ہیں اگر وہ اس پر پوری طرح عمل کریں تو ناممکن ہے کہ انفراداً یا اجتماعاً کسی لحاظ سے بھی گھاٹے میں رہیں۔ ہمارے زوال کی پہلی اور بڑی وجہ یہی ہے کہ ہم اس دستور پر پوری ہم آہنگی اور سرگرمی سے عمل نہیں کرتے۔ اس دستور میں حقوق اللہ، حقوقِ نفسی اور حقوق العباد سب بتا دیئے گئے ہیں، اگر ہمارے تمام فرقے اُن اُصولوں پر سختی سے کاربند ہو جائیں اور فروعات یا اپنے خود ساختہ غلط اُصولوں کے لیے ایک دوسرے کا سر نہ پھوڑیں اور دُنیا کے قلیل نفع کی خاطر دین اور قوم کو دشمنوں کے ہاتھ نہ بیچیں جیسا کہ ہو رہا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہمیں وہی طاقت و عظمت پھر حاصل نہ ہو جائے جو قرنِ اوّل میں حاصل تھی۔ اب ہم متذکرہ صدر حقوق سہ گانہ کا بیان کرتے ہیں۔

حقوق اللہ:

اگر تم مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتے ہو تو تم کو اس بات پر یقینِ محکم ہونا چاہئے کہ تم کو اللہ نے پیدا کیا ہے، وہی تم کو رزق دیتا ہے، وہ جو کچھ کرتا ہے تمہاری بہتری اور بہبودی کے لیے کرتا ہے، وہی تم کو مارے گا اور تمہاری موت کے بعد وہ مختار ہے کہ تمہیں سزا دے یا بخش دے۔ اگر تم کو یہ یقینِ محکم حاصل ہے تو تم پر فرض ہے کہ اللہ کی محبت، اطاعت، شکر اور خوف و رجا کے جذبات سے ہر وقت اپنے دل کو معمور رکھو۔ نعمتوں اور راحتوں کے لیے اس

کا شکر بجا لاؤ اور مصائب و تکالیف کے وقت اُسی کی طرف رجوع کرو اور اُسی کی عبادت کرو۔ یعنی وہ تمام احکام بجا لاؤ جو قرآن میں موجود ہیں۔ چونکہ اس کا بیان پہلے مفصل کیا جا چکا ہے اِس لیے اب حقوقِ نفسی بیان کیے جاتے ہیں۔

حقوقِ نفسی:

اللہ تعالیٰ نے سورۂ بقرہ میں حکم دیا ہے کہ اپنی جان کو ہلاکت میں نہ ڈالو، یعنی اس کی حفاظت کرو اور سورۂ مائدہ میں ارشاد فرمایا ہے ''اے ایمان والو تم پر اپنی جان کی فکر لازم ہے''

رسول اللہؐ فرماتے ہیں: وَلِنَفْسِکَ عَلَیْکَ حَقٌّ

یعنی ''تیرے نفس کا تجھ پر حق ہے'' اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ انسان کو سب سے پہلے اپنے نفس کی بقاء اور درستی کی کوشش کرنی چاہیے۔ حقوق اللہ اور حقوق العباد بھی اس کے بعد ہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر آدمی کا نفس ہی ہلاک ہو جائے یعنی آدمی مر جائے تو وہ نہ حقوق اللہ ادا کر سکتا ہے نہ حقوق العباد۔ اسی طرح یہ بھی ظاہر ہے کہ آدمی جتنا بیمار، کمزور، کم عقل، کم علم اور نا تجربہ کار ہو گا اتنا ہی اللہ اور مخلوق کے متعلق اپنے فرائض اچھی طرح انجام دینے میں قاصر رہے گا۔ اِس لیے انسان کو چاہیے کہ اُس کی اپنی ذات کے متعلق جو حقوق و فرائض اس پر عائد ہوتے ہیں سب سے پہلے اُن کو پوری طرح انجام دے۔ وہ فرائض یہ ہیں۔

۱۔ صحت ۲۔ علم و تجربہ ۳۔ عزّتِ نفسی ۴۔ خود اعتمادی ۵۔ عمل

اب ہر ایک کا بیان الگ الگ کیا جاتا ہے۔

۱۔ صحت:

قیامِ صحت کے لیے یہ باتیں ضروری ہیں:

۱۔ طہارت: جسم کی، لباس کی اور خیالات کی۔ جسم اور لباس کی طہارت کا بیان پیچھے کیا جا

چکا ہے، خیالات کی پاکیزگی ایمانِ کامل، صحیح قسم کی نماز اور اللہ کے خوف سے پیدا ہوتی ہے اس کا بیان بھی کیا جا چکا ہے۔

۲۔ غذا: غذا ایسی کھانی چاہیے جو زود ہضم اور زیادہ خون پیدا کرنے والی ہو۔ کھانا اُس وقت کھانا چاہیے جب خوب بھوک لگے اور دو نوالے کی اِشتہا باقی رہ جائے تو ہاتھ روک لینا چاہیے۔ غذا آہستہ آہستہ اور خوب چبا کر کھائی جائے۔ کھاتے وقت طبیعت خوب خوش اور بشّاش ہونی چاہیے۔ تفکّر اور غصّہ کی حالت میں کھایا ہوا کھانا اچھی طرح جزوِ بدن نہیں ہوتا۔ گوشت جہاں تک ہو کم کھایا جائے کیونکہ اس سے غصّہ اور بہیمیت زیادہ پیدا ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے گوشت کو جائز قرار دیا ہے مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ دونوں وقت بغیر گوشت کے لقمہ ہی نہ ٹوٹے۔ گوشت دماغ میں گرمی پیدا کرتا ہے حالانکہ دُنیا میں کامیابی کے لیے ٹھنڈے مزاج کی اشد ضرورت ہے۔

۳۔ لباس: سادہ پائدار اور کم قیمت پہننا چاہیے۔ قیمتی اور بھڑکیلے لباس سے غرور و نخوت پیدا ہوتی ہے۔ لیکن یہ ضروری ہے کہ لباس پاک، صاف ستھرا اور وضع قطع کے لحاظ سے دیدہ زیب اور حدودِ شرعی کے اندر قومی فیشن کے مطابق ہو۔ لباس گرمی سردی وغیرہ کے لحاظ سے موسم کے مطابق آرام دہ ہونا چاہیے۔ زیادہ قیمتی لباس سے زندگی کے اور اخراجات بھی بہت بڑھ جاتے ہیں۔

۴۔ مکان: مکان پکّا ہو یا کچّا، محل ہو یا جھونپڑی، آئینہ کی طرح صاف سُتھرا ہونا چاہیے۔ گندے مکان کا اثر مکینوں کے مزاج اور ذہن پر ہمیشہ بُرا ہوتا ہے۔

۵۔ پابندیٔ اوقات: اس کا صحت پر بہت ہی اچھا اثر پڑتا ہے کیونکہ زندگی باقاعدہ گزرتی ہے۔ دن رات چوبیس گھنٹوں کو اس طرح بانٹا جائے کہ کام، عبادت اور تفریحات سب کے

لیے مناسب وقت مل جائے۔ قیامِ صحت اور پابندیٔ اوقات کے لیے سب سے پہلی اور سب سے ضروری بات یہ ہے کہ رات کو انسان جلد از جلد سو جائے اور صبح سورج نکلنے سے کم از کم ایک گھنٹہ قبل ضرور ہی اٹھ بیٹھے۔ رات کو زیادہ دیر تک جاگنا، زیادہ پڑھنا اور دیر تک کھیلنا صحت کے لیے سمِّ قاتل سے کم نہیں۔ صبح سویرے اٹھنے کے فوائد کون نہیں جانتا۔

۶۔ **غسل**: غسل روزانہ کرنا چاہیۓ۔ پانی موسم کے لحاظ سے اپنی مرضی کے مطابق گرم یا سرد ہونا چاہیۓ۔

۷۔ **عبادت**: صحت کے قیام کے لیے عبادت بھی بہت ضروری ہے۔ اس سے دماغ کو سکون اور دل کو طاقت اور راحت حاصل ہوتی ہے اور تفکّرات کا بوجھ ہلکا ہوتا ہے۔

۸۔ **ورزش اور کھیل کود**: یہ بھی بہت ضروری اور اہم ہیں خواہ دیسی ہوں یا مغربی قسم کے۔ ورزش کا بہترین وقت قبل از طلوعِ آفتاب اور کھیلوں کا بہترین وقت عصر اور مغرب کے درمیان ہے۔ جو لوگ ورزش نہ کر سکیں ان کو صبح سورج نکلنے سے پہلے اور شام کو مغرب کے بعد یا ذرا پہلے اس قدر چہل قدمی کرنا چاہیۓ کہ کسی قدر تکان ہو جائے۔

۹۔ **کام**: کام اتنا کیا جائے کہ تکان ہو جائے۔ دماغی اور تحریری کام کرنے والوں کو کھانا کھانے کے کم از کم ڈیڑھ گھنٹہ بعد کام شروع کرنا چاہیۓ، ایسے لوگوں کو صبح کا ناشتہ اور دوپہر کا کھانا ہلکا اور کسی قدر کم کھانا چاہیۓ۔ کام میں لگے رہنے سے صرف صحت ہی اچھی نہیں رہتی بلکہ رنج و غم اور تفکّرات بھی پاس نہیں پھٹکنے پاتے۔

۱۰۔ **تفریح**: کام ختم کرنے اور رات کا کھانا کھانے کے بعد کچھ دیر تفریح کرنا بھی ضروری ہے۔ بہترین تفریح یہ ہے کہ دوستوں یا اپنے بال بچوں میں بیٹھ کر خوب ہنسی، دل لگی اور مذاق کی باتیں کی جائیں۔ خوب ہنسو اور ہنساؤ۔

جب کھانا تحلیل ہو جائے تو عشاء کی نماز پڑھتے ہی سو جاؤ۔ یہ ہیں وہ باتیں جو صحت کے لیے ضروری ہیں۔ لیکن ایک مسلمان کے لیے صرف صحت کا تحفظ ہی کافی نہیں بلکہ ہر مسلمان کو اتنی جسمانی طاقت بھی پیدا کرنی چاہئے کہ وہ بیک وقت کم از کم دو کافر دشمنوں کا مقابلہ کر سکے۔ اسلام کی عزّت اور اپنے ناموس کی حفاظت کے لیے یہ چیز آج کل بہت ہی ضروری ہے۔

۲۔علم اور تجربہ:

زندگی آرام و عزّت سے گزارنے کے لیے علم و تجربہ حاصل کرنے کی اشد ضرورت ہوتی ہے اس سے عقل بڑھتی ہے۔ کسبِ معاش میں سہولت ہوتی ہے اور دنیا میں عزّت ملتی ہے۔ علم ایسا حاصل کرنا چاہئے جس سے دین اور دنیا دونوں کی سمجھ پیدا ہو اور قوم کی انفرادی اور اجتماعی ترقی میں مدد ملے۔ تجربہ حاصل کرنے کے لیے مختلف قسم کی صحبتوں میں بیٹھنا اور لوگوں کے افعال و اقوال اور حرکات وسکنات کا بغور مطالعہ کرنا چاہئے۔ سفر سے تجربہ حاصل کرنے میں بے انتہا مدد ملتی ہے۔ ممکن ہو تو ہر سال ایک مرتبہ دو ایک دن کے لیے تفریحاً آس پاس کے شہروں، جنگلوں اور دیہات میں جانے کا تو ضرور ہی بندوبست کرنا چاہئے۔ اچھے مصنفوں کی کتابیں علم و تجربہ دونوں کو بڑھانے میں قابلِ قدر مدد دیتی ہیں۔

۳۔عزّتِ نفسی:

شرافت اور نیکی پر قائم رہنے کے لیے ضروری ہے کہ انسان خود اپنی نظر میں عزّت والا ہو۔ جو شخص خود اپنی نظر میں ذلیل ہوگا دوسروں کی نظر میں ہرگز معزّز نہیں ہوسکتا۔ اگر دھوکہ یا غلطی سے کچھ لوگ اس کی عزّت کریں تو آخر میں قلعی کُھل جائے گی۔ اپنی نظر میں

انسان کی عزّت اسی حالت میں قائم رہ سکتی ہے جب وہ نیک ہو۔ عزّتِ نفسی قائم رکھنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ تنہائی میں بھی انسان کے خیالات پاکیزہ رہیں اور کسی بُرے کام کا خیال بھی آئے تو وہ شرمندہ ہو جائے لیکن یہ اُسی وقت حاصل ہو سکتا ہے جب وہ اللہ کو حاضر و ناظر محسوس کرتا ہو اور یہ بات جیسا کہ بیان ہو چکا ہے ایمانِ کامِل ہی سے پیدا ہوتی ہے۔

۴۔ خود اعتمادی:

دُنیا میں کامیاب زندگی گزارنے کے لیے بڑی شرط یہ ہے کہ انسان کو خود اپنے اوپر اعتماد ہو۔ اعتماد اس بات پر کہ میں اس کام کو واقعی پوری قابلیت سے انجام دے سکتا ہوں۔ اعتماد اس بات پر کہ میں ایسی کوئی حرکت قبیح اور ناشائستہ نہیں کر سکتا جس سے اللہ کی حکم عدولی ہوتی ہو۔ اعتماد اس بات پر کہ میں شریف ہوں، مسلمان ہوں اور مومن ہوں۔

۵۔ عمل:

دنیا اور دین میں کامیابی کے لیے عمل بھی ضروری چیز ہے، عمل کے بغیر کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا۔ انسان کتنا ہی عقلمند ہو، عالم اور فاضل ہو، جب تک عمل نہ کرے گا پتھر کی طرح اپنی جگہ سے آگے نہ بڑھ سکے گا۔ اِس لیے علم و تجربہ حاصل کرنے کے بعد اپنا ایک نصب العین مقرّر کر لینا چاہیئے کہ میں زندگی میں فلاں شے یا فلاں مرتبہ حاصل کر کے رہوں گا۔ پھر اس نصب العین کو حاصل کرنے کے لیے ایک دستور العمل بنانا چاہیئے۔ پھر خوب کوشش کرنی چاہیئے کہ وہ نصب العین حاصل ہو جائے۔ نصب العین اپنے ذرائع کی ممکن حدود کے مطابق ہونا چاہیئے، ایسا نصب العین ہرگز مقرّر نہ کرنا چاہیئے جس کا حصول ممکن ہی نہ ہو۔ ہاں جب ایک نصب العین حاصل ہو جائے تو البتہ دوسرا اور پہلے سے اعلیٰ نصب العین متعیّن کر کے اس کے حصول کی کوشش شروع کی جا سکتی ہے، یہاں تک کہ عمر تمام ہو

جائے۔ مطلب یہ کہ خالی اور بیکار پڑے رہنا کسی طرح بھی شریف انسان کے شایانِ شان نہیں۔ جانور بھی بیکار نہیں رہتے اپنی اپنی بساط کے مطابق کچھ نہ کچھ کرتے ہی رہتے ہیں۔ اب حقوق العباد کا بیان سنئے۔

حقوق العباد:

تمام حیوانات کی فطرتی صفت ہے کہ اپنے اپنے ہم جنسوں کے ساتھ مل کر رہتے ہیں۔ انسان میں بھی یہ صفت ہے اور بدرجۂ اتم ہے۔ حیوانات میں چونکہ عقل نہیں اور ان کی ضروریاتِ زندگی مختصر ہیں اِس لیے وہ ابتدائے آفرینش سے جس حالت میں تھے اسی میں آج بھی ہیں۔ لیکن انسان کا حال اس سے مختلف ہے۔ وہ اسی پر بس نہیں کرتا کہ پیٹ بھرنے کو کوئی چیز میسر آجائے اور گرمی سردی وغیرہ سے بچنے کو مامَن موجود ہو بلکہ اسے اور بھی کئی چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے، مثلاً لباس کی، درندوں اور دشمنوں سے حفاظت کے لیے ہتھیاروں کی اور اس بات کی کہ جہاں قدرتی طور پر غذا موجود نہ ہو یا موسم کی سختیوں سے بچنے کے لیے مساکنِ میسّر نہ آسکیں وہاں اپنی عقلِ خداداد سے کام لے کر یہ چیزیں خود پیدا کرے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ اس میں ایک صفت ایسی عجیب و غریب ہے جو جڑ اور بُنیاد ہے ساری تمدّنی ترقی کی، وہ صفت یہ ہے کہ وہ اپنی زندگی کے ہر شعبہ میں چھوٹی سے چھوٹی تکلیف کو بھی بے حد محسوس کرتا اور اُس کو دُور کر کے زیادہ سے زیادہ آرام حاصل کرنے کی کوشش میں دن رات مصروفِ عمل رہتا ہے مثلاً ابتدا میں انسان صرف پیدل سفر کرتا اور اپنا بوجھ خود اٹھا کر لے جاتا تھا۔ اس تکلیف سے بچنے کے لیے اس نے جانور سدھائے اور استعمال کیے۔ لیکن جب اس میں بھی تکلیف محسوس ہوئی تو گاڑی بنائی، اس سے بھی تسلّی نہ ہوئی تو ریل ایجاد کی اور پانی کے جہاز بنائے۔ کچھ دن تو بہت خوش رہا لیکن جلد ہی اِن سے

بھی اُکتا گیا تو موٹر اور آخر کار ہوائی جہاز بنا ڈالا۔ لیکن مطمئن اس پر بھی نہیں ہے اب چاہتا ہے کہ ایسی سواریاں ایجاد کرے جو اِن ہوائی جہازوں سے بھی زیادہ سریع السّیر اور آرام دِہ ہوں اور جو صرف اس زمین پر ہی نہیں بلکہ آسمان میں چاند اور ستاروں تک چشم زدن میں پہنچا سکیں۔ بالفرض یہ بھی ہو گیا تو پھر یہی حضرت انسان یوں فرمائیں گے کہ میاں ان جہازوں میں بیٹھ کر جانے کے جھنجھٹ میں کون پڑے۔ کوئی ایسی ترکیب ہونی چاہئے کہ گھر میں چارپائی پر لیٹے لیٹے جہاں جی چاہا پہنچ گئے۔ چنانچہ یہ نظریہ اس وقت بھی دماغوں میں موجود ہے اور کوشش ہو رہی ہے کہ وائبریشن کے ذریعہ ٹھوس مادّے کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے کی کوئی ترکیب معلوم کی جائے اور انسان ایک جگہ بیٹھے بیٹھے اس طرح دُور دراز مقامات تک پہنچ جائے جیسے ٹیلی ویژن کے نظّارے۔ ملاحظہ فرمایا آپ نے یہ صرف نقل و حمل کے شعبہ کا ذکر ہے۔ دوسرے شعبوں میں جو کچھ ہوا ہے اور جو کچھ ہو رہا ہے وہ بھی کچھ کم عجیب نہیں۔ طرح طرح کی مصنوعی غذائیں، لباس، مکانات اور ہتھیار بنانے کے لیے زمانۂ حجریہ سے اب تک جو کچھ ہوا ہے پیشِ نظر ہے اور جو کچھ ہونے والا ہے اس کے دُھندلے دُھندلے سائے ابھی سے نظر آ رہے ہیں۔

الغرض یہ ہے وہ صفت جس کی وجہ سے تمام علوم وجود میں آئے۔ سائنسی اکتشافات اور ایجادات ہوئیں اور تمدّن ترقی کرتے کرتے وہاں آ پہنچا جہاں آج ہے۔ ظاہر ہے کہ آرام و آسائش کے یہ اسباب و ذرائع ایک اکیلا آدمی کسی طرح بھی مہیّا نہیں کر سکتا تھا۔ اِس لیے ضروری ہوا کہ بہت سی جماعتیں ایک جگہ مل کر اکٹھی رہیں اور سب ایک دوسرے کی مدد کریں، اس طرح بستیوں کی بُنیاد پڑی۔ اب چونکہ ہر بستی میں رہنے والی جماعتوں کے کام اور پیشے مختلف لیکن ضروریاتِ زندگی مشترک تھے، اِس لیے آپس کے میل جول اور لین دین

کے بغیر افراد کا گزارہ ہی ممکن نہ تھا۔ اس کے ساتھ ہی چونکہ طبائع ایک دوسرے سے مختلف تھیں یعنی کوئی سُست اور کاہل تھا تو کوئی چُست و چالاک، ایک بیوقوف تھا تو دوسرا عقلمند، ایک ایماندار اور دیانتدار تھا تو دوسرا بے ایمان اور خائن، ایک صلح کل تھا تو دوسرا فسادی۔ اِس لیے ضرورت محسوس ہوئی کہ مل جل کر رہنے کے کچھ ایسے طریقے مقرّر کیے جائیں کہ ہر شخص اطمینان و آرام کی زندگی بسر کر سکے اور اپنی محنت کا پورا فائدہ اٹھا سکے۔ اس بات کو انسان کا خالق پہلے ہی جانتا تھا اور جانتا کیا تھا اُس پر فرض تھا کہ جب اس نے انسان کو اپنا خلیفہ بنا کر زمین پر بھیجا تو اس کو اس زمین پر رہنے کے ایسے طریقے بھی بتائے جو اس کی بقاء کے ضامن ہوں اور جن پر عمل کر کے وہ دن رات ترقی کرتا چلا جائے۔ چنانچہ اس خالق نے ابتداء ہی سے ہر مُلک و قوم میں منتخب اشخاص کو الہام اور وحی کے ذریعہ یہ طریقے تعلیم کیے اور جب ایک ہی انسان کا پیغام ساری دُنیا میں پہنچنے کے ذرائع پیدا ہو گئے تو اس نے ایک مکمّل اور آخری دستور حضور سرورِ کائناتؐ پر نازل فرما کر تمام اہلِ دُنیا تک پہنچا دیا۔ جن برگزیدہ انسانوں پر الہامات ہوئے یا کتابیں نازل کی گئیں وہ نبی یا مرسلین کہلائے اور جو تعلیم اس طرح دی گئی اُسی کا نام ''مذہب'' مشہور ہوا۔ اس تعلیمِ الٰہی میں تفصیلات کبھی نہیں دی گئیں صرف اُصول بتائے گئے تھے تا کہ تفصیلات انسان خود معلوم کر لے اور اُس کی ذہنی ترقی رُک نہ جائے۔ چنانچہ انہی اُصولوں پر انسان کی مختلف قوموں نے اپنی اپنی خصوصیات اور ضروریات کے مطابق تفصیلات بعد میں خود وضع کر لیں جو لیجسلیچر یا انسانوں کا بنایا ہوا قانون کہلائیں۔ اب جو قوم ان مذہبی یا انسانی قوانین پر جس قدر زیادہ ہم آہنگی اور سرگرمی سے عمل کرتی ہے، اتنی ہی زیادہ طاقتور اور خوشحال ہو جاتی ہے اور جس قوم میں یہ ہم آہنگی اور سرگرمیٔ عمل باقی نہیں رہتی وہ کمزور یا فنا ہو جاتی ہے خواہ اس کے قوانین دوسری قوموں سے

زیادہ افضل و اعلیٰ ہی کیوں نہ ہوں۔

ہمارا دستورِ زندگی قرآن ہے اور اُس میں اُن تمام معاملات کا بیان ہے جن کے لیے انسان کا واسطہ ایک دوسرے سے پڑتا ہے۔ قرآن میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ان معاملات کی تکمیل کیلئے ہم کو ایک دوسرے سے کیا کیا سلوک کس کس طرح کرنا چاہئے۔ اسی کو معاملات اور اخلاق و آداب کہتے ہیں۔ مسلمانوں نے اخلاق و آداب پر اب تک سینکڑوں قابلِ قدر کتابیں لکھی ہیں اور آج کل بھی لکھ رہے ہیں۔ لیکن چونکہ یہ کتابیں اکثر اس نظریہ پر مبنی ہوتی ہیں کہ دنیا فانی، ذلیل، کتیا، مردُود اور مُردار لاش ہے اور طالب دنیا، ذلیل، کُتّا، حرام خور اور خدا جانے کیا کیا ہے، اِس لیے آج کل جب کہ مسلمانوں کے پاس دُنیا یعنی دنیاوی نعمتیں اور طاقتیں پہلے ہی بہ منزلہ صفر کے ہیں، اس قسم کی کتابوں سے بجائے فائدے کے اُلٹا نقصان ہوتا ہے۔ یہ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ اس زمانہ کے بزرگوں کو ایسا ہی لکھنا چاہئے تھا کیونکہ اس وقت نعائمِ دنیوی کی بہتات سے دین اور ملّت خطرے میں تھی، لیکن آج جب کہ نعمت ہائے دنیوی کے فقدان سے دین و ملّت کو خطرہ لاحق ہے، ایسی کتابیں پڑھنا اور شائع کرنا جہاں تک دنیاوی طاقت کے حصول کا تعلق ہے، بہت ہی خطرناک ہے۔

اب ہم معاملات و اخلاق کا بیان شروع کرتے ہیں، لیکن ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ ان کی پوری اہمیت کن الفاظ میں ظاہر کریں۔ اتنا کہہ سکتے ہیں کہ ایمان، عقائد اور عبادات سب کی غرض و غایت یہ اور صرف یہ ہے کہ دُنیا اور آخرت دونوں میں راحت و آرام کی زندگی حاصل ہو اور یہ اس وقت تک نہیں ہوسکتا جب تک انسان معاملات میں صادق اور اخلاق میں کامِل نہ ہو جائے۔ بالفرض کوئی آدمی پانچ وقت نہیں بلکہ دس وقت نماز پڑھے، مہینہ بھر نہیں سال بھر روزے رکھے، ہر سال حج کرے اور زکوٰۃ دے لیکن دوسرے لوگوں کے

متعلق اپنے فرائض ادا نہ کرے، مثلاً بیوی بچوں کو نان نفقہ سے تنگ رکھے، لوگوں کا مال دھوکے سے ہضم کر جائے، غیبت کرے، جھوٹ بولے، چوری کرے، رشوت لے، فرائض منصبی دیانتداری سے ادا نہ کرے، کم تولے، کم ناپے، لوگوں کو لڑائے اور قوم میں تفرقہ ڈلوائے، تُند خُو، مغرور اور مغلوب الغضب ہو، دوسروں کو حقیر و ذلیل سمجھے اور ان سے سیدھے منہ بات کرنا اپنی توہین جانے تو آپ کا کیا خیال ہے وہ مرتے ہی جنت میں چلا جائے گا اور ان بداعمالیوں کی سزا نہ پائے گا؟ یا دنیا میں اس کو سچی عزّت و وقعت اور آرام و سکون کی زندگی میسّر آ جائے گی؟ ایسا آدمی مال و دولت کے انبار بھی جمع کر لے تو حقیقی عزّت اور قلبی راحت و سکون تو اُسے یقیناً اس دُنیا میں بھی میسر نہیں آ سکتا۔ اِس لیے یاد رکھو اور خوب یاد رکھو کہ معاملات و اخلاق کی جو حدود اللہ نے مقرّر کر دی ہیں اور جو طریقے کار برآری کے بتا دیئے ہیں، ان پر پوری سرگرمی اور تَندہی سے عمل کرنا بھی بالکل اسی طرح فرض ہے جس طرح نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج وغیرہ۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ تم قرآن کی بعض باتوں پر تو عمل کرو اور بعض پر نہ کرو۔

آگے بڑھنے سے پہلے دو باتیں بتا دینا بہت ہی ضروری ہیں کیونکہ یہی دو باتیں کُنجی ہیں تمام کامیابی کی۔ پہلی بات یہ ہے کہ معاملات کی کاربرآری میں جو حقوق دوسرے لوگوں کے تم پر عائد ہوتے ہیں، ان کو بغیر لیت و لعل اور بلا تعوق و تامّل جلد از جلد خوشی خوشی ادا کرو اور دوسری بات یہ ہے کہ تمہارے جو حقوق دوسروں کے ذمہ ہیں ان کو ہر حالت میں حاصل کر کے رہو۔ کبھی ڈھیل نہ دو خصوصاً جب کہ ان کا اثر تمہارے اہل و عیال، عزیز و اقربا اور قومی مفاد پر پڑتا ہو۔ اس پچھلی بات پر یہ اعتراض ہوسکتا ہے کہ اگر اس اُصول پر عمل کیا جائے تو پھر سخاوت اور ایثار کس کو کہتے ہیں۔ جواب یہ ہے کہ ایثار آپ اپنے ذاتی حقوق کی قربانی

سے کر سکتے ہیں اور بلاشبہ یہ بہت بڑی نیکی ہے۔ لیکن اپنے متعلقین یا قوم کے حقوق پر دستبرُد کر کے دوسروں کی مدد کرنا ہرگز ایثار نہیں بلکہ گناہ ہے، ہاں آپ حقدار کی مرضی اور رضا مندی سے ایسا کر سکتے ہیں۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ اس زمانہ میں قوم کی زبوں حالی سے ہزار ہا آدمی ایسے ہیں جو اہل ہونے کے باوجود کوئی کام نہیں کرتے صرف لوگوں کی سخاوت اور ایثار پر گزارہ کرتے ہیں، ایسے لوگوں کے ساتھ سخاوت یا ایثار کرنا قوم کو بے عملی کی دعوت دینا ہے۔ اِس لیے ایثار صرف اپنے ذاتی حقوق کی قربانی سے کیا جائے اور وہ بھی صرف ان کے لیے جو اہل ہوں، نا اہلوں کے لیے ایثار کرنا سخت نقصان دہ ہے۔ یہ دو باتیں بہت اچھی طرح ذہن نشین کر لینے کے بعد اب آگے چلیئے۔ یاد رکھنا چاہیئے کہ باہمی معاملات اور اخلاق کی ابتدا ''گھر'' سے ہوتی ہے یا یوں کہیئے کہ گھر ہی تمدّن کی سب سے چھوٹی یونٹ ہے اِس لیے جتنی یہ یونٹ اچّھی، مضبوط، مکمّل اور نقائص سے پاک ہوگی اتنا ہی قومی تمدّن اعلیٰ و ارفع اور دُنیا میں طاقت، عزّت وعظمت اور ترقی کا باعث ہوگا۔ اِس لیے ہم گھر ہی سے اپنے بیان کی ابتداء کرتے ہیں۔

گھر:

یہاں گھر سے مراد خاوند، بیوی اور اُن کے بچے ہیں، خواہ وہ کسی محل میں رہتے ہوں یا جھونپڑی میں۔ دراصل گھر بنتا ہے ایک مرد اور ایک عورت کے ایسے معاہدے سے جس میں وہ اپنے مذہبی یا قومی دستور کے مطابق یہ عہد کریں کہ ہم میاں بیوی کی طرح اکٹّھے رہیں گے۔ اس معاہدے کے معرض وجود میں آتے ہی دونوں پر کچھ حقوق وفرائض عائد ہو جاتے ہیں۔ اب جس قدر وہ دونوں ان حقوق وفرائض کو بوجوہِ احسن، خوبی اور تندہی سے انجام دیں گے، اسی قدر راحت وسکون سے رہیں گے اور یہ گھر جنت بن جائے گا۔

برخلاف ازیں جس قدر وہ ان حقوق و فرائض کی طرف سے رُوگردانی اور بے پروائی کریں گے، اتنی ہی زندگی مصیبت اور تکلیف سے کٹے گی اور یہی گھر ان کے لیے جہنّم ہو جائے گا۔ ان میں کچھ حقوق و فرائض میاں بیوی دونوں پر مشترکہ حیثیت سے عائد ہوتے ہیں، اِس لیے ہم پہلے انہی کا بیان کریں گے۔

ا۔ دونوں کا سب سے پہلا اور سب سے اہم مشترکہ فرض یہ ہے کہ دونوں ایک دوسرے کو پہلے ہی دن سے اچھی طرح سمجھنے کی کوشش کریں اور اپنے مزاج اور عادتوں میں مناسب تغیّر و تبدّل کر کے ہم مزاج اور ہم خیال بن جائیں۔ یہ کام کتنا ہی مشکل نظر آئے آئندہ زندگی کو خوشگوار اور کامیاب بنانے کے لیے اس کو پایۂ تکمیل تک پہنچانا اشد ضروری اور لازمی ہے۔ اس کام کو آسانی سے سرانجام دینے کے لیے ایک دوسرے کی چھوٹی چھوٹی فروگذاشتوں کو بالکل نظرانداز کر دینا اور بڑے بڑے اختلافات کو محبت اور پیار سے ایک دوسرے کو بتا دینا چاہیے۔ بتاتے وقت طبیعت میں غصّہ اور اندازِ بیان میں درشتی اور شکایت کا شائبہ بھی نہیں ہونا چاہیے ورنہ اُلٹا اثر پڑے گا اور بنتا ہوا کام بگڑ جائے گا۔ بہتر یہ ہے کہ پہلے ہی دن دونوں آپس میں سمجھوتہ کر لیں کہ جس کو بھی دوسرے کی کوئی بات ناگوار ہو گی صاف صاف بتا دے گا، دل میں نہ رکھے گا، کیونکہ اس سے غلط فہمیاں پیدا ہو کر رائی کا پہاڑ بن جاتا ہے۔ اگر دو چار ماہ یہ عمل کیا جائے اور انتہائی صبر اور قوّتِ برداشت سے کام لیا جائے تو زیادہ عرصہ نہ گزرے گا کہ گرہستی کی گاڑی زندگی کی شاہراہ پر فراٹے بھرنے لگے گی اور باقی عمر جو ممکن ہے پچاس ساٹھ برس سے بھی زیادہ ہو، بہت آرام و آسائش اور لطف و راحت سے بسر ہو گی۔ کس قدر احمق ہیں وہ لوگ جو شادی کے بعد ذرا ذرا سی شکایتوں اور بدگمانیوں کی وجہ سے اپنی زندگی کو تلخ اور اپنے جنت کدہ کو جہنم بنا لیتے ہیں اور پھر الزام قسمت

اور خدا کو دیتے ہیں۔

۲۔ جس مکان میں رہتے ہیں اس کو صاف ستھرا رکھنا اور اس کی مرمت لپائی پوتائی اور سفیدی وغیرہ کراتے رہنا، میاں بیوی دونوں کا مشترکہ فرض ہے، خواہ یہ صفائی وغیرہ نوکروں کے ذریعے کرائی جائے یا خود کرنی پڑے۔ عام طور پر مرد اس کو اپنے فرائض میں سے نہیں سمجھتے لیکن یہ ان کی غلطی ہے۔ میاں بیوی دونوں برابر حیثیت سے اس کے مکین ہیں اور اس لحاظ سے خاوند پر بھی اس مکان کا اتنا ہی حق ہے جتنا بیوی پر۔

۳۔ جو اولاد پیدا ہو اس کی پرورش، تربیت اور تعلیم کی ذمہ داری میاں بیوی دونوں ہی پر عائد ہوتی ہے دونوں کو آپس میں پوری دلچسپی لینی اور اپنی حیثیت اور توفیق کے مطابق اس میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھنی چاہیئے۔

۴۔ مکان میں خاوند یا بیوی کے جو رشتہ دار رہتے ہوں اُن کی خاطر و خدمت دونوں کا مشترکہ فرض ہے۔ یہ ہرگز جائز نہیں اگر وہ لوگ خاوند کے رشتہ دار ہیں تو بیوی کو بُرا لگے اور اگر بیوی کے رشتہ دار ہیں تو خاوند کو ناگوار ہو۔

۵۔ مکان میں جو لوگ بطور مہمان آئیں اُن کی خاطر تواضع بھی دونوں پر برابر فرض ہے۔ مہمان چاہے خاوند کے ہوں یا بیوی کے، دونوں کو اُن کی مدارت برابر کرنی چاہیئے۔ اس کے برخلاف کرنا شرافت کے خلاف ہے۔

۶۔ میاں اور بیوی کے درمیان کوئی راز اور کوئی تکلّف نہیں ہونا چاہیے اگر اس رشتہ میں بھی تکلّف باقی رہا تو پھر بے تکلّفی کا لفظ ہی بے معنی ہے اب ہم میاں اور بیوی دونوں کے الگ الگ حقوق و فرائض کا بیان کریں گے۔ لیکن اس سے پہلے ضروری ہے کہ کچھ ذکر اس معاہدے اور اس کے متعلقات کا کر دیا جائے جس سے ''ایک گھر'' وجود میں آتا ہے۔

شریعت اسلام میں اس معاہدے کو نکاح کہتے ہیں۔

نکاح:

جب سے انسان پیدا ہوا ہے اور اللہ نے اس کو زمین پر رہنے سہنے کے طریقے وحی، الہام یا عقل کے ذریعہ تعلیم فرمائے، نکاح کا دستور اسی دن سے کسی نہ کسی صورت میں آج تک موجود رہا ہے۔ یہ اللہ کا حکم اور ہمارے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سنّت ہے۔ غرض و غایت نکاح کی یہ ہے کہ بچے جس مرد کے ہوں صرف وہی ان کی پرورش کا ذمہ دار قرار دیا جائے اور وہ مرنے نہ پائیں۔ اگر نکاح کا طریقہ نہ ہوتا تو بڑی قباحتیں پیش آتیں۔ مثلاً اس حالت میں جو بچّے پیدا ہوتے ان کی ولدیت کا تعین ناممکن ہوتا اور کوئی مرد اُن کی کفالت نہ کرتا۔ اِس لیے ان کی پرورش کا سارا بوجھ صرف ماں کو اٹھانا پڑتا۔ لیکن عورت چونکہ فطرتاً نحیف الجثّہ ہوتی ہے اور بچّہ جننے کے بعد کافی عرصہ تک خود اپنی معاش کے لیے ہی محنتِ شاقّہ نہیں کر سکتی، اِس لیے بچوں کی ہرگز پرورش نہ کر سکتی۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ اکثر بچے شیر خواری ہی میں مر جاتے اور نوعِ انسان تعداد میں ترقی نہ کر سکتی۔ نکاح سے یہ فائدہ ہوا کہ ایک مرد اور عورت زن و شوہر کی طرح ساتھ رہتے ہیں اور جو بچے پیدا ہوتے ہیں مرد ان کی ماں کو رزق بہم پہنچاتا ہے اور وہ بچوں کو دودھ پلا کر پالتی اور پرورش کرتی ہے۔

دوسری قباحت یہ ہوتی کہ مرنے والے مَردوں کی وراثت متعین نہ ہوسکتی۔ ابتداء میں انسانوں کا ذریعہ معاش صرف شکار اور کھیتی باڑی تھا۔ ہر شخص کچھ نہ کچھ زمین بوتا اور اُسی کی پیداوار پر گزارہ کرتا۔ اگر نکاح کا طریقہ نہ ہوتا تو مرنے والے کی زمین کے لیے جھگڑا اور خون ریزی ہوتی۔ ہر شخص کوشش کرتا کہ یہ بنی بنائی زمین اُسے مل جائے۔ اس طرح بڑا فساد برپا ہوتا، بہت سے آدمی مارے جاتے اور بہت سی زرعی زمینیں برباد ہو جاتیں۔

تیسری قباحت یہ ہوتی کہ ''گھر'' کی بُنیاد پڑتی نہ خاندان کی اور لوگوں میں ہرگز وہ محبت و موانست اور ''اپنائیت'' نہ ہوتی جو ارتقائے تمدن کے لیے ضروری ہے۔ نہ کوئی کسی کا باپ ہوتا نہ بیٹا، نہ بھائی ہوتا نہ بہن ہوتی، نہ چچا ماموں نہ دیگر رشتہ دار ہوتے، ایک افراتفری اور نفسانفسی کا عالم ہوتا۔ آج جبکہ معاشرہ ترقی کے موجودہ درجہ پر پہنچ چکا ہے، کمیونسٹ خیال کے لوگ کہتے ہیں کہ نکاح کی ضرورت نہیں، سوسائٹی اور حکومت پرورش گاہوں میں بچوں کی پرورش کا خاطرخواہ انتظام کرسکتی ہے اور ساری قوم کے افراد ایک خاندان کے فرد کی طرح پیار اور محبت سے رہ سکتے ہیں، لیکن یہ صرف کہنے کی باتیں ہیں۔ تجربہ بتا رہا ہے کہ یہ خیال غلط ہے۔ اگر آج نکاح کا طریقہ ختم کر کے مرد و زن کو جنسی تعلقات کی آزادی دے دی جائے تو ایک صدی گزرنے سے پہلے تمدّن کی عظیم الشان عمارت منہدم اور پارہ پارہ ہوجائے گی۔

اسلام میں نکاح محض ایک معاہدہ ہے، اس کی بُنیاد ہرگز محبت اور معاشقہ پر نہیں رکھی گئی۔ اکثر مغربیت زدہ اس پر اعتراض کرتے ہیں اور ہماری سوسائٹی میں بھی یورپ کی کورٹ شپ کا قاعدہ رائج کرنے کے حامی ہیں۔ لیکن وہ یہ نہیں دیکھتے کہ یورپ اور امریکہ ہی نے اس طریقے سے کون سا فائدہ اٹھایا ہے۔ دونوں ملکوں میں طویل کورٹ شپ کے بعد بھی جو شادیاں ہوتی ہیں کیا ان کا انجام اکثر و بیشتر مایوس کن نہیں ہوتا اور نیویارک، لندن اور پیرس وغیرہ میں ہفتہ وار طلاقوں کی تعداد ہزاروں تک نہیں پہنچ جاتی۔ یاد رکھیے جب ایک نامحرم مرد اور عورت آزادی اور بے پردگی کی وجہ سے آپس میں بے تکلّف ہو کر ملتے ہیں تو جبلّی کششِ جنسی دونوں کو ایک دوسرے کی طرف کھینچتی ہے اور وہ اس ہوس کو محبت سمجھ کر شادی کر لیتے ہیں اور جب ہوس پوری ہو جاتی ہے تو طلاق حاصل کر کے پھر نئے جوڑوں کی تلاش شروع کر دیتے ہیں۔ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ کہیں کہیں واقعی محبت کے جذبات بھی مناکحت کا باعث

ہوتے ہیں۔ لیکن محبت عام طور پر حُسنِ صورت کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے اور حُسن ایک فانی چیز ہے تھوڑے ہی عرصہ بعد غائب ہو جاتا ہے۔ اِس طرح جب حُسن یعنی محبت کی اصلی وجہ فنا ہو جاتی ہے تو محبت بھی باقی نہیں رہتی۔ یہی سبب ہے کہ اسلام نے رشتۂ ازدواج کی بُنیاد محبت پر نہیں بلکہ محبت کی بُنیاد رشتۂ ازدواج پر رکھی ہے۔ یعنی نکاح کے بعد اگر میاں بیوی اسلامی طریقوں کے مطابق رہیں اور ایک دوسرے کے حقوق کو پوری طرح ادا کریں تو رفتہ رفتہ ان میں اس قدر محبت پیدا ہو جاتی ہے جو عمر بھر باقی رہتی ہے۔

تعدّدِ ازدواج: اسلام نے بیک وقت ایک مرد کو چار بیویاں تک رکھنے کی اجازت دی ہے۔ متمدّن یورپ میں ہمارے اس دستور کا بہت مذاق اُڑایا جاتا ہے اور اس کے خلاف اتنا پروپیگنڈا ہوا ہے کہ بہت سے مغرب زدہ مسلمان بھی اہلِ یورپ کی ہاں میں ہاں ملانے لگے ہیں اور ہماری مغرب زدہ خواتین نے تو باقاعدہ یہ مطالبہ شروع کر دیا ہے کہ چار شادیوں کو جبراً بند کر کے صرف ایک شادی کا قانون بنایا جائے۔ ہمیں ان خواتین سے پوری ہمدردی ہے، لیکن ان کو سوچنا چاہیئے کہ قانون چار شادیوں کو تو بند کر سکتا ہے لیکن کسی خاوند کو اس بات پر ہرگز مجبور نہیں کر سکتا کہ وہ اپنی بیوی سے محبت بھی ضرور کرے، خصوصاً جب کہ بیوی بدمزاج اور فرائض خانہ داری کی طرف سے بے پرواہو۔ لہٰذا کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ خاوند اور بیوی دونوں اپنے اپنے فرائض کو حکمِ خدا اور حکمِ رسولؐ کے مطابق ادا کریں تاکہ کسی مرد کو زیادہ شادیاں کرنے کی ضرورت ہی نہ پڑے اور اگر پڑے بھی تو پہلی بیوی یا بیویوں کو شکایت کا موقع نہ ملے۔

تعدّدِ ازدواج کے حکم میں اللہ تعالیٰ کی بڑی حکمتیں اور مصلحتیں پوشیدہ ہیں، مثلاً کوئی عورت دائم المریض یا بانجھ ہو یا اس کے اولادِ نرینہ نہ پیدا ہوتی ہو تو مرد کو عقلاً اور اخلاقاً یہ

اختیار ہونا چاہیئے کہ وہ دوسری شادی کر لے۔ خاندانی یا قبائلی روابط کو بڑھانے کے لیے بھی بعض اوقات ایک سے زیادہ شادیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ تعدّدِ ازدواج کے حکم کی سب سے اہم وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی قوم ایک ''کولونائزنگ'' یعنی آبادکار قوم ہے، قرآن میں مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ تمام دُنیا میں پھیل جاؤ اور خدا کا فضل تلاش کرو، یعنی دنیاوی طاقت اور وجاہت پیدا کرو اور جہاں جاؤ اسلام پھیلاؤ۔ جب تک مسلمان زندہ تھے وہ اس حکم پر بھی اسی سرگرمی سے عمل کرتے تھے جیسے اور احکام خدا پر۔ ابتدائے اسلام کی تمام تاریخ ایسے واقعات سے بھری پڑی ہے۔ اگرچہ یورپ کے عیسائیوں خصوصاً انگریزوں اور بعد میں ہندوؤں نے ہمیشہ یہ پروپیگنڈا کیا کہ مذہبِ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا ہے، مگر کوئی ہمیں یہ نہیں بتاتا کہ مُلک چین اور انڈونیشیا میں جہاں آج کروڑوں مسلمان آباد ہیں، کون سی جنگ میں تلوار چلائی گئی تھی یا خواجہٴ بزرگ حضرت معین الدینؒ اور حضرت داتا گنج بخشؒ کون سی فوجیں ساتھ لے کر آئے تھے، جنہوں نے بھارت کے لاکھوں باشندوں کو مسلمان کر لیا۔ یہ مٹھی بھر مسلمان ہی تھے جو دُوردراز ملکوں میں جا کر بس جاتے اور وہاں دنیاوی طاقت حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ اسلام بھی پھیلاتے تھے۔ ظاہر ہے کہ اکثر و بیشتر حالات میں یہ مسلمان عورتیں ساتھ لے کر نہیں جا سکتے تھے، بلکہ جہاں بستے وہیں کی عورتوں کو مسلمان کر کے ان سے شادیاں کر لیتے تھے۔ اگر ان میں سے ہر مسلمان صرف ایک ایک ہی عورت سے شادی کرتا تو صدیوں تک بھی ان کی تعداد کافی نہ ہوتی، اِس لیے وہ دو دو، تین تین اور چار چار شادیاں کرتے اور پچاس ساٹھ برس ہی میں اتنی تعداد بڑھا لیتے کہ ان غیر ملکوں میں طاقت اور عزّت سے زندگی بسر کر سکتے تھے۔ اگر مسلمانوں میں پھر وہی ایمان اور وہی فولادی کردار پیدا ہو جائے تو یہ بات آج بھی ممکن ہے، لیکن آج قرآن کے اور ہی کون سے

حکم پر عمل ہوتا ہے جو اس پر ہوگا۔ ایک اور اہم حکمت تعدّدِ ازدواج میں یہ ہے کہ مسلمان قوم ایک مجاہد قوم ہے اور اپنے دفاع میں جہاد کرتے ہوئے اکثر ایسا ہوا ہے اور ہوسکتا ہے کہ مَردوں کی تعدادِ کثیر شہید ہو جائے اور عورتیں زیادہ رہ جائیں۔ اس صورت میں اگر ہر مرد ایک سے زیادہ شادیاں کرلے تو تھوڑے ہی عرصے میں مَردوں کی کمی پوری ہوسکتی ہے اور شہیدوں کی جو یتیم اولاد باقی رہ جاتی ہے اس کی پرورش میں دِقّت پیش نہیں آسکتی۔ اگر کسی غیر مسلم مُلک میں یہ حالات رونما ہوں تو یقیناً ان لوگوں کو اپنا ایک ہی عورت سے شادی کرنے کا قانون بدلنا پڑے گا، جیسے جرمنی کو پہلی جنگ عظیم کے بعد بدلنا پڑا تھا، لیکن ہمارے قانونِ الٰہی میں پہلے ہی سے یہ گنجائش موجود ہے۔

قرآن کے جن الفاظ میں ایک سے زیادہ شادیوں کی اجازت دی گئی ہے وہ بہت محتاط اور قطعی ہیں۔ اُن سے صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ ضرورت پڑنے پر چار تک شادیوں کی گنجائش موجود ہے۔ یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ جس کا جی چاہے اور جب جی چاہے تین تین اور چار چار شادیاں کرے اور پھر پہلی بیویوں کو طلاق دے کر ہمیشہ نئی نئی شادیاں کرتا رہے، ایسے لوگوں سے بعد از موت سخت باز پُرس ہوگی، اِس لیے اس بارے میں مسلمانوں کو بہت ہی محتاط رہنا لازم ہے۔

طلاق: ہمارے دستورِ مناکحت میں ایک مسئلہ طلاق کا بھی ہے۔ شروع میں غیر مسلموں نے اس کا بھی بہت مذاق اُڑایا، مگر اب تمام متمدّن ممالک نے اس کو بطور قانون اپنے اپنے ہاں رائج کر دیا ہے، اِس لیے اس نقطۂ نظر سے اس پر زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں۔ ہاں مسلمانوں سے اتنی گذارش ضرور ہے کہ طلاق کوئی دل لگی نہیں ہے کہ جب جی چاہا بیوی کو ڈنڈے اور جوتے مارے اور طلاق دے کر گھر سے نکال دیا۔ ایسے لوگوں کو مرنے کے بعد ضرور اس کا

عذاب بھگتنا ہوگا۔ معاشرہ کو چاہئے کہ ایسے واقعات میں مَردوں سے سختی کے ساتھ باز پُرس کرے۔ قانوناً بھی ایسے لوگوں کو سزا ملنی چاہئے تا کہ اللہ نے عورتوں کو جو عزّت اور آزادی دی ہے یہ نا معقول خاوند اس کو غصب نہ کر سکیں۔

ہمارے مذہب پر ایک اعتراض یہ بھی کیا جاتا ہے کہ اسلام نے طلاق کی صورت میں بچے خاوند کو دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ بادی النظر میں واقعی یہ سخت ناانصافی معلوم ہوتی ہے، لیکن حقیقتاً یہ حکم عورت کے لیے بہت بڑی رحمت اور نعمت ہے۔ اگر بچے عورت کو ملنے کا حکم ہوتا تو وہی قباحت پیش آتی جس کا ذکر ہم بیانِ نکاح کے شروع میں کر چکے ہیں، یعنی عورت نحیف الجثہ اور اکثر حالات میں بے یار و مددگار ہونے کی وجہ سے اُن کی پرورش نہ کر سکتی اور وہ مر جاتے اور اگر زندہ بھی رہتے تو ان کی تعلیم کا اچھا بندوبست ہو سکتا نہ تربیت کا اور وہ ہرگز اچھے شہری نہ بن سکتے۔ اکثر بیوہ عورتوں کی اولاد کا آج بھی یہی حشر ہوتا ہے۔ دوسری حکمت اس میں یہ ہے کہ بچوں کی وجہ سے مرد عورت کو طلاق دے ہی نہیں سکتا ہے۔ ہر باپ کو اپنی اولاد سے محبت ہوتی ہے اور وہ جانتا ہے کہ اگر میں نے ان کی ماں کو طلاق دے دی تو نہ میں ان کی اچھی طرح پرورش کر سکوں گا نہ سوتیلی ماں۔ تیسرے یہ کہ یہ بچے بڑے ہونے کے بعد اپنی ماں کو ہی زیادہ چاہتے ہیں اور اس کی خدمت کرتے ہیں۔

اسلام میں عورت کا درجہ: ایک اور دلچسپ مسئلہ عورت اور مرد کی مساوات کا ہے۔ غیر اسلامی دنیا میں یہ مسئلہ عورت کی بے مہار آزادی سے پیدا ہوا، لیکن اسلامی دنیا میں عوام کی جہالت اور قرآن سے بغاوت کے سبب ظہور میں آیا ہے۔ اسلام سے پہلے عورت عام طور پر نہایت حقیر اور ذلیل شے خیال کی جاتی تھی اور معاشرہ میں اس کی کوئی حیثیت نہ تھی، مگر اسلام نے عورت کو جو حقوق عطا فرمائے اور قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں نے جس عزّت

کا سلوک اپنی عورتوں سے کیا اس کی تقلید میں دوسری قومیں رفتہ رفتہ اپنی عورتوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنے لگیں اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ آج ان کی عورتیں ہر لحاظ سے مَردوں کے ساتھ ہمسری اور برابری کا دعویٰ کرتی ہیں۔ برخلاف ازیں مسلمانوں میں زوال کے ساتھ ساتھ عورت پھر ایک بے زبان جانور بن گئی۔ اب پھر اس کا ردِّ عمل شروع ہوا ہے اور اکثر تعلیم یافتہ عورتیں یہ دعویٰ کرتی ہیں کہ اسلام کی نظر میں عورت اور مرد ہر لحاظ سے برابر ہیں۔ اسی بناء پر اب یہ مطالبہ بھی شروع ہو گیا ہے کہ حکومت کے نظم ونسق میں عورتوں کو اُن کی تعداد کے لحاظ سے متناسب حصّہ دیا جائے۔ ہماری رائے میں جہاں تک عورت کی کسمپرسی اور مرد کے اُس پر ظلم وستم کا تعلق ہے، معاشرہ اور حکومت کا فرض ہے کہ قانوناً اور اخلاقاً جتنی جلدی ہو سکے عورت کو پھر اس مرتبہ پر پہنچا دیا جائے جو اللہ تعالیٰ نے اس کو عطا فرمایا ہے، لیکن جہاں تک ''ہر لحاظ'' سے مساوات اور حکومت کے نظم ونسق میں نمائندگی کا سوال ہے، ہم اس سے متفق نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے عورت اور مرد کو جو مساوات عطا فرمائی ہے وہ حقوق، سلوک اور عزّت ومحبت کی مساوات ہے، نظم ونسقِ حکومت یا امورِ خانہ داری میں فرائض اور تقسیم کار کی مساوات ہرگز نہیں ہے۔

قرآن میں حتمی اور قطعی الفاظ میں جا بجا مسلمان مَردوں کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ عورتوں کے ساتھ حُسنِ سلوک، عزّت اور انصاف سے پیش آئیں۔ اُن کے کھانے پینے، لباس، مکان اور دوسری ضروریات زندگی کا پورا بندوبست کریں اور ان کو ہمیشہ خوش رکھیں۔ جس گھر میں عورت خوش نہیں رہتی اُس گھر پر حزن وملال، پھٹکار اور لعنت برستی رہتی ہے۔ ایسے گھر میں پرورش پانے والے بچے بھی نہایت بدمزاج، بدذوق، چڑچڑے اور بددماغ اٹھتے ہیں۔ رسول اکرمؐ کی ایک حدیث ہے کہ اگر کوئی خاوند اپنی بیوی کی بدخلقی پر صبر کرے تو اللہ اس کو اتنا

ثواب عطا فرمائے گا جتنا حضرت ایوب علیہ السلام کو ان کی مصیبت پر عطا فرمایا۔ بتایئے اس سے زیادہ اچھے سلوک کی تعلیم اور کیا ہو سکتی ہے، لیکن مسلمان اس تعلیم پر عمل ہی نہ کریں تو مذہب کا کیا قصور ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ (البقرہ ۲۲۸)

یعنی ''عورتوں کا مَردوں پر ویسا ہی حق ہے جیسا مَردوں کا حق عورتوں پر ہے'' حقوق میں عورت مرد کی برابری کا اعلان اس سے زیادہ واضح اور کیا ہو سکتا ہے۔ دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے ''عورتیں تمہارا لباس ہیں اور تم ان کا لباس ہو'' ان الفاظ میں مرد عورت کی معاشرتی مساوات، ہمسری، ہمرازی اور پیار و محبت سے رہنے کا جو قرینہ پایا جاتا ہے، کیا دُنیا کا کوئی ادیب اس سے بہتر الفاظ میں یہ تاثّر پیدا کر سکتا ہے؟ مگر خوب یاد رکھنا چاہئے، کہ یہ تمام مساوات و ہمسری صرف معاشرتی ہے۔ جہاں ملکی نظم و نسق یا امور خانہ داری میں تقسیم کار کا تعلق ہے، وہاں عورت کی حیثیت ایک متاعِ محبوب اور مرد کی حیثیت ایک نگران و سرپرست کی ہے۔ چنانچہ قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ ''عورتیں تمہاری کھیتیاں ہیں'' ظاہر ہے کہ کھیتی اور کسان میں کسی حیثیت سے بھی کوئی مساوات نہیں، لیکن کھیتی سے زیادہ کسی کسان کو اور کوئی چیز پیاری بھی نہیں ہو سکتی۔ کھیتی اصل اور بُنیاد ہے تمام دولتوں کی، قیمتی مکانات و ملبوسات، سونا چاندی، روپیہ پیسہ اور ہیرے جواہرات سب کھیتی سے ہی حاصل کیے جاتے ہیں۔ غلّہ نہ ہو تو انسان سونا چاندی یا ہیرے جواہرات کھا کر ہرگز زندہ نہیں رہ سکتا۔ ایک کسان مہینوں اپنا خون پسینہ ایک کر کے دن رات کی محنت و مشقت سے اپنی کھیتی کی خدمت و نگرانی کرتا ہے، تب جا کر اس سے متمتع ہوتا ہے۔ قرآن کریم میں ایک اور جگہ مرد عورت کی اس حیثیت کو صاف صاف بیان کر دیا گیا ہے

اَلرِّجَالُ قَوّٰامُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ (النساء ۳۴)

یعنی ''مرد عورتوں کے نگران ہیں'' اکثر مترجمین نے قوّام کا ترجمہ حاکم کیا ہے۔ اس سے اکثر لوگ یہ سمجھنے لگے ہیں کہ عورت محکوم اور مرد حاکم کی حیثیت رکھتا ہے، اِس لیے اُسے اختیار ہے کہ عورت کو جس طرح چاہے دبائے اور ستائے۔ یہ خیال صرف وہ لوگ کر سکتے ہیں جن کے دماغ میں مسلمانوں کی موجودہ حکومتوں کے حاکموں کا تصوّر بسا ہوا ہے۔ حالانکہ قرآن کی روشنی میں دیکھا جائے تو حاکم عوام کا خادم ہوتا ہے، حاکم کا کام عوام کو دبانا اور ستانا ہرگز نہیں۔ حاکم کا کام تو عوام کی ضروریات زندگی کا انتظام کرنا، نظامِ زندگی کو قائم رکھنا، دشمنوں سے حفاظت کرنا، مظلوموں کی دادرسی کرنا اور ہر لحاظ سے اُن کی خدمت کرنا ہے۔ انگلستان وغیرہ میں آج بھی حُکّام کو ''پبلک سرونٹ'' یعنی عوام کا خادم کہا جاتا ہے، اِس لیے اگر لفظ قوّام کا ترجمہ حاکم ہی کیا جائے تو بھی کوئی بُرا پہلو نہیں نکلتا۔ خلفائے راشدین کی حکومت سامنے ہے، کیا وہ ایسے ہی حاکم قوم تھے جیسے کہ آج ہوتے ہیں، خلفائے راشدین کا تو ذکر ہی کیا، متمدّن عیسائی ممالک کے حُکام بھی ایسے بددیانت، ظالم اور فرعون صفت نہیں ہوتے جیسے کہ عام طور پر اسلامی ممالک میں ہوتے ہیں۔ خلاصہ اِس تمام تقریر کا یہ ہوا کہ معاشرتی لحاظ سے مرد اور عورت میں جو مساوات ہے، انتظامی امور مملکت اور خانہ داری میں وہ مساوات باقی نہیں رہتی۔ جذبات کی رَو میں کوئی کچھ بھی کہے، یہ حقیقت بدل نہیں سکتی کہ عقلی طور سے نہ سہی جسمانی لحاظ سے عورت بہت کمزور اور نازک ہے۔ خصوصاً بچے جننے کی وجہ سے ہر وضعِ حمل کے بعد کافی عرصہ تک وہ سلطنت کے انتظامی امور کو ہرگز اس خوش اسلوبی سے انجام نہیں دے سکتی جیسے کہ مَرد دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ابتدائے آفرینش سے آج تک ان معاملات میں عورت نے کوئی قابلِ ذکر حصّہ نہیں لیا۔ اگر خال خال کبھی عورتوں

نے عدالت، پولیس یا فوج وغیرہ میں کوئی نمایاں کام کیا بھی ہے تو وہ الشاذ کالمعدوم کے مصداق بطور ایک اُصول کے پیش نہیں کیا جاسکتا اور اگر یہ بات بطور ایک اُصول قانوناً تسلیم کر لی جائے تو معاشرہ کو بجائے فائدے کے نقصان پہنچے گا، مثلاً اُس حالت میں عورتیں امورِ خانہ داری کو کماحقہٗ انجام نہ دے سکیں گی اور گھر کا نظام ختم ہوجائے گا پھر تو یہ ہوگا کہ

کٹی عمر ہوٹلوں میں مرے ہسپتال جاکر

دوسرے یہ کہ اگر پولیس اور فوج میں بھی عورتوں کو برابر کا حصّہ مل جائے تو ایسی پولیس اور فوج کا جو حشر ہوگا ظاہر ہے۔ تیسرے یہ کہ اس طرح مَرد و زن کے بے غِل وغَش اِختلاط سے جو خرابیاں پیدا ہوں گی ان کی روک تھام ناممکن ہوجائے گی۔ یورپ اور امریکہ وغیرہ میں اس اختلاط سے جو معاشرتی خرابیاں پیدا ہورہی ہیں ان سے وہاں کے باشندے خود پریشان ہیں۔ چوتھے یہ کہ آج بھی جو غریب عورتیں دفاتر میں بہ مجبوری یا بہ خوشی مَردوں کے شانہ بشانہ کام کرتی ہیں اُن کی زندگی ہی کون سی آرام دہ ہے۔ وہ مخدّرات ومحصنات جو اپنے گھروں میں عزّت اور خوشی کی زندگی بسر کرتی ہیں، ان میں سے کوئی بھی دفاتر کی ان ملازماؤں پر رشک نہیں کرتی۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ اگر چند محکمے صرف عورتوں کے لیے ہی مخصوص کر دیے جائیں مثلاً زنانہ مدرسوں اور کالجوں، زنانہ جیل خانوں اور زنانہ ہسپتال وغیرہ کی سب کارکنیں صرف عورتیں ہی ہوں تو اس سے کوئی نقصان نہیں ہوگا بلکہ عورتوں کے معاشرتی اور ذہنی معیار کو بلند کرنے میں بیش بہا مدد ملے گی۔

باوجود ازیں اسلام عورت کو اتنی بھی آزادی نہیں دیتا کہ وہ خاوند کی نافرمانی یا اس کی خدمت سے پہلوتہی کرے یا جیسا کہ آج کل ہمارے اعلیٰ طبقے کے اکثر گھرانوں میں

انگریزوں کی تقلید میں کیا جاتا ہے کہ بیگم صاحبہ آگے آگے اور خاوند باادب ہاتھ باندھے اُن کے پیچھے پیچھے پھرتے ہیں اور بیگم صاحبہ کے حکم کے بغیر کوئی جائز سے جائز کام بھی نہیں کر سکتے۔ رسول اکرمؐ نے فرمایا ہے کہ اگر خدا کے سوا اور کسی کو سجدہ جائز ہوتا تو میں عورتوں کو حکم دیتا کہ وہ اپنے خاوندوں کو سجدہ کریں۔ الغرض یہ ہے اسلام میں خاوند اور بیوی کا درجہ کہ خاوند بیویوں کی عزّت کریں، محبت سے پیش آئیں اور ان کی ضروریات خوشی خوشی پوری کریں۔ اسی طرح بیویاں اپنے خاوند کی پوری عزّت کریں، اُن سے محبت سے پیش آئیں اور امورِ خانہ داری بخوشی سرانجام دیں۔ بچوں کی پرورش کریں اور خاوند کا ہر حکم مانیں اور اس کی خوشی پر اپنی خوشی قربان کر دیں۔

پردہ: پردہ بھی ہماری معاشرت کا ایک بہت ہی اہم مسئلہ ہے۔ پچھلی کئی صدیوں سے جو پردہ ممالکِ اسلامی خصوصاً ہندوستان میں رائج رہا ہے، اس کی وجہ سے ہماری عورتیں یعنی قوم کی تقریباً نصف تعداد اپاہج اور بیکار ہو کر رہ گئی ہے۔ مسلمانوں نے جس طرح قرآن کی اور تعلیمات کو پس پشت ڈال دیا ہے، اسی طرح پردے کے متعلق بھی وہ قرآنی احکام پر عمل پیرا نہیں ہیں۔ اس لحاظ سے مسلمانوں میں کئی طبقات ہیں، ایک تو وہ لوگ جو معمولی قسم کے کام اور محنت مزدوری کرتے ہیں اور جن کو ہندوؤں کی تقلید میں نیچ ذات کہا جاتا ہے۔ ان لوگوں میں پردے کا کوئی تخیل موجود نہیں ہے۔ دوسرے وہ دقیانوسی لوگ جن کا عقیدہ ہے کہ اگر عورت کی آواز بھی گھر کی چار دیواری سے باہر سُن لی جائے یا اتفاقاً کوئی اس کے چہرے کی جھلک دیکھ لے تو اس کی طلاق ہو جاتی ہے۔ تیسرے وہ بزُعمِ خود ترقی یافتہ لوگ جو عورت کے لیے کسی قسم کے پردے یا پابندی کی ضرورت ہی نہیں سمجھتے، یہ مغربیت زدہ لوگ ہیں۔ ان کے نزدیک اس میں مطلق کوئی حرج نہیں کہ عورتیں خوب بناؤ سنگار کر کے لپ سٹک اور

پاؤڈر لگا کر نیم عریاں لباس میں جہاں چاہیں جائیں۔ کلبوں اور تھیٹروں میں ناچیں کودیں گائیں بجائیں اور بے تکلفی بلکہ بے حیائی سے نامحرموں کے ساتھ تخلیہ میں ملاقاتیں کریں۔ یہ تینوں طبقات غلط رَو اور قرآن کے باغی ہیں۔ قرآن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان عورتوں کو ضرورتاً گھر سے باہر نکلنے کی کوئی ممانعت نہیں ہے۔ البتہ یہ حکم ضرور ہے کہ جب وہ گھر سے باہر جائیں تو ایسا لباس پہنے ہوئے ہوں جس سے تمام اعضاء ڈھکے رہیں اور ان کے بناؤ سنگار کی چیزیں نظر نہ آئیں۔ اس میں بھی وہ حصّے جو خود بخود کھلے رہتے ہیں، مثلاً چہرہ اور گٹّوں تک ہاتھ وغیرہ تو ان کو ڈھکنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ یہ بھی حکم ہے کہ جب وہ نامحرموں سے بات کریں تو نگاہیں نیچی رکھیں (یہ حکم مَردوں کو بھی ہے) اور ہرگز اس قدر نرمی اور ایسے لہجہ میں بات نہ کریں جس سے کسی کے دل میں بیہودہ توقعات پیدا ہوں۔ یہ بھی حکم ہے کہ عورتیں بے وجہ گھر سے نکل کر ماری ماری نہ پھریں جیسا کہ بہت سی عورتیں کرتی ہیں کہ مَرد کام پر گئے اور انہوں نے بُرقعہ ڈالا اور باہر کی راہ لی۔ گھروں میں بند کر رکھنے کا حکم صرف سزاءً ان عورتوں کے لیے ہے جن سے بے حیائی کا کوئی کام سرزد ہوا ہو اور چار مسلمانوں نے اُن کے خلاف گواہی دی ہو۔

الغرض یہ ہے اسلامی پردہ۔ اس میں نہ تو اس قدر سختی ہے کہ عورتوں کو مرغیوں کی طرح ڈربے میں بند رکھا جائے، نہ اتنی آزادی ہے کہ ہرنیوں کی طرح چوکڑیاں بھرنے کے لیے بے مہار چھوڑ دیا جائے۔ عقل بھی یہی کہتی ہے کہ اسلام جیسے پُرحکمت و دانش مذہب میں ایسا کوئی حکم نہیں مل سکتا جس سے اس کے ماننے والوں کی آدھی آبادی مفلوج اور بیکار ہو کر رہ جائے۔ لیکن باوجود ان تمام باتوں کے ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ پردے کے یہ احکام اسی وقت قابلِ عمل اور مفید ہو سکتے ہیں جب مرد بھی قرآنی احکام کے پابند اور اخلاقِ اسلامی سے

مزّین ہوں۔ چونکہ حالت اس کے خلاف ہے اور مسلمان مَردوں کی تعدادِ کثیر اخلاقی معیار سے اس قدر گری ہوئی ہے کہ سفر تو کیا حضر میں بھی عورتوں کی عصمت وعزّت اور جان و مال بدمعاشوں کے ہاتھوں سے محفوظ نہیں، جیسا کہ روزانہ دیکھنے میں آتا ہے۔ اِس لیے مناسب یہ ہے کہ ابھی کچھ عرصہ تک جہاں ذرا بھی کچھ خطرہ ہو عورتیں اکیلی ہرگز نہ جائیں۔ مَردوں کا فرض ہے کہ اپنی عورتوں کو پردہ دار لباس میں اپنے ساتھ باہر لے جائیں اور ہر اُس چیز سے روشناس کرائیں جس سے اُن کے عقل و تجربہ میں اضافہ ہو، خود اعتمادی اور قوّتِ عمل پیدا ہو۔ وہ بدمعاش مردوں کا سر توڑنا سیکھیں اور اپنی عزّت وعصمت کی حفاظت دقیانوسی پردے کے تار ہائے عنکبوت ہی سے نہیں بلکہ اپنے فولادی کردار اور آہنی عزم و حوصلے سے کر سکیں۔ اس کے علاوہ یہ بھی ضروری ہے کہ عورتیں دُنیا کی تمام موجودہ تحریکات اور حالات سے باخبر رہیں اور اپنے بچوں کو حالاتِ زمانہ کا مقابلہ کرنے کے قابل بنائیں اور یہ بات اچھی تعلیم کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتی، اِس لیے عورتوں کو تعلیم ضرور دلوائی جائے۔

تعلیمِ نسواں: تعلیم کے فوائد اس قدر ثابت اور ظاہر ہیں کہ ان کا بیان کرنا تحصیلِ حاصل ہے۔ اِس لیے ہم اس پر زیادہ لکھنا نہیں چاہتے صرف دو حدیثیں سرورِ عالمؐ کی یاد دلانا چاہتے ہیں۔ ایک حدیث کا مفہوم تو یہ ہے کہ ''علم حاصل کرنا ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے'' دوسری حدیث یہ ہے کہ ''علم اگر چین میں بھی ہو تو وہاں جا کر حاصل کرو'' ایک طرف تو یہ حدیثیں ہیں اور دوسری طرف ہمارے اکثر خواص اور عوام ہیں جو ابھی تک یہی سوچ رہے ہیں کہ لڑکیوں کو تعلیم دلانا چاہیئے بھی یا نہیں۔ اب ہم بتاتے ہیں کہ نکاح کے لیے جوڑے کا انتخاب کس طرح کرنا چاہیئے۔

جوڑے کا انتخاب: نکاح اس آدمی کو کرنا چاہیئے جو عاقل، بالغ اور خود کفیل ہو، یعنی اپنی

بیوی کے لیے کھانا، کپڑا، مکان اور دیگر ضروریات زندگی آسانی سے مہیا کر سکے اور جب بچے پیدا ہوں تو ان کی پرورش میں بھی کوئی دقّت محسوس نہ کرے۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ ہر جاندار جو پیدا ہوتا ہے اپنا رزق ساتھ لے کر آتا ہے، لیکن اس زمانے میں کسبِ معاش کے طریقے اس قدر پیچیدہ اور مشکل ہوگئے ہیں اور اللہ پر مسلمانوں کی بے یقینی اور سست اعمالی اس قدر بڑھ گئی ہے کہ معاش کا معقول بندوبست کیے بغیر نکاح کرلیا جائے تو سوائے مصیبت و پریشانی کے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

نکاح کرنے سے پہلے مرد اور عورت دونوں کو اپنے جوڑے کا انتخاب پوری احتیاط اور دانش مندی سے کرنا چاہیے۔ اچھی طرح خیال رکھنا چاہیے کہ یہ عمر بھر کا ساتھ ہے، اگر انتخاب میں غلطی ہوگئی تو عمر بھر کا سکون و آرام رخصت ہو جائے گا۔ آج کل کے نوجوان شادی کرنے کے لیے صرف خوبصورتی کو پیشِ نظر رکھتے ہیں، یہ ان کی ناتجربہ کاری ہے۔ شادی کے لیے ایک عورت میں یہ باتیں علی الترتیب دیکھنی چاہئیں۔ سب سے پہلے بلوغت اور صحت، پھر مزاج اور اخلاق، پھر سلیقہ اور علم اور سب سے آخر میں شکل وصورت۔ شکل و صورت ایسی بھی نہ ہو کہ دیکھ کر کراہت آئے یا نظر پر گراں گزرے، لیکن یہ بھی ضروری نہیں کہ وہ پری زاد ہی ہو۔ جو لوگ صرف حُسنِ صورت کو دیکھتے ہیں، وہ بعد میں پچھتاتے ہیں، کیوں کہ صورت تو بچّے ہونے کے بعد اور امورِ خانہ داری کی مشقتوں اور تفکّرات کی وجہ سے کچھ ہی عرصہ میں بدل جاتی ہے اور حُسن رخصت ہوجاتا ہے۔ یاد رکھیئے کہ اگر آپ کی بیوی کا مزاج، اخلاق اور سلیقہ اچھا نہ ہوگا تو وہ آپ کی نظر سے گر جائے گی۔ اسی طرح صحت اچھی نہ ہوگی تو شادی کے کچھ دن بعد ہی آپ کے ہاتھ میں دواؤں کی بوتلیں ہوں گی اور پاؤں میں ہسپتالوں کا چکّر۔ ڈاکٹر کا بل دیتے دیتے دیوالہ نکل جائے گا اور زندگی وبالِ جان ہو جائے

گی۔ اس کے علاوہ بیمار اور کمزور عورت سے جو اولاد ہو گی وہ بھی کمزور ہی ہو گی۔ بیوی کی اصل قدر جوانی میں نہیں بلکہ زمانۂ کہولت میں ہوتی ہے، جبکہ قویٰ رُو بہ انحطاط ہوتے ہیں اور انسان ایک سچّے رفیق و مددگار کی ضرورت محسوس کرتا ہے۔

عورت کو بھی انتخابِ شوہر میں پوری آزادی ہونی چاہیئے، بدقسمتی سے ہمارے ہاں عورت کو اس معاملہ میں کچھ دخل ہی نہیں۔ ماں باپ یا ورثاء جس کے ساتھ چاہتے ہیں بیاہ دیتے ہیں اور اُس سے پوچھا تک نہیں جاتا۔ یہ بہت بڑا ظلم ہے۔ ہر لڑکی کے ماں باپ اور ورثاء کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ خاوند کے ساتھ زندگی اس لڑکی کو گزارنی ہے تم کو نہیں گزارنی۔ یہ صحیح ہے کہ پردہ میں رہنے اور ناتجربہ کار ہونے کی وجہ سے خود لڑکی بھی صحیح انتخاب نہیں کرسکتی، ماں باپ زیادہ اچھا انتخاب کرسکتے ہیں لیکن پھر بھی یہ ضروری ہے کہ لڑکی کو اس کے آئندہ شوہر کا پورا حال بے کم و کاست بتا دیا جائے اور اُس کی منظوری لے لی جائے۔ اسلام نے تو عورت کو یہاں تک اختیار دیا ہے کہ وہ چاہے تو نکاح کے لیے کوئی سی خاص شرط یا شرائط مقرّر کرسکتی ہے۔ مہر کے بارے میں لڑکی کے ماں باپ اور خود لڑکی کو بہت محتاط رہنا چاہیئے اور مرد کی حیثیت کے مطابق ہمیشہ مہر کی مقدار معقول رکھنا چاہیئے۔ سب باتیں لڑکی کو بتا دینے کے بعد بھی اگر وہ راضی نہ ہو تو اسے مجبور نہ کرنا چاہیئے۔ بہتر یہ ہے کہ نکاح کرنے سے پہلے لڑکے اور لڑکی کے رشتہ دار چھ سات ماہ تک ایک دوسرے کے ہاں مہمان آتے جاتے رہیں تاکہ ایک دوسرے کے اخلاق اور معیشتی و معاشرتی معیار کا صحیح اندازہ ہو جائے۔ اگر لڑکا یا لڑکی ایک دوسرے کو دیکھ لیں یا تصویریں دکھا دی جائیں تو بھی کچھ حرج نہیں۔ رسول اللہؐ نے کئی دفعہ مَردوں کو فرمایا ہے کہ تم عورت کو خود دیکھ کر شادی کرو۔ اب ہم نکاح کے بعد خاوند اور بیوی میں سے ہر ایک کے فرائض الگ الگ بیان کرتے

ہیں۔

خاوند کے فرائض: نکاح ہوتے ہی مرد پر یہ باتیں فرض ہو جاتی ہیں:

۱۔ کہ وہ اپنی بیوی کی حرکات و عادات کا بغور مطالعہ کرے اور جو باتیں ناپسند ہوں ان کو ذہن نشین کر لے، لیکن ان باتوں پر بیوی کو کبھی بھول کر بھی ڈانٹ ڈپٹ نہ کرے بلکہ مناسب موقعوں پر پیار اور محبت سے سمجھا کر اصلاح کی کوشش کرتا رہے اور رفتہ رفتہ اسے اپنی مرضی کے مطابق ڈھال لے یا پھر اپنی عادات میں تھوڑا بہت تغیر و تبدل کر کے اُس کی مرضی کے مطابق کر لے۔

۲۔ بیوی کو امورِ خانہ داری کی اہمیت سے آگاہ کر دے اور یہ بتا دے کہ میں فلاں بات اس طرح چاہتا ہوں، مثلاً مجھے ایسا کھانا پسند ہے، میں فلاں وقت ناشتہ کرتا اور فلاں وقت نہاتا ہوں، فلاں وقت کھانا تیار چاہتا ہوں، وغیرہ وغیرہ۔

۳۔ بیوی کو اپنی حیثیت کے مطابق مکان، کھانا، کپڑا، زیور اور دیگر ضروریات زندگی مہیّا کرے اور اس کے خوش رکھنے کے لیے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرے اور کسی طرح بھی اس کو یہ محسوس نہ ہونے دے کہ وہ اپنا گھر یعنی ماں باپ اور اپنے بہن بھائیوں کو چھوڑ کر کسی اجنبی جگہ آئی ہے۔ ہر خاوند کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ خود اس کی اپنی خوشی اور سکونِ قلبی اس کی بیوی کی خوشی اور سکون پر منحصر ہے۔ تمام دن کسبِ معاش کے لیے محنت کرنے کے بعد تھکا ہارا مرد جب گھر آتا ہے اور بیوی کو سُست اور غمگین یا بددل پاتا ہے تو اُس کی کوفت اور زیادہ ہو جاتی ہے۔ برخلاف ازیں اگر وہ بیوی کو خوش و خرم اور ہشاش بشاش دیکھتا ہے تو اس کی ساری تکان اور کوفت کافور ہو جاتی ہے۔

۴۔ اگر بیوی بیمار ہو جائے تو علاج میں تساہل اور لیت و لعل نہ کرے۔ جو لوگ اپنی

بیویوں کی پروانہیں کرتے وہ اس پر ہی نہیں خود اپنے اوپر اور اپنے بچوں پر ظلم کرتے ہیں۔ بیمار عورت امور خانہ داری اچھی طرح انجام نہیں دے سکتی۔

۵۔ گھر کا سودا سلف خود لا کر دے یا اُس کا کوئی اور معقول بندوبست کرے۔ اُمراء کے ہاں یہ کام ملازم کرتے ہیں، مگر صاحبِ خانہ کو ان کی نگرانی ضرور کرنی چاہئے۔ اگر صاحبِ خانہ کو ان باتوں کی فرصت ہی نہ ہو تو بیگم صاحبہ یا اور کسی ذمّہ دار مرد یا عورت کو یہ کام سپُرد کیا جا سکتا ہے۔ خاص خاص چیزیں مثلاً آٹا، گھی، چینی، ایندھن، دالیں اور مسالہ وغیرہ پورے مہینے کا اکٹھا خریدنا چاہئے۔ پیاز اور دالیں وغیرہ فصل پر جب سَستی ہوں اکٹھی خرید لی جائیں تو بہت فائدہ ہوتا ہے۔ سامان کسی حالت میں قرض نہیں لانا چاہئے، اس سے برکت اُڑ جاتی ہے۔

۶۔ جب بچے ہو جائیں تو اُن کی پرورش اور تربیت میں پوری دلچسپی لے اور بیوی کو پوری مدد دے۔ بچوں سے پیار و محبت اور عزّت سے پیش آنا اور ان کی خوشی اور مسرت کے سامان بہم پہنچانا بہت ہی ضروری ہے۔ جب وہ پڑھنے کے قابل ہو جائیں تو کسی اچھے مدرسہ میں داخل کرنا اور توفیق ہو تو پرائیویٹ ٹیوشن کا بندوبست کرنا اور مدرسہ میں ان کی تعلیمی اور اخلاقی حالت سے واقف رہنے کے لیے ہیڈ ماسٹر یا ماسٹروں سے ملنا جلنا بھی باپ ہی کا فرض ہے۔ بچے بیمار ہو جائیں تو معالج اور معالجہ کا بندوبست کرنا بھی اُسی کے فرائض میں داخل ہے۔

۷۔ بڑے بڑے اُمراء اور حُکام وغیرہ جن کو دن رات مصروفیت رہتی ہے، یہ اُن پر بھی فرض ہے کہ ایک آدھ گھنٹہ صرف بیوی بچوں کے ساتھ بات چیت کرنے کے لیے ضرور وقف کر دیں ورنہ میاں بیوی اور بچوں کے درمیان وہ یگانگت اور موانست ہرگز پیدا نہ ہو گی جو

''ایک گھر'' کے ماحول کو جنّت نظیر بنانے کے لیے ضروری ہوتی ہے۔

بیوی کے فرائض:

۱۔ میاں کی عادات کو سمجھنے اور اپنے آپ کو اُس کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کرے، خاوند میں جو بُری عادتیں ہوں اُن کے لیے اس کو کبھی بُرا بھلا نہ کہے، خاموش رہے اور برداشت کرے، مگر مناسب موقعوں پر عزّت اور محبت کے ساتھ اس کو اُن سے آگاہ کرتی رہے۔ ایک صاحب شراب بہت پیا کرتے تھے، اُن کی بیوی اس پر اُن سے ہمیشہ لڑتی رہتی تھی مگر اُن پر کچھ اثر نہ ہوا، بلکہ ہوا تو یہ کہ وہ بیوی سے نہایت بدسلوکی کرنے لگے، کچھ عرصہ بعد وہ بیوی مرگئی اور انہوں نے دوسری شادی کرلی اور اس سے چھپا کر پیتے رہے۔ یہ بیوی بہت نیک اور بھولی بھالی تھی، شادی کے کوئی ایک برس بعد جب وہ گھر کی صفائی کررہی تھی، اس نے ایک الماری میں شراب کی کچھ بوتلیں دیکھیں، سونگھا تو سخت بدبو آئی، اس نے بوتلوں کو خالی کرکے خوب دھویا اور صاف کرکے الماری میں رکھ دیا۔ شام کو جب صاحبِ گھر آئے اور کھانا وغیرہ کھانے کے بعد اطمینان سے بیٹھ گئے تو بیوی نے کہا کہ اس الماری میں جو شربت رکھا تھا وہ بالکل سڑ گیا تھا اور اس میں سخت بدبو پیدا ہوگئی تھی، میں نے وہ سب پھینک دیا اور بوتلوں کو دھو دُھلا کر صاف کرکے رکھ دیا ہے۔ اس بات کا خاوند پر اتنا اثر ہوا کہ اُسی دن شراب نوشی سے توبہ کرلی اور پھر عمر بھر نہ پی۔ جو عورتیں صبر اور عقلمندی سے کام لیتی ہیں، وہ اپنے خاوندوں کا کردار سُدھارنے میں اکثر کامیاب ہوجاتی ہیں۔ جن مَردوں کی بیویاں مصیبت کے وقت اُن کی حوصلہ افزائی کرتی ہیں وہ اکثر مشکلات پر غالب آجاتے ہیں اور اپنی بگڑی پھر بنالیتے ہیں۔

۲۔ عورت کو چاہیئے کہ جہاں بیاہ کر آئی ہے اسی گھر کو آئندہ اپنا گھر سمجھے، میکے کی فضا کو

بھلانے اور اس نئے گھر میں دل لگانے کی کوشش کرے، گھر کے ماحول اور حالات کو اچھی طرح سمجھے اور عقل مندی سے امورِ خانہ داری کو سرانجام دے۔

۳۔ میاں کی خدمت ہر عورت کا فرض اولین ہے، ہر بیوی کو چاہئے کہ خاوند کی ضروریات کا انصرام خود کرے مثلاً ناشتہ اور کھانا وقت پر تیار کرنا یا کرانا، غسل کے لیے وقت پر گرم یا سرد پانی تیار کرنا، صابون، تولیہ اور کپڑے درست کر کے رکھنا، جوتوں پر پالش کرنا کرانا اور خاوند بیمار ہوجائے تو اس کی تیمارداری کرنا اور غذا اور دوا وقت پر دینا۔

۴۔ دن بھر کام کرنے کے بعد تھکا ہارا مرد جب گھر آتا ہے تو اس کی طبیعت آرام و سکون کی متلاشی ہوتی ہے۔ اگر وہ گھر میں گُھستے ہی روتے بسورتے ہوئے یا سہمے ہوئے چہرے دیکھے یا ساس بہو، نند بھاوج، دیورانی جٹھانی کی لڑائی بھڑائی چیخم چاخ، کوسنے پیٹنے کی آوازیں سُنے یا بیوی بچے میلے کچیلے سر جھاڑ منہ پھاڑ بُھتنے اور بُھتنی بنے ہوئے اس کے سامنے آئیں تو اس کو آرام کی بجائے تکلیف اور سکون کی بجائے پریشانی ہوتی ہے۔ وہ کہتا ہے خدایا میں کیا کروں، باہر جاتا ہوں تو افسروں کا غصّہ، ڈانٹ پھٹکار اور ہم کاروں کے طعنے مہنے اور بُرا بھلا سنتا ہوں، کام کرتے کرتے چوٹی کا پسینہ ایڑی تک آجاتا ہے، تھک کر چُور ہوجاتا ہوں، گھر آتا ہوں تو اُسے جہنم کا نمونہ پاتا ہوں، خداوندا اس زندگی سے تو موت اچھی۔ ایسے مَردوں کی صحت بہت جلد خراب ہو جاتی ہے اور عمر بھی زیادہ نہیں ہوتی۔ برخلاف ازیں جو لوگ گھر میں بیوی بچوں اور دوسرے مکینوں کو صاف سُتھرا ہنستے اور مُسکراتے ہوئے دیکھتے ہیں، اُن کی ساری کوفت دُور ہو جاتی ہے۔ اکثر بیویوں کی عادت ہوتی ہے کہ گھر میں گُھستے ہی خاوند کے سامنے دنیا بھر کا دکھڑا لے بیٹھتی ہیں، آج فلاں عورت مجھ سے لڑنے آئی تھی، نوکر پیسے لے کر بھاگ گیا، اِس بچے نے اس کا سر پھاڑ دیا، بنیا اپنا

حساب کرنے آیا تھا، قصائی نے گوشت دینے سے انکار کر دیا، وغیرہ وغیرہ، تو ایسی عورتیں نہایت ہی بیوقوف ہوتی ہیں، وہ اپنے گھر کو اپنے ہاتھ سے تباہ کرتی ہیں۔ ہونا یہ چاہئے کہ جب خاوند کے آنے کا وقت ہو، بچوں کو نہلا دُھلا کر اچھے کپڑے پہنائیں، خود بھی اچھے کپڑے پہنیں اور بناؤ سنگھار کر کے میاں کے استقبال کو تیّار ہو جائیں۔ جب وہ اندر آئے تو ہنس کر اُس کی پیشوائی کریں، اس کے کپڑے وغیرہ اتارنے میں مدد دیں، کچھ ناشتہ وغیرہ پیش کریں اور جو کچھ بدخبریاں ہوں رات کو جب اُس کی تکان اُتر جائے اور مزاج خوش ہو، اس وقت اچھے الفاظ اور مناسب انداز سے سنائیں۔ جو عورتیں ایسا نہیں کرتیں، خاوند ان سے نفرت کرنے لگیں تو انہیں شکایت کا کوئی حق نہیں ہے، کیونکہ وہ اپنے حق میں خود کانٹے بوتی ہیں۔

۵۔ ہر عورت کا فرض ہے کہ گھر کے تمام کاموں کی ذمہ داری کا احساس کرے اور اُن کو خوشی اور محنت سے سرانجام دے، مصیبت سمجھ کر جبر و اکراہ سے نہیں۔ گھر کی پاکیزگی جھاڑُو بہارُو، فرنیچر اور فرش فروش کی دیکھ بھال اور صفائی اور چیزوں کو قرینے سے رکھنا اور سجانا عام باتیں ہیں، ان میں غفلت نہ کرنی چاہئے، ورنہ تھوڑے ہی دنوں میں اچھا خاصا گھر کباڑی کی دکان بن جائے گا۔ بہتر طریقہ یہ ہے کہ ہر چیز کی ایک مناسب جگہ مقرّر کر دی جائے اور پھر وہ چیز استعمال کرنے کے بعد ہمیشہ وہیں رکھی جائے۔

۶۔ مندرجہ بالا امور کے علاوہ عورتوں کے خاص کام کھانا پکانا، سینا پرونا، کاڑھنا بُننا اور کپڑے دھونا بھی ہیں۔ جو عورتیں ان کاموں میں جتنی زیادہ ماہر ہوتی ہیں ان کے میاں ان کی اتنی ہی قدر زیادہ کرتے ہیں۔ کھانا ایسا پکانا چاہئے جو خاوند کو پسند ہو، اپنی پسند کو قربان کر دینا چاہئے۔ بہتر ہے کہ خاوند سے ہفتہ بھر کا پروگرام بنوا لیا جائے تا کہ روزمرّہ دونوں وقت

پوچھنے کی ضرورت نہ پڑے۔ خاوند کے، اپنے اور بچوں کے معمولی کپڑے مثلاً قمیصیں اور پاجامے وغیرہ ہر عورت کو خود سینے چاہئیں۔ سوئیٹر، موزے اور دستانے وغیرہ بُننا، میز پوش، تکیوں کے غلاف اور چادریں وغیرہ کاڑھنا بھی سلیقہ مند عورتوں کا کام ہے۔ کپڑے دھونا بھی عورت کے فرائض میں ہے، ہم نے انگریزی فوج کے جرنیلوں کی بیویوں تک کو گھر کے معمولی کپڑے خود دھوتے دیکھا ہے، وہ گھر کے کسی کام کو عیب نہیں سمجھتی تھیں۔ ہماری خواتین کو بھی گھر کے چھوٹے موٹے کپڑے خود دھونے چاہئیں، اس سے اُن کی صحت اچھی رہے گی اور بچے اُن کو خود کام کرتا ہوا دیکھ کر کام کرنے کو بُرا نہیں سمجھیں گے۔

۷۔ بچوں کی پرورش اور تربیت بھی عورت کا ایک اہم بلکہ سب سے اہم فرض ہے۔ بچوں کو روزانہ نہلانا، کپڑے بدلنا، تیل لگانا، کنگھا کرنا، مناسب غذا کھلانا پلانا، مقررہ وقت پر سکول کا کام کروانا، خالی اوقات میں خصوصاً رات کو سونے سے پہلے ان کو پہاڑے یاد کرانا، اچھی اچھی کہانیاں سُنانا، مذہبی عقائد کو پختہ کرنے کے لیے قرآن کی چھوٹی چھوٹی سورتیں اور نماز یاد کرانا، ضروری مسائل بتانا اور تاریخِ اسلام کے ایسے واقعات بیان کرنا جن سے بچوں میں حوصلہ، مذہبی جوش، اللہ تعالیٰ اور رسولؐ کی محبت اور اسلام کے لیے ہر قربانی کرنے کا جذبہ پیدا ہو، یہ سب باتیں عورتوں ہی کے فرائض میں داخل ہیں۔ ان کے علاوہ بچوں کی صحت کا خیال رکھنا، بیمار ہوتے ہی ڈاکٹر کو دکھانا، چھوٹا موٹا علاج خود کر لینا بھی اُنہی کا فرض ہے۔ ظاہر ہے کہ عورت کے لیے ان تمام فرائض کی بجا آوری مشکل ہے، اِس لیے مَردوں کو بھی ان تمام باتوں میں حصّہ لینا اور عورتوں کی مدد کرنا اپنا فرض سمجھنا چاہئے۔ خوب یاد رکھو کہ اخلاقی اور مجلسی تربیت، تعلیم سے کسی طرح بھی کم نہیں بلکہ زیادہ ہی ضروری ہے، مگر اس تربیت میں کامیابی تب ہی ہوسکتی ہے جب کہ گہوارہ ہی سے اس کا التزام ہو۔ اس کے

لیے مندرجہ ذیل باتیں خاص طور پر یاد رکھنی چاہئیں۔

۱۔ جہاں تک ممکن ہو بچّے کو دیر تک ہرگز نہ رونے دو بلکہ رونے کی وجہ معلوم کر کے فوراً اس کا ازالہ کردو۔ بچّہ بلا وجہ کبھی نہیں روتا۔ بھوکا ہوگا، پیٹ یا کان وغیرہ میں درد ہوگا، بچھونا گیلا ہوگا، کوئی چیز چبھتی ہوگی یا گرمی سردی لگ رہی ہوگی۔ اگر بچوں کو زیادہ دیر تک رونے دیا جائے تو یہی عادت رفتہ رفتہ ضد کی صورت اختیار کر لے گی اور پھر بڑی مشکل سے چھوٹے گی۔

۲۔ بچوں کو ضد کی عادت سے بچانے کے لیے ضروری ہے کہ اُن کا کہنا فوراً پورا کر دیا جائے، اگر کوئی بات پوری نہ ہو سکے تو فوراً اُن کا خیال دوسری طرف بدل دینا چاہیے۔ اُن کو ہر وقت گود میں ہرگز نہ رکھو اور التزاماً ہر روز دو تین گھنٹے خالی کمرے میں اکیلا رکھا کرو تا کہ شروع ہی سے ان کو اپنے اوپر بھروسا کرنے کی عادت ہو جائے۔

۳۔ بچوں کو تربیت دینے کے لیے سب سے ضروری بات یہ ہے کہ ان کو کہنا ماننے کی عادت ڈالو اور اپنی مثال سے یہ سکھاؤ کہ وہ ہر اَمر کے جواب میں ''جی ہاں'' ''بہت اچھا'' وغیرہ کہنے لگیں اور جو کچھ تم کہو خوشی خوشی کر دیں۔ اُن کو ابتداء ہی سے کام کرنے کی عادت ڈالنی چاہیے۔ جب وہ چلنے لگیں تو وقتاً فوقتاً ان سے کہو کہ فلاں چیز اٹھا لاؤ، فلاں چیز لے جاؤ، یہ چیزیں وہاں رکھ دو، یہاں بیٹھو، اب لیٹ جاؤ وغیرہ وغیرہ۔ اس مشق سے دوہرا فائدہ ہوگا، ایک تو فرمانبرداری کی عادت پڑے گی، دوسرے نادانستہ طور پر عمل کی قوّت بڑھتی چلی جائے گی۔ بچوں کے سامنے کبھی ایسی باتیں نہ کرو جن سے یہ معلوم ہو کہ کام کرنا کوئی عیب یا مصیبت کی بات ہے، مثلاً اپنی غریبی کی باتیں کبھی نہ کرو اس سے احساس کمتری پیدا ہوتا ہے۔ ایسی باتیں کبھی نہ کرو کہ فلاں عورت کے ہاں تو اللہ نے نوکر دیئے ہیں، سب

کام نوکر کرتے ہیں، ہماری قسمت دیکھئے سب پاپڑ خود ہی بیلنے پڑتے ہیں۔ یوں بھی نہ کہو کہ فلاں کے بچے تو موٹر یا تانگے میں سکول آتے جاتے ہیں، ہمارے بچوں کو دھوپ اور بارش میں بھی پیدل آنا پڑتا ہے۔ یوں بھی نہ کہو کہ فلاں کے ہاں سودا سلف نوکر لاتے ہیں، ہمارے بچوں کو سودا بھی خود لانا پڑتا ہے بلکہ برخلاف اس کے اُن سے خوب کام کراؤ، گھر کا بھی اور گھر سے باہر کا بھی اور کام کرنے میں اُن کی خوب ہمّت افزائی کرو۔ اگر کسی کے آباؤ اجداد امیر تھے تو ہرگز اُن کا ذکر اس انداز سے نہ کرو جس سے احساسِ کمتری پیدا ہو۔

۴۔ اصلاح کے خیال سے بچوں کو مارنا پیٹنا، گھُرکنا اور بُرا بھلا کہنا ہرگز جائز نہیں۔ اس سے بچے سُدھرتے نہیں اُلٹے بے حیا اور ڈھیٹ ہو جاتے ہیں اور بڑے ہو کر غیرتِ نفسی اور خودداری سے بے بہرہ رہتے ہیں۔ خوب یاد رکھو کہ اصلاح کے لیے سزا ملنے کا خوف خود سزا سے کہیں زیادہ مفید اور مؤثّر ہوتا ہے، اکثر آدمی جو جیل خانے کے خیال سے بھی کانپ جاتے ہیں، جب ایک مرتبہ جیل ہو آتے ہیں تو دوبارہ جانے سے ذرا بھی نہیں گھبراتے، کیونکہ انہیں وہاں کی زندگی اور تکالیف کا علم ہو جاتا ہے اور لاعلمی کی وجہ سے پہلے جو ڈر دل میں بیٹھا ہوا تھا جاتا رہتا ہے۔ اکثر عادی مجرم جیل سے رہا ہوتے وقت یہ کہہ کر آتے ہیں کہ ہماری کوٹھڑی اور کسی کو نہ دینا ہم جلدی ہی واپس آجائیں گے۔ یہی حال بچوں کا ہے، مار کھانے سے پہلے اُن کو اُس تکلیف کا اندازہ نہیں ہوتا اور وہ بہت ڈرتے ہیں کہ اگر تھپڑ یا ڈنڈا لگا تو خدا جانے کیسی تکلیف ہو گی، لیکن جب ایک دفعہ مار کھا لیتے ہیں تو ان کو تکلیف کا اندازہ ہو جاتا ہے، وہ کہتے ہیں کہ او ہو یہ تو کچھ بھی نہیں ہم تو اسے بخوبی برداشت کر سکتے ہیں، چنانچہ جس قدر زیادہ پٹتے ہیں اسی قدر بے خوف اور نڈر ہوتے جاتے ہیں، یہاں تک کہ مار پیٹ اور ڈانٹ ڈپٹ اُن کے لیے بہت معمولی بات ہو جاتی ہے۔

۵۔ بچوں کی اصلاح کا سب سے اچھا طریقہ یہ ہے کہ اُن کے ساتھ اس قدر محبت اور شفقت کا برتاؤ کیا جائے کہ وہ تم سے ہل جائیں اور تمہاری محبت کے عادی اور بھوکے ہو جائیں۔ ان کو ہمیشہ اپنے ساتھ کھلاؤ پلاؤ، اپنے ساتھ بازار اور سیر کو لے جاؤ اور ہر روز ایک آدھ چیز ایسی دو جو اُن کی خاص پسند کی ہو، اگر وہ تمہارے اس سلوک کے عادی ہو گئے تو اصلاح میں کامیابی یقینی ہے۔ اب اگر وہ کبھی تمہارا کہنا نہ مانیں تو صرف اتنا کرو کہ ان سے بات کرنے سے انکار کر دو، کہہ دو کہ جاؤ ہم نہیں بولتے تم نے فلاں کام نہیں کیا۔ تمہارا اتنا کہنا اور اتنی سی بے اعتنائی ہی اُن کو ہزار دُرّوں کے برابر ہوگی۔ اس کا بھی اثر نہ ہو تو اپنے ساتھ کھانا وغیرہ کھلانے سے انکار کر دو، یا روزانہ جو پسند کی چیز دیتے ہو مت دو، اس طرح وہ ضرور تمہارا کہنا ماننے لگیں گے۔ اگر اس سے بھی زیادہ تہدید کی ضرورت ہو تو کچھ دیر کے لیے کونے میں دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑا کر دو۔ اگر کبھی سزا دینا ہی ناگزیر ہو تو کولہوں یا پیٹھ پر مارو، چہرے پر کبھی نہ مارو۔

۶۔ بچوں سے اس قسم کا فضول لاڈ پیار بھی نہ کیا جائے کہ وہ تمہارے سر پر چڑھ جائیں۔

۷۔ چھوٹے بچوں کی خطاؤں اور فروگذاشتوں پر غصّہ کرنا اول درجے کی حماقت ہے۔ وہ جانتے ہی نہیں کہ وہ کیا کر رہے ہیں، حتیٰ کہ اگر وہ کوئی گناہ بھی کر گزریں، مثلاً جھوٹ بھی بولیں یا غیبت بھی کریں تب بھی قانون اخلاق اور خدا، سب کی نظر میں بے گناہ اور معصوم ہیں۔ خطا دراصل اُن کی ہے جن کو دیکھ کر اِن معصوموں نے وہ عادت اختیار کی ہے۔

۸۔ بچے جب زیادہ جوش میں آ کر اچھلیں کودیں یا غل مچائیں تو ہرگز مت روکو اور کوئی

بات ایسی نہ کرو جس سے اُن کے حوصلے اور امنگیں پست ہو جائیں۔

۹۔ بچوں سے ایسی باتیں ہرگز نہ کہو جن سے وہ اپنے آپ کو حقیر و ذلیل، غریب، بے چارہ و بیکار سمجھنے لگیں۔ یاد رکھو بچے قوم کا سرمایہ بلکہ خود قوم ہی ہیں، اِس لیے اُن کو خوش خلق، ہنس مکھ، بے باک، نڈر لیکن حق پرست، راست گو، راست کردار، تندرست، طاقتور، بہادر، قوم اور اسلام کا خادم اور جان نثار بنانا تم پر فرض ہے۔

۱۰۔ بچوں کو سمجھانے کے لیے ہمیشہ صیغۂ امر استعمال کرو، نہی ہرگز استعمال نہ کرو، مثلاً جھوٹ سے روکنا ہو تو یوں نہ کہو کہ ''تم جھوٹ نہ بولو'' بلکہ یوں کہو کہ ''بچو سچ بولا کرو''۔ غرض یہ ہے کہ جہاں تک ممکن ہو گناہ اور بُرائیوں کے الفاظ سے ان کے کان نا آشنا رہیں۔ یاد رکھو جس قدر بُرائیوں کا ذکر ہو گا (خواہ روکنے کے خیال ہی سے کیوں نہ ہو) اسی قدر برائیاں زیادہ پھیلیں گی، اور جس قدر نیکیوں کا زیادہ ذکر ہو گا اسی قدر نیکیاں پھیلتی جائیں گی۔ ایک ماہرِ نفسیات اس بات کو خوب جانتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بھی بُرائیوں کا ذکر کرنے سے اسی لیے منع فرمایا ہے۔ اس کی ایک وجہ انسان کی یہ صفت بھی ہے کہ اس کو جتنا کسی کام سے منع کیا جائے اتنا ہی وہ اُسے کرنے پر ضد کرتا ہے۔ سب سے بہتر یہ ہے کہ بچوں کو جو کچھ سکھانا ہو خود کر کے اپنی مثال سے سمجھاؤ۔ بچے الفاظ سے اتنا نہیں سمجھتے جتنا کہ آنکھوں سے دیکھ کر سمجھتے اور سیکھتے ہیں۔ الغرض یہ ہیں ایک عورت کے روزانہ کے کام اور فرائض۔ جو مرد یہ سمجھتے ہیں کہ عورت کو کچھ کام ہی نہیں ہوتا وہ سخت غلطی پر ہیں۔ اگر یہ سب کام کسی مرد کو دو دن بھی کرنے پڑیں تو چیں بول جائے۔ مَردوں کو چاہیے کہ عورت کے ان تمام فرائض سے اس کو رفتہ رفتہ آگاہ کریں اور جو کام اُسے نہ آتا ہو، اس کی تعلیم دیں یا کسی سے دلوائیں۔ اگر اولاد زیادہ ہو اور ایک عورت کے لیے یہ سب کام عملاً ناممکن ہوں تو اس پر ہرگز سختی نہ کریں۔ آخر

وہ انسان اور گوشت پوست کی بنی ہوئی ہے فولاد کی بنی ہوئی نہیں ہے۔ ایسی صورت میں یا تو نوکر رکھیں یا خود ہاتھ بٹائیں۔ اب ہم گھر کے دوسرے مکینوں کا حال بیان کرتے ہیں۔

گھر کے دوسرے مکین:

ہم نے لکھا ہے کہ گھر کے اصل مکین ایک خاوند، اس کی بیوی اور بچے ہوتے ہیں۔ جب مسلمان زندہ تھے تو صورتِ حال یہی تھی، لیکن زوال کے ساتھ ساتھ جہاں اور برائیاں پیدا ہوئیں، غربت اور افلاس کی وجہ سے ایک خرابی یہ بھی پیدا ہوگئی کہ ان اصل مکینوں میں کچھ اور لوگ بھی شریک ہوگئے، مثلاً مالکِ خانہ کے والدین، بہنیں، بھائی اور بھاوجیں وغیرہ۔ زندہ قوموں میں یہ دستور ہے کہ لڑکوں کو پڑھا لکھا کر اور کوئی کام سکھا کر خود کفیل بنا دیا جاتا ہے اور ان سے کہا جاتا ہے کہ جاؤ کھاؤ کماؤ، دنیا میں اپنی جگہ خود پیدا کرو اور اپنا گھر خود بناؤ۔ لیکن ہمارے ہاں علی الخصوص پاکستان اور ہندوستان میں یہ دستور ہے کہ لڑکے کو پرورش ہی اس خیال اور نظریہ سے کیا جاتا ہے کہ ”جب بڑا ہوگا، خود کمائے گا، آپ کھائے گا، ہمیں کھلائے گا“ اس نظریہ میں خلوص کا شائبہ بھی نہیں ہے بلکہ یہ سراسر خودغرضی اور خود مطلبی پر مبنی ہے۔ آج بچوں کو اس خیال سے پرورش نہیں کیا جاتا کہ وہ اللہ کی امانت ہیں اور ہمارے سپُرد اِس لیے کیے گئے ہیں کہ ہم ان کو مناسب تعلیم و تربیت دے کر ایک اچھا باعمل شہری اور پکّا مسلمان بنائیں بلکہ پیدا ہوتے ہی اُن کے ساتھ یہ امیدیں وابستہ کر لی جاتی ہیں کہ یہ بڑے ہو کر ہماری مدد کریں گے۔ غور کریں تو آپ کو اس نظریہ میں اُس بے عملی کی جھلک صاف نظر آئے گی جو صدیوں سے ہماری قوم پر لعنت بن کر چھائی ہوئی ہے۔ ابھی بچّہ پیدا بھی نہیں ہوتا اور ہم یہ ہوائی قلعے بنانے لگتے ہیں کہ وہ بڑا ہو کر ہماری مدد کرے گا اور ہم آرام سے ”پلنگ پر بیٹھے ہوئے“ کھائیں گے، یہی وجہ ہے کہ جب کسی کے لڑکی پیدا ہوتی ہے تو وہ وفورِ رنج و غم

سے سر بگر یباں ہو جا تا ہے۔ یہ نظریہ اور یہ خیال نہایت ذلیل اور کمینہ ہے، اس سے صرف یہی ثابت نہیں ہوتا کہ ہم عمل کرنے سے جی چُراتے ہیں، بلکہ یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ہمیں اللہ پر ایمان نہیں اور اُس نے قرآن مجید میں رزق رسانی کا جو وعدہ کیا ہے اس پر مطلق یقین نہیں رکھتے۔ نتیجہ اس نظریہ کا یہ ہوتا ہے کہ ادھر بچے نے بڑے ہو کر کچھ کمانا شروع کیا، ادھر ہر طرف سے مدد کے تقاضے شروع ہو گئے، چنانچہ اُس کی آدھی سے زیادہ عمر اسی کشا کش میں گزر جاتی ہے اور وہ اپنے گھر کو ''گھر'' نہیں بنا سکتا۔ بعض حالتوں میں یہ کشا کش اس قدر شدید ہوتی ہے کہ وہ بے چارہ تفکّرات اور پریشانیوں کی وجہ سے طرح طرح کے امراض کا شکار ہو کر قبل از وقت مر جاتا ہے اور اگر بدنصیبی سے زندہ بھی رہا تو وہ زندگی موت سے بدتر ہوتی ہے۔ بہت سے خاندان اِن خرابیوں سے پاک بھی ہیں، لیکن اوسط درجہ کے گھرانوں کی حالت عام طور پر یہی ہے جو ہم نے تحریر کی، اور خرابیاں جو اس نظریہ سے پیدا ہوتی ہیں اُن کا بھی تھوڑا سا حال سن لیجیے۔ ابھی لڑکا پوری طرح جوان بھی نہیں ہوتا کہ اماں جان کو ننھی سی دلہن لانے اور اپنے ''لال'' کو دُولہا بنا ہوا دیکھنے کی آرزو ستانے لگتی ہے اور ابھی وہ اچھی طرح اپنے پاؤں پر کھڑا بھی نہیں ہونے پاتا کہ دلہن بنّو کی سنہری بیڑیاں اُس کے پاؤں میں ڈال دی جاتی ہیں اور چاؤ چو چلے کو پورا کرنے کے لیے شادی کی لغو، فضول اور خلاف اسلام و انسانیت رسموں پر قرض دام جس طرح بھی ہو روپیہ حاصل کر کے پانی کی طرح بہایا جاتا اور دل کے ''ارمان'' نکالے جاتے ہیں حالانکہ بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ قرض کا بار اُس نو گرفتارِ بلا یعنی دولہا کی گردنِ افتخار کو برس ہا برس سیدھا نہیں ہونے دیتا، یہ تو سب کچھ ہوتا ہے، لیکن زیادہ دن نہیں گزرنے پاتے کہ وہی اماں جان ساس کے روایتی روپ میں نمودار ہو کر اس ننھی منی دُلہن پر ایسے مظالم توڑتی ہے کہ دُلہن اور دولہا دونوں کی

زندگی اجیرن ہو جاتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ ساسیں اپنے بچے کے آرام یا اُس کا گھر بسانے کے خیال سے اس کی شادی نہیں کرتیں، بلکہ اپنے لیے ایک بے تنخواہ کی خادمہ یا ماما حاصل کرنا چاہتی ہیں۔ بعض ساسیں یہ برداشت نہیں کر سکتیں کہ صاحبزادے صاحب اُن کے مقابلے میں اپنی بیوی سے محبت کرنے لگیں۔ اُن کے سر پر اکثر یہ خوف سوار رہتا ہے کہ کہیں صاحبزادے صاحب اپنی کمائی اُن کے ہاتھ میں دینے کی بجائے اپنی بیوی کے ہاتھ میں نہ دینے لگیں۔ پھر ساسیں ہی نہیں بلکہ اکثر نندیں تو ان ساسوں سے بھی زیادہ ظالم اور بِس کی گانٹھیں ہوتی ہیں، حالانکہ اُن کا اس ''گھر'' پر کوئی حق نہیں ہوتا۔ یہی نہیں بعض گھروں میں جیٹھ، دیور، جٹھانیاں اور دیورانیاں وغیرہ بھی لگائی بجھائی کر کے لڑائی بھڑائی اور دنگا فساد برپا کرنے میں کسر نہیں اٹھا رکھتیں۔ اس طرح وہ گھر جس کو رسول اکرمؐ نے ''حرم'' کے پُراز تمکین لفظ سے یاد فرمایا ہے اور جو جنّت الفردوس کا جیتا جاگتا نمونہ ہونا چاہئے، اچھا خاصا جہنّم بن جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے گھر میں جو بچے پرورش پائیں گے ان میں حُسنِ اخلاق، محبت واخوت اور یک جہتی و یگانگت کے جذباتِ عالیہ کس طرح پیدا ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ ہماری قوم کے افراد میں ان محاسن کا جو فقدانِ عظیم پایا جاتا ہے اس کی وجہ یہ اور صرف یہ ہے کہ وہ بچپن ہی سے ایک ایسی پُر فساد و عناد فضا میں آنکھ کھولتے اور پرورش پاتے ہیں جہاں انسانیت، ہمدردی اور شرافت و نیکی کا نام و نشان بھی نہیں ہوتا۔

اس کے برخلاف بعض کھاتے پیتے گھرانوں میں دلہن بی بی کو ہتھیلی کا پھپولا بنا کر رکھا جاتا ہے۔ ہل کر پانی بھی نہیں پینے دیا جاتا، کام کاج اور امور خانہ داری کو سنبھالنے کا تو ذکر ہی کیا۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب اماں جان اللہ کو پیاری ہوتی ہیں اور دلہن بی بی کو کام کاج سنبھالنا پڑتا ہے تو ناتجربہ کاری اور بے حوصلگی کی وجہ سے تمام کام چوپٹ ہو جاتے ہیں اور اچھے

خاصے گھر کا گھروندا بن جاتا ہے۔

اندریں حالات اگر آپ چاہتے ہیں کہ ہماری قوم ترقی کرے تو اس نظریۂ پرورش اور اس طریقۂ رہائش کو جلد از جلد بدلنے کی کوشش کرنا چاہیئے۔ اس تحریر سے ہمارا منشاء ہرگز یہ نہیں ہے کہ نعوذ باللہ ضعیف اور ضرورت مند ماں باپ یا دوسرے اعزاء و اقارب کی مدد یا خدمت نہ کی جائے۔ بلکہ ہمارا مطلب صرف یہ ہے کہ ہمارے ہر فرد کو اس طرح پرورش کیا جائے کہ وہ بڑھاپے سے پہلے پہلے کام کاج اور محنت کر کے اتنا کما لے کہ اپنی اولاد یا کسی اور کا دست نگر ہونا ہی نہ پڑے۔ بلکہ آخر وقت تک اپنا اور اپنی بیوی یا چھوٹے بچوں کا گذارہ اپنی پس انداز کی ہوئی رقم سے کرتا رہے اور ضرورت پڑ جائے تو حسبِ توفیق دوسروں کی مدد بھی کر سکے۔

والدین: والدین کے حقوق بیوی بچوں کے حقوق پر بھی فوقیت رکھتے ہیں۔ سورۂ بقرہ، بنی اسرائیل، عنکبوت، لقمان اور سورۂ احقاف وغیرہ میں صاف صاف احکام خداوندی موجود ہیں کہ اپنے والدین کے ساتھ نیکی سے پیش آؤ، اُنکی خدمت کرو، جب بوڑھے ہو جائیں تو اُن کو کبھی سختی سے جواب نہ دو بلکہ اُف تک بھی نہ کرو اور اُن کے سامنے عاجزی اور انکساری اختیار کرو۔ یہ ہے وہ شریفانہ اور مہذّبانہ تعلیم جو قرآن ماں باپ کے ساتھ پیش آنے کے متعلق دیتا ہے۔ اس تعلیم کی روشنی میں ہر مسلمان کو یاد رکھنا چاہیئے کہ میرا باپ وہی تو ہے جس کے نطفہ سے میں پیدا ہوا ہوں۔ جس نے ہر قسم کی تکلیف اٹھا کر مجھ کو اپنے سے بہتر کھلایا پہنایا، پڑھایا لکھایا یا کوئی ہنر سکھایا، نیکیوں پر چلنا اور بدیوں سے بچنا بتایا۔ جو ہمیشہ میری تکلیف سے رنجیدہ اور میری خوشی سے خوش ہوتا ہے اور صرف یہی ایک انسان ایسا ہے جو مجھے خود اپنے سے بھی زیادہ خوش، معزز اور دولت مند دیکھنا چاہتا ہے اور میری ماں یہ وہی

مبارک ہستی تو ہے جس نے نو ماہ تک مجھے پیٹ میں رکھنے کی تکلیف برداشت کی اور میری ولادت کے وقت موت سے دوچار ہو کر دوبارہ زندگی پائی۔ اس کے بعد مجھے اپنے بدن کا رس اور اُنس یعنی دودھ پلایا، میری خاطر ہر تکلیف اٹھائی، حتیٰ کہ جب میں پیشاب کر دیتا تھا تو یہ مجھے سوکھے میں سُلاتی تھی اور خود گیلے میں رہتی تھی۔ میں بیمار ہوا تو اس نے دن رات کا چین تج کر میری خدمت کی اور راتوں جاگتی رہی، غریب تھی تو خود فاقے کیے اور مجھے کہیں نہ کہیں سے لا کر کھلایا۔ اب میں جوان ہوں اور یہ دونوں ضعیف ہو کر میری محبت اور خدمت کے محتاج ہیں تو کیا اب میں ان سے منہ موڑ لوں؟ اس سے زیادہ کمینہ اور ذلیل حرکت اور کیا ہوگی۔

یہ ایک امرِ واقعہ ہے کہ جن بچوں کا باپ مر جائے، ان کی مائیں خواہ کتنی ہی غریب اور محتاج کیوں نہ ہوں، سو فیصدی ایسی ہوتی ہیں جو ہر طرح کی مصیبت جھیل کر اُن کی پرورش کر لیتی ہیں۔ لیکن باپ بہت کم ایسے ہوتے ہیں جو بیوی کے مرنے کے بعد اپنے بچوں کی پرورش کے حقوق کماحقہٗ ادا کر سکیں اور خدا کے خوف سے ڈریں۔ ہم نے تو اونچے طبقات میں بھی اکثر بڑے بڑے تعلیم یافتہ پروفیسر، جج، بیرسٹر، جرنل، کرنل اور لکھ پتی اُمراء ایسے دیکھے کہ ایک بیوی کے مرتے ہی دوسری شادی رچا لی اور نئی بیوی کی غلامی میں اندھے اور بدمست ہو کر اپنے بچوں سے ایسا منہ موڑ لیا اور اس طرح بُھلا دیا گویا یہ اُن کی اولاد ہی نہیں اور معاشرے، اخلاق یا خدا کی طرف سے ان پر ان بچوں کی پرورش کا کوئی حق ہی عائد نہیں ہوتا، ایسے ہی لوگ ظالم کہلاتے ہیں۔ یہ لوگ ایسی حرکتیں قرآنی تعلیم سے ناواقفیت اور اپنے مراتب کی رعونت کی وجہ سے سنگدل ہو کر کرتے ہیں۔ مگر انہیں یاد رکھنا چاہئے کہ زندگی چند روزہ ہے آج نہیں تو کل مر کر اللہ کے سامنے جانا اور ان مظالم کا جواب دینا ہے۔ خیر یہ تو ایک

جملۂ معترضہ تھا۔ ہم حقوقِ والدین کا ذکر کر رہے تھے، تو آجکل غریب تو کیا صاحبِ استطاعت گھرانوں میں بھی ایسے ماں باپ شاذ و نادر ہی ہوتے ہیں جو اپنے لڑکوں کی شادی کر دینے کے بعد اُن کو الگ کر کے ان کی دُنیا الگ بنانے میں مدد دیں۔ عام طور پر یہی ہوتا ہے کہ شادی کے بعد لڑکوں کو اپنے ساتھ ہی رکھا جاتا ہے اور اس سے اکثر و بیشتر اُنہی دقّتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے جن کا ذکر پیچھے کیا جا چکا ہے، یعنی جب کسی کی ماں اور بیوی میں اَن بن ہو جائے تو وہ شریف آدمی سخت مشکل میں پھنس جاتا ہے۔ ایک طرف ماں اور اس کے حقوق کا پاس و لحاظ، دوسری طرف بیوی کے حقوق اور گھر کی خوش حالی اور خوش باشی کا سوال، ایک طرف کنواں اور دوسری طرف کھائی۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہمارے اسلامی معاشرے میں اس مصیبت کا کوئی علاج موجود ہے؟ اس کے جواب میں ہم کہتے ہیں کہ درحقیقت اس کا اصل علاج تو صرف یہ ہے کہ عورتوں کو صحیح مذہبی اور معاشرتی تعلیم دلائی جائے۔ ان میں وسیع النظری پیدا کی جائے اور اُن کو ہر ایک انسان کے متعلق خدا کے متعیّنہ حقوق کی حدود سے آگاہ کیا جائے۔ جب تک یہ نہ ہوگا اس قسم کی پریشانیاں کبھی دُور نہ ہوں گی اور ہمارا گھر صحیح معنوں میں ''گھر'' نہ بن سکے گا۔ دوسری ترکیب یہ ہے کہ ماں باپ کو الگ گھر میں رکھا جائے مگر ان کی مالی احتیاج اور ضروریات پوری طرح مہیّا کی جائیں اور اُن سے پوری محبت اور عزّت کا برتاؤ کیا جائے۔ لیکن یہ کام صرف صاحبِ استطاعت حضرات ہی کر سکتے ہیں پھر غریب لوگ کیا کریں۔ تو اس کا علاج ہماری رائے میں تو صرف یہ ہوسکتا ہے کہ آدمی صبر اور عقل مندی سے کام لے۔ ماں باپ اور بیوی بچوں سبھی کے حقوق ادا کرے، ماں اور بیوی دونوں ہی کی دلجوئی کرے، بیوی کی زیادتی ہو تو محبت سے سمجھائے نہ مانے تو سختی سے کہے، ماں کی زیادتی ہو تو ادب

سے سمجھائے اور اپنی مجبوریاں اُس کے ذہن نشین کرتا رہے، اس طرح شاید کچھ فضا اچھی پیدا ہو جائے، لیکن ان باتوں کا حقیقی علاج جیسا کہ ابھی ہم نے عرض کیا ہے صحیح مذہبی اور معاشرتی تعلیم و تربیت کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

نوکر چاکر: نوکر بھی اکثر لوگوں کی زندگی کا جزوِ لاینفک ہیں اور اُن کی شخصیت اور کردار پر صاحبِ خانہ کے آرام و راحت اور تکلیف و پریشانی کا بہت کچھ انحصار ہے۔ اسی لیے کسی کو ملازم رکھنے سے پہلے اُس کے کردار اور چال چلن کی اچھی طرح تحقیق کر لینا چاہئے اور نوکر رکھ لینے کے بعد اس کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھالنے کے لیے پوری قوّتِ برداشت سے آہستہ آہستہ تربیّت دینا چاہئے۔ نوکر کو اس کے فرائض اچھی طرح سمجھا دینے چاہئیں اور بتا دینا چاہئے کہ روزانہ بغیر کہے ہی وہ اپنے تمام کام خود کر لیا کرے۔ نوکروں کے ساتھ ایسا سلوک کرنا چاہئے کہ ان کو تمہارے گھر میں سکون و آرام ملے اور وہ وہاں سے نکلنے کے لیے آمادہ نہ ہوں۔ نوکروں کے ساتھ ہمیشہ ملائمت اور شرافت کا برتاؤ کرنا چاہئے، ان کی چھوٹی موٹی غلطیوں پر چشم پوشی کرنا چاہیے، بڑی بڑی غلطیوں پر پہلے نرمی سے سمجھانا چاہیے پھر بھی نہ مانیں تو ذرا سختی اور تہدید کرنا چاہیے اس پر بھی باز نہ آئیں تو الگ کر دینا چاہیے۔ آئے دن نوکر بدلتے رہنا کچھ اچھی بات نہیں، اس سے بدنامی بھی ہوتی ہے اور تکلیف بھی۔ نوکروں کو مارنا پیٹنا یا گالیاں دینا کسی طرح بھی جائز نہیں، وہ بھی تمہاری طرح انسان ہیں۔ نوکروں کو وہی کھانا کھلانا چاہئے جو تم خود کھاتے ہو اور کبھی کبھی کپڑے لتّے اور انعام و اکرام سے بھی سلوک کر دینا چاہئے تاکہ اُن کی حوصلہ افزائی ہو۔ نوکروں سے بے تکلّف ہو جانا ہرگز مناسب نہیں اس سے بعد میں سخت تکلیف کا سامنا ہوتا ہے۔ نوکروں کو گھر کے معاملات میں دخیل ہونے کی ہرگز اجازت نہ دینا چاہئے۔ اس بات کا بہت خیال رکھنا چاہئے کہ وہ

تمہارے بچوں کے ساتھ بھی اُسی ادب سے پیش آئیں جیسے کہ تمہارے ساتھ آتے ہیں۔ جو بچے نوکروں کے ساتھ بے تکلّف ہو جاتے ہیں یا نوکروں کو مارتے پیٹتے اور ڈانٹتے ڈپٹتے رہتے ہیں ان کا اخلاق خراب ہو جاتا ہے۔ یہ تو تھا ان لوگوں کا حال جو بسا اوقات ایک ہی گھر میں رہتے ہیں۔ اب ہم ان حقوق و فرائض کا حال بیان کریں گے جو گھر سے باہر ایک انسان پر عائد ہوتے ہیں۔

گھر سے باہر:

گھر سے باہر نکلتے ہی سب سے پہلا واسطہ پڑوسیوں سے پڑتا ہے پھر اہلِ محلّہ سے، اس کے بعد اہلِ شہر، اہلِ مُلک اور پھر اہلِ عالم سے۔ اِس لیے ماں باپ، خاص رشتہ داروں، یتیموں اور مسکینوں کے بعد سب سے پہلا حق پڑوسیوں کا ہے، چنانچہ سورہ نساء میں پڑوسیوں سے نیک سلوک کرنے کا حکم دیا گیا ہے خواہ وہ رشتہ دار ہوں یا نہ ہوں۔ سرکارِ دوعالمؐ فرماتے ہیں کہ ''وہ شخص مومن نہیں جو خود سیر ہو جائے اور اس کا ہمسایہ بھوکا رہے'' یہ بھی حضورؐ ہی کا ارشاد ہے کہ ''وہ شخص جنت میں داخل نہیں ہوگا جس کا ہمسایہ اس کی بُرائیوں سے امن میں نہ ہو'' اگر اِن ارشادات پر عمل کیا جائے تو معاشرے کی حالت چند ہی ماہ میں کچھ سے کچھ ہو جائے، لیکن افسوس ہے کہ ہمسائے تو درکنار آج کل تو سگے بھائیوں میں بھی وہ سلوک نہیں ہے جس کا حکم پڑوسیوں کے لیے دیا گیا ہے۔ اسلام اور ایمان کا تقاضا ہے کہ ہر شخص اپنے پڑوسیوں کے دُکھ درد اور راحت و خوشی میں شریک ہو، تاکہ محبت اور یگانگت کے جذبات پیدا ہوں۔ ہر شخص کو چاہئے کہ نہ صرف پڑوسیوں بلکہ محلے کے تمام آدمیوں سے اکثر و بیشتر ملتا رہے تاکہ سب ایک دوسرے کے حالات سے واقف رہیں تو بہت اچھا ہے ورنہ محلے کی مسجد میں تو ملنا ہو ہی سکتا ہے۔ اللہ اور رسولؐ اجتماعیت کی جو روح مسلمانوں میں

بیدار کرنا چاہتے ہیں وہ اس طریقہ سے بوجوہِ احسن بیدار ہوسکتی ہے۔

اہلِ شہر کے آپس میں ملنے جلنے اور تمام شہر کی حالت سے باخبر رہنے کے لیے مساجدِ جامع بہت کچھ مفید ہوسکتی ہیں۔ ان مساجد میں مروّجہ خطبوں کے علاوہ اگر شہر کی حالت پر بھی امام و خطیب صاحبان کچھ بیان کیا کریں اور نماز کے بعد ضروری امور پر جلسے ہوا کریں تو شہری زندگی سے حقیقی دلچسپی اور شہریت کی روح اہلِ شہر میں بہت جلد پیدا کی جاسکتی ہے۔ ہر شخص پر واجب ہے کہ وہ شہر کی حالت سے باخبر رہے اور شہر کی ترقی میں دلچسپی لے کیونکہ شہر کی عام حالت کا اثر ہر شہری پر بالواسطہ ضرور پڑتا ہے۔ اگر تمام شہریوں میں یہ روح بیدار ہو جائے تو تمام قوم میں اتّحاد و یگانگت پیدا ہوسکتی ہے۔ شہر کی ترقی کے لیے بلدیات بہت ہی مفید ادارے ہیں، ان میں صحیح اور مخلص قسم کے نمائندے بھیجنے چاہئیں۔ بلدیات کے قواعد و قوانین کی پوری پابندی اور حرمت کرنا چاہیے اور بلدیات کی املاک کو تقدس کی نگاہ سے دیکھنا اور ان کی حفاظت کرنا ہر شہری کو اپنا فرض سمجھنا چاہیے اور کسی چیز کو بھی نقصان نہیں پہنچانا چاہیے۔

شہر کی تفریح گاہوں، باغات، پارکوں، پانی کے نلوں اور ذخیروں، بڑی بڑی شاہراہوں اور گلی کوچوں کی روشنی اور صفائی کے انتظامات اور وسائل کے تحفظ کا بڑا خیال رکھنا چاہیے۔ ان کو نقصان پہنچانا یا گندا کرنا خلاف انسانیت و شرافت ہے اور ایسا کرنے والے نیم وحشی اور غیر مہذّب ہیں۔ شہر میں جو پردیسی آئیں ان کے ساتھ حُسنِ اخلاق سے پیش آنا اور ضرورت کے وقت حسبِ توفیق ان کی مدد کرنا بالکل اسلامی تعلیم اور منشاءِ خداوندی کے مطابق ہے۔ کسی بھولے بھٹکے کو راستہ بتانے یا منزل مقصود تک پہنچا دینے میں کوئی خاص تکلیف نہیں ہوتی، لیکن جس پردیسی کے ساتھ تم یہ سلوک کرو گے وہ ہمیشہ تم کو نیکی سے یاد کرے گا اور

تمہارے شہر کی تعریف میں رطب اللّسان رہے گا۔ محتاج پردیسیوں کی روپے پیسے سے مدد کر دینا، کسی پردیسی کا علاج کرا دینا یا اس کو ہسپتال میں داخل کرا دینا بھی بہت بڑی نیکی ہے۔ انہی باتوں سے قوم کی تہذیب یا بدتہذیبی کا پتہ لگتا ہے۔

شہر کے بعد مُلک کی باری آتی ہے۔ اپنے مُلک سے محبت کرنا ایمان کی علامت ہے بشرطیکہ یہ مُلک دارالسلام ہو اور وہاں مسلمانوں کی تخریب و تباہی کے منصوبے کارفرما نہ ہوں۔ جو مسلمان اپنے مُلک سے محبت نہیں کرتا وہ خود اسلام کے دفاع کی طرف سے بے پروائی برتتا اور اپنے دشمنوں کے ہاتھ مضبوط کرتا ہے۔ ملکی ترقی کی بُنیاد شہریت کے حقوق کا کماحقہٗ خیال رکھنے اور اچھا شہری بننے پر منحصر ہے۔ مُلک افراد کے مجموعے کا نام ہے، اگر افراد اچھے ہوں گے اور اپنے مُلک کی ترقی کے لیے تن من دھن سے ایثار کریں گے تو مُلک خوش حال اور طاقتور ہو جائے گا اور دشمنوں سے محفوظ رہے گا۔ اگر مُلک تباہ ہو گا تو افراد بھی تباہی سے نہ بچ سکیں گے خواہ وہ غریب ہوں یا امیر۔ اِس لیے ملکی ترقی کے ہر منصوبے میں پوری دلچسپی لو اور عملی کام کر کے دکھاؤ خواہ یہ منصوبہ اقتصادی ہو یا تعلیمی، معاشرتی ہو یا معیشتی، صنعتی ہو یا دفاعی۔ جس مُلک کے افراد ملکی ترقی کے منصوبوں کی پرواہ نہیں کرتے وہ اپنے دشمنوں کو دعوت دیتے ہیں کہ آؤ اور ہمارے مُلک کو تباہ کر دو۔

اسلام تنگ دلی ہرگز نہیں سکھاتا بلکہ بلا لحاظ مذہب و ملّت ہر انسان کے ساتھ نیکی اور انصاف کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ حکم کہیں بھی نہیں دیا کہ غیر مسلموں سے نفرت کرو یا بلا وجہ ان کے ساتھ سختی اور تشدّد سے پیش آؤ۔ چنانچہ سورۂ قصص میں فرمایا ہے کہ ہر ایک کے ساتھ ایسی ہی بھلائی کر جیسی اللہ نے تیرے ساتھ کی ہے۔ یہ حکم تمام اہلِ عالم کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کے لیے ہے۔ اسی طرح اور جتنی نیکیوں کا حکم دیا گیا ہے ان میں بھی

کہیں یہ تخصیص نہیں کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ ہی کی جائیں۔ ہاں یہ سچ ہے کہ اللہ نے غیر مسلموں کے ساتھ اس قدر نرمی اور رواداری کی اجازت بھی نہیں دی کہ وہ تمہاری نرمی سے ناجائز فائدہ اٹھا کر تم پر چھا جائیں اور رفتہ رفتہ غالب آ جائیں جیسا کہ پچھلی دو صدیوں میں تمام ممالکِ اسلامیہ کو تجربہ ہو چکا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تم کو نہایت سختی سے یہ حکم دیا ہے کہ جو غیر مسلم ممالک تمہیں تباہ کرنے کی فکر اور تدبیریں کر رہے ہوں ان سے ہوشیار رہو، ان کے عہد و پیمان اور دوستانہ وعدوں پر بھروسا نہ کرو۔ اُن کے مقابلہ کی تیاریاں کرتے رہو اور جب وہ تم کو تمہارے گھروں یا ملکوں سے بے دخل کرنے کے لیے حملہ کریں تو اتنا لڑو کہ اُن کو فنا کر دو یا شہید ہو جاؤ۔ اللہ ہر معاملہ میں صراطِ مستقیم یعنی اعتدال پر قائم رہنے اور حکمت و عقل مندی سے عمل کرنے کا حکم دیتا ہے۔ اہلِ عالم کے ساتھ نیکی، شرافت اور حسنِ اخلاق سے پیش آنا اسلامی تہذیب و تعلیم کا پروپیگنڈا کرنا ہے۔ مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ جہاں بھی جاؤ کلمتہ اللہ اور تہذیبِ اسلامی کی تبلیغ کرو۔ ظاہر ہے یہ تبلیغ ڈنڈے کے زور اور کمینگی اور بدخوئی کے مظاہرے سے نہیں ہو سکتی۔ اس طرح تو جن لوگوں میں تم تبلیغ کرنا چاہتے ہو، وہ تمہارے مذہب کو اور تم کو بُرا سمجھنے لگیں گے۔ اِس لیے تمہارا فرض ہے کہ جس غیر مسلم یا غیر مُلک کے باشندے سے ملو اس کے دل پر اسلامی نیکی، تہذیب اور حُسنِ اخلاق کا سکہ بٹھا دو تا کہ وہ تمہارے مذہب کی خوبیوں کا معترف ہو جائے۔ اب ہم لوگوں سے ملنے جلنے کے آداب و قواعد بیان کرتے ہیں۔

میل ملاقات:

اسلام بے حد سوشل مذہب ہے، یہ گھروں میں بند پڑے رہنا اور میل ملاقات سے گھبرانا یا کترانا نہیں سکھاتا۔ اسلام میں عبادات تک کی نہج ایسی ہے کہ لوگوں کو زیادہ سے

زیادہ آپس میں ملنے جلنے کا موقع ملتا ہے۔ اس سے موانست و اخوّت کے جذبات پرورش پاتے اور وہ روح اجتماعیت پروان چڑھتی ہے جو قومی بقاء کے لیے پہلی ضروری چیز ہے۔ اِس لیے ہر مسلمان کو چاہئے کہ میل ملاقات کے مندرجہ ذیل آداب و قواعد پر سختی سے عمل کرے۔

جب تم کسی کے گھر جاؤ تو مناسب یہ ہے کہ پہلے سے ملاقات کا وقت مقرّر کر لو تا کہ وہ اس وقت گھر پر موجود رہے۔ جب کسی کے گھر پہنچو تو دروازہ کھٹکھٹاؤ یا نرمی سے آواز دو، اگر گھر میں داخل ہونے کی اجازت ملے تو جاؤ، لیکن اگر یہ کہہ دیا جائے کہ لوٹ جاؤ تو واپس چلے آؤ۔ آج کل ہزار مسلمانوں میں سے شاید ایک دو ہی ایسے ہوں گے جو اس بات کا بُرا نہ مانیں، حالانکہ یہ اللہ کا حکم ہے (دیکھو سورہ نور رکوع ۴) درحقیقت کوئی آدمی بھی اس قدر بدخلق نہیں ہوتا کہ تم اُس کے گھر جاؤ اور وہ ملنے سے انکار کر دے، لیکن اگر کبھی کوئی شخص اس طرح انکار کر دے تو تم کو بُرا نہیں ماننا چاہئے بلکہ یوں سمجھ لینا چاہئے کہ یقیناً اس وقت اس کے گھر کے حالات ہی ایسے ہوں گے جو وہ ملنے سے معذور ہے۔ تم کو کیا معلوم کہ اس وقت وہ کن پریشانیوں میں مبتلا ہے۔ ایسے وقت میں ملاقات ہو بھی تو نہایت بے لُطف ہوتی ہے، اِس لیے یہ بالکل درست ہے کہ صاحبِ خانہ صاف صاف معذرت کر دے اور مہمان بُرا نہ مانے۔

اگر اجازت مل جائے اور تم گھر میں داخل ہو تو پہلے سلام اور مصافحہ کرو پھر مناسب جگہ پر بیٹھ جاؤ، صاحبِ خانہ جو تواضع کرے اس کو قبول کرو۔ بعض لوگ ملنے تو چلے جاتے ہیں مگر جب کھانے پینے کی کوئی چیز پیش کی جاتی ہے تو سختی سے انکار کر دیتے ہیں، یہ بہت بُری بات ہے اس میں غرور و تکبّر کی بو آتی ہے اور صاحبِ خانہ کی دل شکنی ہوتی ہے۔ ہاں کوئی

بیماری یا پیٹ میں کچھ خرابی ہو تو اور بات ہے، ایسی حالت میں میزبان کو بھی ہرگز اصرار نہیں کرنا چاہئے۔ جب تک بیٹھو ایسی گفتگو اور اس قسم کی باتیں کرو جن سے تمہارا بھی دل خوش ہو اور میزبان کا بھی۔ ایسی باتیں کبھی نہ کرو جن سے شکر رنجی اور آزردگی پیدا ہو۔ جب چلنے کا ارادہ ہو تو رخصت چاہو، اگر میزبان اور بیٹھنے پر اصرار کرے اور تمہیں فرصت ہو تو کچھ دیر اور بیٹھو ورنہ وجہ بتا کر معذرت کرو اور سلام کر کے رخصت ہو۔ اگر تم کسی سنجیدہ معاملے کی غرض سے آئے ہو تب بھی تمہاری گفتگو شریفانہ اور خوشگوار ہونی چاہئے، جس سے دلوں پر میل نہ آئے اور جُدا ہوتے وقت تم بھی خوش ہو اور میزبان بھی۔ کسی کے گھر اتنی زیادہ دیر ہرگز نہ بیٹھو کہ وہ اُکتا جائے، خیال رکھو کہ ہر شخص کو کچھ نہ کچھ کام ہوتا ہے تمہارے زیادہ دیر بیٹھنے سے اس کا کوئی حرج تو نہیں ہو رہا۔

جب کوئی تمہارے گھر آئے تو خندہ پیشانی سے اُس کا استقبال کرو، سلام کا جواب دے کر مصافحہ کرو۔ اب اگر سوئے اتفاق سے گھریلو حالات ملاقات کی اجازت نہیں دیتے تو بہ الفاظِ شائستہ مہمان سے معافی مانگو اور کہو کہ مجھے وقت دیجئے تا کہ میں خود آپ کے دولت کدے پر حاضر ہو کر اس تکلیف فرمائی کی تلافی کروں وغیرہ وغیرہ۔ لیکن اگر تم ملاقات کے لیے تیار ہو تو مہمان کو اندر بلاؤ اور اچھی جگہ پر بٹھاؤ اور اکل و شرب سے حسبِ توفیق اس کی تواضع کرو۔ لیکن اگر کوئی شخص کھانے پینے سے انکار کر دے تو زیادہ اصرار نہ کرو۔ مہمان جب تک بیٹھے اس کے پاس موجود رہو، کہیں جانا ہو تو معافی مانگ کر اور اجازت لے کر جاؤ۔ انتہائی شگفتہ مزاجی اور محبت بھرے انداز سے پیش آؤ، جب مہمان رخصت ہو تو کچھ دُور تک اس کو چھوڑنے جاؤ۔

بعض آنے والے ہدیہ لے کر آتے ہیں۔ ان کو شکریہ کے ساتھ بخوشی قبول کرنا چاہئے۔

ہدیے دینا اور قبول کرنا سرکارِ دوعالمؐ کی سنّت ہے، اس سے تعلقات گہرے اور محبت زیادہ ہوتی ہے۔ جب کوئی آئے تو اس کی تعظیم کے لیے کھڑے ہونے میں کوئی حرج نہیں ہے، لیکن جب بہت سے آدمی بیٹھے ہوں تو کسی آنے والے کی تعظیم کے لیے ضروری نہیں کہ سب ہی کھڑے ہو جائیں۔ رسول کریمؐ جب کسی مجلس میں تشریف لاتے تھے تو تعظیم کے لیے لوگوں کے کھڑے ہونے کو پسند نہیں فرماتے تھے۔ آج اُمراء، افسران اور حُکام کی تعظیم کے لیے اگر کوئی کھڑا نہ ہو تو وہ ناراض ہو جاتے ہیں اور دل میں کینہ رکھ لیتے ہیں۔ ان کو ذرا خیال کرنا چاہئے کہ نعوذ باللہ وہ رسول اللہؐ سے زیادہ عزّت والے تو نہیں ہیں۔

اب ہم میل ملاقات کے بارے میں چند اور باتیں بیان کرتے ہیں۔

لباس: جب دو آدمی ملتے ہیں تو سب سے پہلی چیز جو ایک دوسرے کے متعلق رائے قائم کرنے میں مدد دیتی ہے لباس ہے۔ اِس لیے جب کبھی گھر سے باہر جاؤ یا کسی سے ملو تو لباس سُتھرا، اُجلا اور تراش خراش میں مُروجّہ فیشن کے مطابق ہونا چاہئے، لیکن باوجود اس کے اگر کسی کا لباس اچھا نہ ہو تو اس پر نکتہ چینی کرنا یا مذاق اُڑانا شرافت کے خلاف ہے۔

گفتگو: لباس کے بعد دوسری چیز گفتگو ہے، جس سے ایک آدمی دوسرے کے متعلق رائے قائم کرتا ہے۔ یہ گفتگو ہی ہے جو انسان کو دوسروں کی نظر میں مقبول یا مردود بناتی ہے۔ گفتگو ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آدمی شریف ہے یا رذیل، بیوقوف ہے یا عقل مند، مہذّب ہے یا بدتمیز، معمولی تعلیم یافتہ ہے یا اَن پڑھ، عالم ہے یا جاہل۔ اِس لیے اگر تم چاہتے ہو کہ لوگ تم کو عزّت کی نظر سے دیکھیں تو گفتگو میں بہت احتیاط سے کام لو۔ گفتگو کرتے وقت نہ آواز اس قدر بلند ہو کہ سُننے والوں پر گراں گزرے اور یہ معلوم ہو کہ لڑ رہے ہو یا وعظ کر رہے ہو۔ نہ اس قدر دھیمی کہ سُننا اور سمجھنا بھی مشکل ہو جائے۔ لہجہ ہمیشہ نرم اور شیریں ہونا چاہئے،

بہت زیادہ بولنا یا کسی مجلس میں برابر بولتے رہنا بہت معیوب اور جہالت کی نشانی ہے، لیکن بالکل خاموش بیٹھے رہنا بھی اچھا نہیں۔ جب ضرورت ہو یا کوئی سوال کیا جائے تو ضرور بولو، لیکن جو بات کہو معقول اور ضرورت کے مطابق۔ فضول باتیں کرنے کو بکواس کہتے ہیں۔ بہت جلدی جلدی بولنا معیوب ہے، لیکن اس قدر ٹھہر ٹھہر کر بھی نہ بولو کہ لوگ منہ تکتے رہیں۔ ایسی باتیں ہرگز نہ کہو جس سے سننے والوں کو دُکھ ہو یا ان کی تذلیل ہوتی ہو۔ بذلہ سنجی اور لطیفہ گوئی بُری چیز نہیں، لیکن یہ بھی کبھی کبھی ہو تو اچھی ہوتی ہے، ہر وقت مذاق اور دل لگی چھچھورے لوگوں کا کام ہے۔ پھکڑ پن تو کسی وقت بھی جائز نہیں۔ لوگوں کا مذاق اڑانا یا ان کا نام رکھنا، طعنے مہنے دینا اور آوازے کسنا شرافت کے خلاف ہے، اس کو اللہ تعالیٰ نے بھی منع کیا ہے۔ زیادہ سنجیدگی بھی اچھی نہیں، باتیں کرتے وقت کبھی کبھی مسکرانا یا ہنسنا ضرور چاہیئے۔ چہرے پر خشونت اور رعونت ہرگز نہیں ہونی چاہیئے، یہ فرعونیت کی نشانی ہے۔ اکثر اُمراء، حُکام اور افسر جب اپنے ماتحتوں یا اہلِ معاملہ سے بات کرتے ہیں تو چہرہ اس قدر بھیانک ہوتا ہے کہ ڈر لگتا ہے۔ یہ لوگ اتنا نہیں جانتے کہ مخاطب اس وقت تو مرعوب ہو جاتا ہے لیکن پیٹھ پیچھے ان کا مذاق اڑاتا اور برائی سے یاد کرتا ہے۔ اگر اظہارِ ناراضگی ہی کرنا ہو تو سنجیدہ لہجہ ہی کافی ہو سکتا ہے۔ جو افسر یا امراء اپنے ماتحتوں سے گندہ ذہنی کے ساتھ پیش آتے ہیں وہ اپنی خاندانی اور ذاتی فرومائیگی کا ثبوت دیتے ہیں۔

گفتگو کئی قسم کی ہو سکتی ہے، تفریحی، علمی، ادبی، سیاسی، مذہبی، فلسفیانہ وغیرہ، مگر ہمیشہ موقع اور محل دیکھ کر کرنی چاہیئے۔ یعنی جیسا مخاطب یا جس قسم کے سامعین ہوں ان کے سامنے ویسی ہی گفتگو کی جائے، دور از کار اور فضول قسم کی بات چیت سے ہمیشہ بچنا چاہیئے۔ لوگوں سے ان کے نجی معاملات کے متعلق ہرگز سوالات نہیں کرنے چاہئیں، مثلاً ملتے ہی کسی

سے اس کی آمدنی، پیشے یا گھریلو معاملات کی بابت پوچھنا بہت معیوب بات ہے۔ ایسے سوالات بھی ہرگز نہ کرو کہ اگر ان کا صحیح جواب دیا جائے تو تم کو بُرا لگے۔ ایسی باتوں سے مجلس میں بدمزگی اور فساد پیدا ہوتا ہے اور کبھی اچھا نتیجہ نہیں نکلتا۔ ذرا ذرا سی بات پر اعتراض اور بحث کرنا، دوسروں کی بات کاٹنا یا جب کوئی بول رہا ہو تو بیچ میں بول پڑنا، بہت ہی بُری اور جہالت کی بات ہے۔ عورتوں میں یہ عادت خاص طور سے پائی جاتی ہے۔

ہمیں اپنے بچپن کا ایک واقعہ یاد آیا۔ ایک شادی کے موقع پر بہت سی خواتین جمع ہوئیں۔ دو سہیلیاں جو بہت عرصہ سے نہیں ملی تھیں، اس قدر گھک کر ملیں کہ سگی بہنیں بھی کیا ملیں گی۔ کئی گھنٹے تک نہایت ہی پیار و محبت کی باتیں ہوتی رہیں۔ کھانے کے بعد وہ ایک ہی پلنگ پر لیٹ گئیں اور پھر باتیں شروع ہوئیں۔ باتیں کرتے کرتے ایک نے کہا بہن بہت ہی دن بعد ملے، میری تو آنکھیں ترس گئی تھیں تمہیں دیکھنے کو۔ دوسری بولی ہاں بہن ''دو برس ہو گئے نعیمہ کی شادی میں ملے تھے''۔ ''ہاں پورے دو برس ہو گئے اس موقع پر تو اور بھی کئی لڑکیاں تھیں، اب کے ان میں کوئی نظر نہیں آتی'' ''اے ہاں! وہ کیسی اچھی لڑکی تھی جو ہمارے ساتھ سوئی تھی'' ''ہاں ہاں بہت ہی خوبصورت تھی بھلا سا نام تھا'' ''مجھے یاد ہے نجمہ نام تھا'' ''ہاں ہاں نجمہ، دھانی جوڑے میں کیسی پیاری لگتی تھی''۔ ''دھانی نہیں سُرخ جوڑا پہنے ہوئے تھی''۔ ''کوئی بھی نہیں دھانی جوڑا تھا''۔ ''اے واہ تمہیں یاد نہیں رہا''۔ ''اے لو میں تو ایک دفعہ دیکھ لوں پھر بھولتی ہی نہیں''۔ ''تم! تم تو ہمیشہ کی بھلکڑ ہو!''۔ ''اور تم! تمہارا تو دماغ ہی خراب ہے'' اس کے بعد جو اُن دونوں میں لڑائی اور تو تو میں میں ہوئی تو سارا گھر تماشا دیکھتا تھا۔ صرف جوت پیزار باقی رہ گئی تھی۔ اس کے بعد وہ دو دن تک مہمان رہیں، مگر آپس میں بات تک نہیں کی۔ یہ حال ہے خواتین کی جہالت کا، ذرا ذرا سی بات پر اس طرح لڑتی ہیں

کہ جائیداد کے بٹوارے پر بھی کوئی کیا لڑے گا۔ پھر عورتوں کا تو ذکر ہی کیا، مرد ہی کون سے بھلے ہوتے ہیں۔ کوئی مجلس ہو یا محفل، گھر ہو یا ہوٹل، ریل میں ہم سفر ہوں یا بس میں، ایک آدمی کے منہ سے بات نکلنے بھی نہیں پاتی کہ دوسرا اس پر اعتراض جڑ دیتا ہے۔ اس طرح ہر شخص اپنی لیاقتِ علمی اور طاقتِ لسانی کا سکّہ بٹھانا چاہتا ہے اور یہ کوئی نہیں جانتا کہ یہ اوّل درجہ کی جہالت کا ثبوت ہے۔ ایسی ہی فضول اور دُور از کار باتوں پر بعض اوقات مہلک لڑائیاں بھی ہو جاتی ہیں۔ پاکستان بننے کے بعد شاہ ایران کراچی تشریف لائے تھے، جب وہ واپس چلے گئے تو ایک دن ایک ریسٹوران میں دو آدمیوں میں اس طرح بحث شروع ہو گئی، ایک کہتا تھا جب ان کا جلوس نکلا تھا تو وہ تاج پہنے ہوئے تھے، دوسرا مُصِر تھا کہ ٹوپی پہن رکھی تھی۔ یہ معمولی سی بات اتنی بڑھی کہ ایک نے دوسرے کو چاقو مار دیا اور وہ مر گیا، مارنے والے کو ایک سال بعد پھانسی ہوئی۔ اب فرمایئے؟ اس سے زیادہ جہالت بھی آپ نے کبھی دیکھی ہے۔

دعوتیں: میل ملاقات کے سلسلہ میں دعوتوں کا ذکر بھی ضروری ہے۔ دعوتوں میں سادگی سے کام لینا چاہیئے۔ شریف مہمان یہ نہیں دیکھتے کہ میزبان کیا کھلاتا ہے، وہ یہ دیکھتے ہیں کہ کس خلوص سے کھلاتا ہے۔ دعوتوں میں وقت سے صرف دس پانچ منٹ پہلے ہی جانا اور کھانے کے بعد جلد ہی واپس آجانا چاہیئے۔ بہت پہلے سے جا بیٹھنا اور بعد میں بہت دیر تک بیٹھے رہنا بُرا ہے۔ اس سے میزبان کو بہت تکلیف ہوتی ہے، گو وہ زبان سے کچھ نہ کہے۔ دعوتوں میں پرانے احباب سے ملنے اور نئے دوست پیدا کرنے کا بڑا اچھا موقع ملتا ہے اس سے فائدہ اٹھانا چاہیئے۔

کھانے کے آداب: کھانا ہمیشہ صاف ستھری جگہ پر کھانا چاہیئے۔ بہتر ہے کہ کھانا تم

سے کسی قدر اونچی جگہ پر ہو۔ نیچے فرش پر بیٹھ کر کھاؤ یا میز کرسی پر، صفائی کا خیال ہر حالت میں ضروری ہے۔ دستر خوان ہمیشہ صاف اور اُجلا ہونا چاہئے۔ کھانا الگ الگ رکابیوں میں نکالنے سے زیادہ بہتر یہ ہے کہ ہر قسم کا کھانا بڑی بڑی قابوں اور ڈونگوں میں بھر کر دستر خوان پر رکھ دیا جائے۔ ہر شخص کے سامنے خالی رکابیاں، طشتریاں اور پیالے وغیرہ ہوں، جن میں وہ بڑے چمچوں سے ضرورت کے مطابق نکال کر کھائے۔ کھانا ہاتھ سے کھاؤ یا چمچوں سے یہ اپنی اپنی مرضی ہے۔ کھاتے وقت زانو پر رومال وغیرہ ڈال لینا چاہئے تاکہ کپڑے خراب نہ ہوں۔

کھانے سے پہلے ہاتھ ضرور دھولو اور کلّی بھی کرلو تاکہ منہ صاف ہو جائے اور کھانے کا پورا مزہ آئے۔ خوب کھل کر بیٹھو، شروع کرتے وقت بسم اللہ پڑھو، کھانا آہستہ آہستہ خوب چبا کر کھاؤ، جلدی جلدی ہرگز نہ کھاؤ۔ اگر کھانے کا پورا مزہ لینا ہو تو چباتے وقت ذائقے کا خیال کرو، اگر تم باتیں کرتے یا بے خیالی میں کھاتے رہو گے تو کھانے کا ذائقہ پوری طرح ہرگز محسوس نہ ہوگا۔ لقمہ اس طرح چباؤ کہ چپڑ چپڑ کی آواز نہ نکلے، یہ بہت بدتمیزی کی بات ہے۔ لقمہ بہت بڑا نہ ہو، کھاتے میں منہ اس قدر نہ کھلنے پائے کہ لوگوں کو منہ کے اندر کھانا نظر آئے۔ شوربہ وغیرہ میں نوالہ اس طرح تَر کرو کہ سارا ہاتھ لت پَت نہ ہو جائے۔ جب کھا چکو تو الحمدللہ کہو، لمبی لمبی ڈکاریں لینا اور پیٹ پر ہاتھ پھیرنا بہت بری عادتیں ہیں۔ کھانے کے بعد ہاتھ خوب صاف کر کے دھوؤ اور منہ بھی خوب صاف کرو، مگر اس طرح کھکارنا، کھانسنا اور حلق صاف کرنا کہ دوسرے لوگ سنیں، خلافِ تہذیب ہے۔ پانی وغیرہ جلدی جلدی نہیں پینا چاہئے بلکہ دو تین مرتبہ بیچ میں ٹھہرنا چاہئے۔ پیتے میں اس بات کی بہت احتیاط رکھو کہ غٹ غٹ کی آواز سنائی نہ دے۔ بعض آدمی چائے اور پانی وغیرہ اس طرح پیتے ہیں کہ معلوم

ہوتا ہے کہ ان کے گلے میں کبوتر غٹرغوں غٹرغوں کررہا ہے۔ دعوت کھانے کے بعد میزبان سے اجازت لو، کھانے کی تعریف کرو اور شکریہ ادا کرکے رخصت ہو۔ کھانے کی بُرائی کرنا کہ نمک کم تھا، مرچیں زیادہ تھیں، شوربہ پتلا تھا یا چاول کھڑے رہ گئے تھے نہایت ہی ذلیل عادت ہے۔

گھروں میں کھانا کھاتے وقت بھی انہی آداب کا خیال رکھنا چاہئے۔ مناسب اور باعثِ برکت تو یہ ہے کہ گھر پر سب لوگ اکٹھے کھانا کھائیں لیکن الگ الگ کھائیں تو بھی کوئی بُری بات نہیں ہے۔

آدابِ نشست و برخاست: قوموں کی تہذیب و تنظیم اور بدتہذیبی و بدنظمی کا جیسا مظاہرہ بڑی بڑی محافل ومجالس میں ہوتا ہے اور کہیں نہیں ہوتا۔ اِس لیے جب کسی محفل، مجلس یا بڑے جلسے میں جاؤ تو ان آداب پر پوری طرح عمل کرو تا کہ اغیار کی نظر میں تمہاری قوم و مِلّت کی سُبکی نہ ہو۔ مجلس میں داخل ہوتے ہی جو لوگ نزدیک ہوں ان کو آہستہ سے سلام کرو، اپنے منصب و مرتبے کے لحاظ سے مناسب جگہ پر بیٹھ جاؤ۔ پہلے آنے والے آگے اور بعد میں آنے والے پیچھے قطار در قطار ترتیب وار بیٹھتے جائیں۔ بعد میں آنا اور بیٹھے ہوئے لوگوں کے کندھوں اور سروں پر سے کود کود کر آگے جانا انتہائی بدتہذیبی ہے۔ اگر جلسہ بڑا ہو اور جلسہ گاہ میں جانے کے راستے مقرّر ہوں تو قطار بنا کر اندر جانا اور نمبر وار اپنی جگہ بیٹھنا چاہئے۔ جلسے کے اختتام پر واپس بھی اس طرح قطار اندر قطار ہونا چاہئے، اس سے تمہارے قومی وقار اور تہذیب و تنظیم کا ثبوت ملتا ہے۔ جو لوگ بھیڑ بکریوں کی طرح بے ترتیب بھاگتے دوڑتے اور چیختے چلاتے جلسہ گاہوں میں آجاتے ہیں، وہ اپنی قوم کو بدنام کرتے اور دوسرے لوگوں کو ہنسنے کا موقع دیتے ہیں۔ عید گاہوں اور جامع مسجدوں میں آتے جاتے وقت بھی یہی

طریقہ اختیار کرنا چاہئے۔ جن لوگوں کو ان باتوں کا شعور اور احساس ہے ان پر فرض ہو جاتا ہے کہ ایسے مواقع پر تھوڑی سے تکلیف اٹھا کر عوام کو ان طریقوں پر چلانے کا عملی بندوبست کریں۔ مجلسوں میں کھل کر بیٹھو اور اس بات کی احتیاط رکھو کہ تمہاری کہنی، گھٹنا، چھتری یا چھڑی پاس بیٹھے ہوئے لوگوں کے نہ چبھے۔ ایسے موقعوں پر آپس میں کانا پُھوسی کرنا، دوسروں کی طرف اشارے کرنا یا کسی پر اعتراضات کرنا اور ہنسنا شرافت سے بہت ہی بعید ہے۔ اگر کوئی صاحب تقریر کریں یا کچھ پڑھ کر سنائیں تو غور سے سنو اور اگر کوئی بات تمہاری مرضی یا تمہارے نظریات کے خلاف ہو تو صبر کرو۔ اگر کوئی اعتراض کرنا یا کسی بات کی تشریح کرانا ضروری ہی ہو تو تقریر ختم ہونے کے بعد صاحبِ صدر کی اجازت سے مناسب الفاظ اور شائستہ لہجے میں ٹھنڈے دل سے سوالات کرو۔ غل مچانا، لڑائی پر آمادہ ہو جانا یا آوازیں کسنا شریفوں کا شیوہ نہیں۔ ایسا ہی بحث و مناظرہ کا شوق ہو تو اس کے لیے خاص مجالس منعقد کر کے دل کے ارمان نکالے جا سکتے ہیں۔ عام جلسوں میں بحث و مباحثہ باعثِ شرو فساد ہوتا ہے، اس سے بچنا چاہئے۔

چلنے پھرنے کے آداب: چال سے بھی انسانی کردار کا بہت کچھ حال معلوم ہوتا ہے۔ چال میں تصنّع ہرگز نہیں ہونا چاہئے نہ غرور و تمکنت۔ گردن اکڑا کر اور سینہ تان کر چلنا منع ہے۔ اللہ کی زمین پر اکڑ کر نہ چلو تم اس کو پھاڑ نہ سکو گے، نہ عاجزی اور فروتنی سے اس طرح چلو کہ کندھے ڈھیلے، گردن ڈھلکی ہوئی اور منہ لٹکا ہوا ہو۔ نہ اس قدر تیز اور بدحواس ہو کر چلو گویا کوئی تمہارے تعاقب میں ہے اور تم ڈر کر بھاگ رہے ہو۔ نہ اس قدر سست رَو بنو کہ بیمار معلوم ہو، میانہ روی سب سے بہتر ہے۔ فوجی سپاہیوں کی چال بہت اچھی ہوتی ہے، نہ اس میں غرور و تکبّر ہوتا ہے نہ سُستی اور کاہلی۔ چلتے میں نہ تو اُچکّوں کی طرح تیز تیز نظروں سے

اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے چلو نہ نظر اس قدر نیچی ہو کہ سامنے سے آنے والوں کے ساتھ ٹکرا جاؤ۔

چلنے میں چہرے پر بشاشت اور تازگی ہونی چاہیے۔ حضرت عمرؓ نے ایک آدمی کو دیکھا کہ کندھے لٹکے ہوئے، گردن ڈھلکی ہوئی، چہرے پر ملال کے آثار، آہستہ آہستہ چلا آرہا ہے۔ آپؓ نے اس کو ٹوکا اور فرمایا مسلمان کو ہرگز اس طرح نہیں چلنا چاہیے کہ مجسمۂ حُزن و ملال معلوم ہو، بشاش ہوکر چلا کرو۔ بازاروں اور شاہراہوں پر اس طرح نہ چلو کہ کسی اور کو دھکا لگے۔ اگر بھیڑ کی وجہ سے راستہ نہ ہو تو صبر کرو، آہستہ چلو یا ٹھہر جاؤ کہ راستہ صاف ہو جائے۔ دوسروں کو دھکّے دے کر آگے نکلنا بڑی بدتمیزی ہے، یہاں تک احتیاط کرنا چاہیے کہ دھکا تو درکنار تمہارا جسم بھی کسی دوسرے کو چُھونے نہ پائے۔ چلتے چلتے اس طرح رُک کر ہرگز نہ کھڑے ہو کہ راستہ رُک جائے۔ راستہ میں چیخنا اور غل مچانا بُرا ہے، اگر کوئی شخص آگے جارہا ہو تو پیچھے سے چیخ کر اُس کو آواز نہ دو۔ بعض آدمی چلتے چلتے راستے ہی میں کھڑے ہوکر باتیں کرنے لگتے ہیں، یہ بہت ہی بُری عادت ہے، بات ہی کرنا ہو تو راستہ سے ایک طرف ہٹ کر کرو اور جب دو آدمی اس طرح باتیں کررہے ہوں تو ان کی اجازت کے بغیر ہرگز ہرگز اُن کے پاس کھڑے نہ ہو اور ان کی باتیں سننے کی ہرگز کوشش نہ کرو۔

بسوں میں سوار ہونے اور ریل وغیرہ کے ٹکٹ خریدنے کے لیے ہمیشہ قطار میں کھڑے ہو اور نمبر آنے پر سوار ہو یا ٹکٹ خریدو۔ دوسروں کو دھکّے دے کر آگے نکلنا اُن کا حق مارنا ہے، مہذّب لوگ ایسا نہیں کرتے۔ مسافروں میں عورتیں، بچے اور بوڑھے بھی ہوتے ہیں، سب سے پہلے عورتوں اور بچوں اور پھر بوڑھوں کا حق ہے، ان کو ہر طرح کی سہولت بہم پہنچاؤ۔ بسوں اور ریلوں میں بیٹھتے وقت بھی نمبر کا خیال رکھو، بیٹھ جانے کے بعد بھی اس بات کی

احتیاط رکھو، کہ تمہاری کہنی، ہاتھ یا پاؤں سے کسی دوسرے کو تکلیف تو نہیں ہو رہی۔ بعض آدمی اپنی سیٹ پر بیٹھے بیٹھے اگلی سیٹ کے تکیے پر ہاتھ رکھ دیتے ہیں جو دوسروں کے چبھتا ہے اور وہ شریف آدمی خاموش بیٹھا تکلیف اٹھاتا رہتا ہے، منہ سے کچھ نہیں کہتا۔ وہ جانتا ہے کہ جس احمق کو بیٹھنے کی بھی تمیز نہیں اس سے اگر کچھ کہا تو لڑائی ہوگی۔ بسوں اور ریلوں میں بحث مباحثہ کرنا اچھا نہیں، اس سے اکثر بدمزگی پیدا ہو جاتی ہے۔ اکثر آدمی سارے راستے لیکچر دیتے یا بزُعمِ خود وعظ فرماتے رہتے ہیں، تالو سے زبان ہی نہیں لگتی۔ یہ لوگ اپنی لیاقت جتاتے ہیں مگر اتنا نہیں سمجھتے کہ بہت سے ہم سفروں کو انکی آواز بُری لگ رہی ہے یا کسی کی نیند میں خلل آرہا ہے، یہ سب جہالت کی باتیں ہیں۔ مناسب طور پر بولنے اور ایسی باتیں کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں جن سے دوسروں کا دل خوش ہو اور راستہ لطف سے کٹے۔ ریلوں کے اندر اور اسٹیشنوں پر اگر کوئی ہم سفر کھانے پینے کی کوئی چیز دے تو فوراً نہ کھالو بلکہ خوب احتیاط سے جانچ کر لو کہ دینے والا شریف آدمی ہے یا نہیں، کیوں کہ اکثر بدمعاش کھانے میں زہر یا بے ہوشی کی دوائیں ملا کر لوٹ لیتے ہیں۔ ہر شریف انسان کا فرض ہے کہ زنانہ درجہ برابر میں ہو تو رات کے وقت اس کا خیال رکھے کیونکہ اکثر چور ڈاکو زنانہ درجے میں گھس کر عورتوں کو لوٹ لیتے ہیں۔

خرید و فروخت:

سودا خریدنا بھی ایک فن ہے۔ جو لوگ اس فن کو جانتے ہیں اُن کے گھر میں بڑی برکت ہوتی ہے۔ اپنے گھر کا سودا خود خریدنا کوئی عیب نہیں ہے، تمام صحابۂ کبار بلکہ سرورِ عالمؐ اپنے گھر کا سودا خود خریدتے تھے۔ سودا خریدتے رہنے سے بُری بھلی چیز کی پہچان ہو جاتی ہے اور بُری چیز گھر میں نہیں آنے پاتی۔ سودا کئی دکانوں پر دیکھ کر اور ہر جگہ سے قیمت پوچھ لینے

کے بعد خریدنا چاہئے۔ تجربہ کے بعد کسی ایک دکاندار پر اعتبار ہو جائے تو مستقلاً اسی سے خریدتے رہنے میں کوئی حرج نہیں بلکہ یہ کچھ اچھا ہی ہے۔ نوکر بہت بے پروائی سے سودا خریدتے ہیں اور اکثر بددیانتی بھی کرتے ہیں۔ جہاں تک ممکن ہو کوئی چیز قرض نہ لی جائے، اس میں دام بھی زیادہ جاتے ہیں چیز بھی اچھی اور پوری نہیں ملتی۔ جب کسی دکان پر جاؤ تو جو خریدار پہلے سے کھڑے ہوں، ان کی حق تلفی نہ کرو، پہلے انہیں خریدنے دو، بھیڑ زیادہ ہو تو قطار بناؤ، دکاندار کے ساتھ سختی سے پیش نہ آؤ، سودا نہ بنے تو آہستہ سے چل دو اور کوئی اور دکان دیکھو۔

دکاندار کو چاہئے کہ گاہکوں کے ساتھ انتہائی خوش اخلاقی اور عزّت سے پیش آئے اور خوب سمجھ لے کہ اللہ تعالیٰ نے انہی کو اس کی روزی کا وسیلہ بنایا ہے، اگر وہ دو باتیں سخت بھی کہہ دیں تو نرمی سے جواب دے۔ مسلمان دکاندار اپنی بداخلاقی کی وجہ سے بہت ہی بدنام ہیں، یہ قوم کے دامن پر بھی کلنک کا دھبہ ہے، اگر کوئی گاہک ان کی بتائی ہوئی قیمت سے کم دام لگاتا ہے تو چراغ پا ہو جاتے ہیں اور کہتے ہیں جاؤ جاؤ جیب میں دمڑے بھی ہیں وغیرہ وغیرہ۔ ایک زمانے میں دہلی کے مسلمان جوتے والے اپنی بدتمیزی کے لیے بہت مشہور تھے، چنانچہ ہمارا چشم دید واقعہ ہے کہ ایک نہایت معزز اور سن رسیدہ صاحب ایک دُکان پر تشریف لائے۔ دو چار جوڑے دیکھنے کے بعد ایک جوڑے کی قیمت پوچھی، دُکاندار نے کہا پچیس روپیہ۔ وہ خاموش ہو گئے اور چلنے کا ارادہ کیا، دُکاندار نے کہا آپ بھی تو فرمائیں کیا دیں گے۔ خریدار نے جواب دیا، میری رائے میں تو پندرہ روپیہ کا ہے۔ اس پر نامعقول دکاندار نے دوسری طرف منہ پھیر کر کہا، لیجئے میں نے منہ پھیر لیا ہے آپ ویسے ہی اٹھا کر لے جایئے۔ وہ بے چارے کوئی پردیسی تھے، اس قدر خفیف ہوئے کہ مڑ کر بھی نہ دیکھا اور

چلے گئے۔ بھلا وہ یا ان کا کوئی دوست اس دکان پر پھر کبھی کیوں آیا ہوگا۔ ایسے بدتمیز دُکاندار اپنی تجارت کو سخت نقصان پہنچاتے ہیں، گو محسوس نہیں ہوتا۔ دہلی کے جوتے والوں کی اس بدتمیزی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے مقابل ہندو جوتے والوں کی کئی دکانیں کھل گئیں اور دیکھتے دیکھتے ان کا کاروبار چمک گیا اور پرانے مسلمان جوتے والوں کا کام ٹھپ ہو گیا۔ مسلمان دکانداروں کی ایسی بیہودگیاں ہر روز ہر جگہ دیکھنے میں آتی ہیں، کہاں تک بیان کیا جائے۔

کسبِ معاش:

کسبِ معاش کے عام بڑے ذرائع چار ہیں، زراعت، تجارت، صنعت و حرفت اور ملازمت، ان میں سے ہر ایک کا مختصر بیان الگ الگ سنئے۔

زراعت: انسانی معاش کا سارا انحصار زمین کی پیدوار پر ہے، اِس لیے جہاں تک کسبِ معاش کا تعلق ہے زرعی زمینوں کی نگہداشت کرنا، بنجر زمینوں کو توڑ کر زرعی بنانا انسان کا اولین فرض ہے۔ کاشتکاری سب سے معزز اور اہم پیشہ ہے۔ کسانوں اور کاشتکاروں کو موٹے جھوٹے اور پھٹے پُرانے کپڑوں میں دیکھ کر حقیر نہیں سمجھنا چاہیے، وہ تمہارے واسطے غذا حاصل کرنے کے لیے خود تکلیفیں اٹھا کر تمہیں بھوکا مرنے سے بچاتے ہیں۔ زمینوں کی کاشت کے لیے ابھی تک تقریباً ساری دُنیا میں زمینداری کا طریقہ جاری تھا اور اکثر ملکوں میں اب تک رائج ہے، یعنی ہزاروں ایکڑ زمین کسی ایک شخص کی ملکیت ہوتی ہے جس سے وہ چھوٹے چھوٹے ٹکڑے غریب کسانوں کو کاشت کے لیے دے کر خود بغیر محنت کیے ان سے معقول لگان وصول کرتا ہے اور حکومت کو نام نہاد مال گزاری دیتا رہتا ہے۔ یہ طریقہ مُلک کی زرعی ترقی اور خوش حالی کے لیے بہت مُضرت رساں ثابت ہوا ہے، کیونکہ اس طرح ملکی دولت کا بڑا حصّہ صرف چند آدمیوں کے قبضہ میں چلا جاتا ہے اور آبادی کی کثیر

تعداد مفلوک الحال ہو جاتی ہے۔ اِس لیے کئی ملکوں نے طریقۂ زمینداری کو ختم کر کے تمام زمین کو قومی ملکیت قرار دے دیا ہے اور کاشتکار محض مزدور کی حیثیت سے کام کرتے ہیں۔ دوسرے ممالک میں بھی اس طریقہ کو رائج کرنے کا رجحان پایا جاتا ہے۔ ہماری رائے میں یہ طریقہ بھی کامیاب نہیں رہے گا۔ اس میں دو نقص ہیں، ایک تو حکومت کے عمال جن کا واسطہ کاشتکاروں سے پڑتا ہے عام طور پر متدیّن نہیں ہوتے، وہ کاشتکاروں پر زمینداروں سے بھی زیادہ ظلم ڈھاتے ہیں۔ دوسرے کاشتکار یہ سمجھ کر کہ میں صرف مزدور ہوں، زمین کی نگہداشت اور زراعت کی ترقی میں خاطر خواہ دلچسپی نہیں لیتا۔ اس لیے سب سے اچھا طریقہ یہ ہوسکتا ہے کہ جو لوگ زمین خود کاشت کریں، ان کو ان کے کنبے کے افراد کی تعداد کے لحاظ سے زمین کسی لمبی مدت کے لیے ٹھیکے پر یا بطور ملکیت دوام دے دی جائے، لیکن شرط یہ رکھی جائے کہ اگر کسی وقت کنُبہ کے افراد کی تعداد کافی کم یا زیادہ ہوگئی تو اسی نسبت سے زمین کی مقدار بھی کم یا زیادہ کردی جائے گی۔ کاشتکار کو اس کام میں سہولت اور مدد بہم پہچانا حکومت کا فرض ہے محکمۂ زراعت اور محکمۂ انہار کا فرض ہے کہ وہ ہر کاشتکار کو نئے قسم کے ہل، ٹریکٹر، سائنٹیفک کھاد، کیڑوں کو مارنے والی دوائیں، عمدہ قسم کے بیج بہم پہنچائیں اور آبپاشی کا آسان اور کافی بندوبست کریں۔ اس بات کا بھی بندوبست ہونا چاہیے کہ کاشتکار غلّہ اور جنس اٹھانے کے بعد مہنگا بیچنے کے خیال سے ایک غیر مناسب عرصہ تک ذخیروں میں چھُپا کر نہ رکھنے پائیں۔

تجارت: تجارت کسبِ معاش کا بہت ہی معزز اور منفعت بخش ذریعہ ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ جس قوم نے تجارت میں ترقی کی وہ آخر کار تختِ حکومت پر بھی قابض ہوگئی۔ رسول اکرمؐ نے فرمایا ہے کہ دس حصوں میں سے نو حصّہ رزق تجارت میں ہے، اِس لیے تم

تجارت ضرور کرو۔ تجارت میں سفر لازمی ہے اور سفر ہی سے انسان کو عقل، تجربہ اور دنیا کے حالات کا علم حاصل ہوتا ہے۔ تجارت ہی کی وجہ سے طرح طرح کی آرام دہ اور تیز رفتار سواریاں ایجاد ہوئیں۔ مسلمان جب تک تجارت پر قابض رہے دُنیا پر ان کا سیاسی اقتدار بھی قائم رہا۔ جب تجارت غیروں کے ہاتھ میں گئی، سیاسی اقتدار و طاقت بلکہ حکومت کا بھی خاتمہ ہوگیا۔ ہندوؤں نے ہمارے دیکھتے دیکھتے پچاس برس میں وہ ترقی تجارت میں کی کہ انگریزوں کو ہندوستان سے نکال باہر کیا۔ مسلمان اگر چاہتے ہیں کہ پھر ترقی کریں تو تجارت کے میدان پر قبضہ کیے بغیر چارہ نہیں۔ تجارت میں کامیابی کے لیے عقل، سمجھ بوجھ، دیانت داری اور سخت محنت کی ضرورت ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی ضروری ہے کہ ہمارے تاجر اپنی اور دوسرے ملکوں کی منڈیوں کی ضروریات اور دیگر حالات سے پوری طرح باخبر رہیں۔ معاملہ کی صداقت اور خوش اخلاقی کا معیار اتنا بلند ہونا چاہئے کہ جو آدمی ایک مرتبہ تم سے اپنا معاملہ طے کرلے پھر کہیں اور نہ جانے پائے۔ تجارت میں بے ایمانی اور دغا بازی کرنے والے اپنی قوم اور مُلک کے دشمن ہیں۔ تجارت تو ساکھ پر چلتی ہے اور ساکھ محض معاملات کی صداقت سے حاصل ہوسکتی ہے۔ مسلمان جو تین سو برس پہلے دُنیا کے بہترین تاجر تھے اب تجارت کے میدان میں طفلِ مکتب ہیں۔ ان کا اُصول یہ ہے کہ ایک ہی خریدار سے اتنا نفع لے لو کہ دن بھر کے لیے کھانے کو مل جائے، یہ اصول غلط ہے۔ تجارت میں کامیابی کا اُصول یہ ہے کہ نفع کم لو، مال اچھا دو تا کہ خریداروں کا حلقہ وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا جائے۔ چور بازاری کرنے والے مُلک اور قوم کو تباہ کرتے ہیں، مگر اس میں ان کا اتنا قصور نہیں جتنا اُن حکومتوں کا ہے جو ان تباہ کاروں کو سخت اور عبرت انگیز سزائیں نہیں دیتیں۔

صنعت و حرفت: یہ کسبِ معاش کا تیسرا ذریعہ ہے اور جہاں تک کسبِ زر کا تعلق ہے

کوئی بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ صنعت و حرفت کیا ہے؟ خام اشیاء کو کار آمد شکل میں تبدیل کر کے ان کی تجارت کرنا، مثلاً کپاس سے کپڑا، دھاتوں سے برتن، زیور، آلات اور ہتھیار اور مشینیں وغیرہ تیار کرنا۔ اس طرح بعض چیزوں پر ایک روپیہ خرچ کر کے ایک ایک ہزار تک کا فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ یورپ و امریکہ میں موجودہ ترقی کی اصل وجہ ہی صنعت و حرفت ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ ایشیائی ممالک سے کروڑوں روپیہ کا سامان مثلاً کپڑا، قالین، شالیں، طلائی اور نقرئی زیور، ظروف اور شیشہ اور چینی کے برتن یورپ میں لے جا کر بیچے جاتے تھے اور وہاں سے ان کے بدلے سونا اور چاندی ایشیا میں آتا تھا۔ لیکن جب سے یورپ میں مشینیں ایجاد ہوئیں اور یہی چیزیں وہاں زیادہ صفائی کے ساتھ زیادہ مقدار اور کم قیمت میں تیار ہونے لگیں، تجارت کا رخ پلٹ گیا۔ غریب یورپ دولت مند اور امیر ایشیا مفلوک الحال ہو گیا۔ اسی کی وجہ سے طرح طرح کی ایجادیں ہوئیں اور ساری دُنیا میں نہ صرف مشینی و اقتصادی بلکہ معاشرتی اور اخلاقی انقلاب برپا ہو گیا۔ صنعتی ترقی سے یورپ کو جہاں بہت سے فائدے ہوئے وہاں یہ نقصان بھی ہوا کہ مُلک میں روپیہ کی تقسیم کا جو معیار مدّت سے چلا آ رہا تھا اور جس میں زمیندار پہلے ہی غریب مزارعین کا خون چوس چوس کر موٹے ہو رہے تھے، وہ اور بھی غیر متناسب ہو گیا۔ اس طرح سرمایہ داروں اور مزدوروں کے طبقات خاص طور پر نمایاں ہوئے۔ مارکسزم کے فلسفہ نے زور پکڑا اور مذہب اشتراکیت وجود میں آیا۔ یہ مذہب خدا اور الہام کا منکر ہے۔ اس کا صرف یہی ایک اُصول ہے کہ دُنیا کا ہر آدمی پیدائشاً اس بات کا مستحق ہے کہ اسے کھانے اور پہننے کو روٹی کپڑا اور رہنے کو مکان اور جنسی پیاس بجھانے کو عورت ملے۔ یہ اُصول اس قدر سچا، سادہ اور دلفریب ہے کہ کوئی متنفّس بھی اس کی اہمیت اور حقانیت سے انکار نہیں کر سکتا، مگر اس اُصول کو عملی طور پر بروئے

کارلانے کے لیے قانون یہ ہے کہ مُلک کی ساری زمین اور ہر قسم کی خام اور صنعتی پیداوار قوم یا بالفاظ صحیح گورنمنٹ کی ملکیت ہو اور آمدنی کو تمام باشندوں پر ان کے کاموں کے مطابق مناسب اور متناسب طور پر تقسیم کر دیا جائے۔ ظاہر ہے کہ اس مذہب کی بُنیاد صرف مادّی اشیاء پر ہے اور جہاں تک اخلاقیات کا تعلق ہے اس مذہب کے پاس کوئی سرمایہ اپنا ذاتی نہیں۔ مُلک میں امن و امان قائم رکھنے کے لیے جتنے بھی اخلاقی تعیّنات ہیں وہ سب دوسرے الہامی مذاہب سے مستعار لیے گئے ہیں اور ان کو منوانے کے لیے حکومت کے ہاتھ میں صرف ڈنڈے کی طاقت ہے جس کا مشاہدہ اشتراکی ممالک میں ہر ہر منٹ پر ہوتا رہتا ہے۔ ان ممالک میں تمام آبادی اشتراکی نہیں ہے، صرف اشتراکی پارٹیاں ہیں جو برسرِ حکومت ہیں اور وہ مجبور ہیں کہ اپنی ہستی کو برقرار رکھنے کے لیے ڈنڈا استعمال کرتی رہیں۔

چونکہ اس مذہب کے پاس اپنا کوئی اخلاقی سرمایہ نہیں، اِس لیے جب تک ان پارٹیوں کے ڈنڈے میں طاقت ہے یہ مذہب قائم رہے گا۔ جس دن یہ طاقت ختم ہوئی یہ مذہب بھی ختم ہو جائے گا۔ مطلب یہ ہے کہ اس مذہب کے قواعد و قوانین پر ایک ’’اشتراکی‘‘ صرف فوج، پولیس اور جاسوسوں کے خوف سے عمل کرتا ہے۔ برخلاف ازیں الہامی مذاہب میں ہر شخص کو ایک ایسی ذات کا تھوڑا بہت یقین ضرور ہوتا ہے جو اگرچہ دکھائی نہیں دیتی لیکن ہر جگہ حاضر و ناظر ہے اور جو انسان کو اس کی تمام بُرائیوں اور بھلائیوں کی جزا و سزا دیتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان مذاہب کے ماننے والے ایسے مواقع پر بھی اکثر و بیشتر جرم و گناہ کے ارتکاب سے مجتنب رہ سکتے ہیں جہاں پولیس یا سول کا کوئی آدمی بھی موجود نہیں ہوتا۔ مذہب اشتراکیت میں کوئی ایسا بُنیادی اور اُصولی عقیدہ موجود نہیں ہے جو انسان کو ان مواقع پر بھی جرم اور گناہ سے بچا سکے۔ یہ اس مذہب میں بڑی خامی اور کمزوری ہے اور یہ کسی طرح بھی

قیامِ امن اور ترقّیٔ تمدّن میں دوسرے مذاہب کا مقابلہ زیادہ عرصہ تک نہیں کر سکے گا۔

اب سوال یہ ہے کہ پھر یہ مذہب اس قدر تیزی سے کیوں پھیل رہا ہے؟ اس کی تین وجوہات ہیں، اول یہ کہ اس مذہب کا واحد اُصول اس قدر سادہ، سچا اور دلفریب ہے کہ عوام کو سمجھانے کے لیے کسی علمی یا فلسفی دلیل کی ضرورت ہی نہیں۔ روٹی، کپڑے، مکان اور عورت کی ہر شخص کو ضرورت ہے اور وہ ان الفاظ سے مسحور ہو کر اس طرف راغب ہو جاتا ہے۔

دوسرے یہ کہ اس اُصول کی تبلیغ کے لیے چونکہ کسی خاص علمی قابلیت کی ضرورت نہیں، ہر معمولی پڑھا لکھا آدمی جو لیڈر بننا اور پیسے کمانا چاہتا ہے، جاہل اور بے پڑھے لکھے مزدوروں اور غریب عوام میں آسانی سے اس کی تبلیغ کر سکتا ہے۔

تیسرے یہ کہ اس مذہب کی تبلیغ کے لیے صاحبِ رسوخ اور پڑھے لکھے لوگوں کو اشتراکی خزانوں سے خفیہ طور پر بیش قرار وظیفے ملتے ہیں۔ روٹی، کپڑے، مکان اور عورت کا بندوبست اور یہ ضمانت کہ یہ چیزیں ہر شخص کو میسر آ سکیں، کون سے مذہب میں نہیں ہے لیکن مصیبت اور دقّت صرف یہ ہے کہ ان مذاہب کو ماننے والے اپنے مذہبی اُصولوں پر عمل ہی نہیں کرتے۔ مذہبِ اسلام الہامی مذاہب میں سب سے آخری اور مکمّل ترین مذہب ہے۔ اس میں دولت کی تقسیم کے جو اُصول اور طریقے مقرّر ہیں مثلاً سود نہ لینا، زکوٰۃ نکالنا، خیرات دینا، غریب پڑوسیوں کی مدد کرنا اور ضرورت مندوں کی مدد کے لیے بیت المال قائم کرنا وغیرہ۔ اگر مسلمان اُن اُصولوں پر کاربند ہو جائیں تو اشتراکیت اس لحاظ سے مذہبِ اسلام کے پاسنگ بھی تو نہیں ہے، لیکن باوجود ان تمام باتوں کے اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ موجودہ زمانہ میں صنعتی ترقی کی وجہ سے سرمایہ دار اور مزدور کے درمیان تقسیمِ زر کا جو غیر متوازن معیار پیدا ہو گیا ہے، اس کو کسی طرح بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ امریکہ

اور برطانیہ نے اپنے مُلک کو کمیونزم سے محفوظ رکھنے کے لیے مزدوروں کو بہت کافی مراعات دی ہیں اور وہ بہت کچھ مفید ثابت ہوئی ہیں۔ اسلامی مُلک اگر اس الحادی تحریک سے بچنا چاہتے ہیں تو سمجھ دار مسلمانوں اور اسلامی حکومتوں کو بھی جلد از جلد اپنے مذہبی اُصولوں پر عمل شروع کرنے کے ساتھ ساتھ ایسے قانون بھی نافذ کر دینے چاہئیں کہ سرمایہ داروں اور مزدوروں و ملازمین کے درمیان منافع کی تقسیم مناسب اور متناسب ہو جائے اور فیکٹریوں اور فرموں کے مالک اپنے ملازموں اور مزدوروں سے عزّت اور انسانیت کا برتاؤ کرنے پر مجبور ہو جائیں۔ یاد رکھئے سرمایہ دار چند ہوتے ہیں لیکن مزدور اور ملازمین ملّت کا سوادِ اعظم ہیں۔ جس قوم کی اکثریت مطمئن اور خوش حال نہ ہوگی وہ قوم صحیح معنوں میں ہرگز ترقی نہیں کر سکتی۔

ملازمت: کسبِ معاش کا چوتھا طریقہ ملازمت ہے۔ یہاں ہماری مراد شاگرد پیشہ ملازمین سے نہیں بلکہ بڑی بڑی فرموں، فیکٹریوں اور خصوصاً حکومت کے ملازمین سے ہے جن میں چپراسی اور پولیس کانسٹیبل سے لے کر اعلیٰ سے اعلیٰ افسر تک سب ہی شامل ہیں۔ کسبِ زر کے لحاظ سے یہ پیشہ باقی تمام ذریعوں سے بہت کم درجہ کا ہے، کیوں کہ جو لوگ ملازمت کرتے ہوئے رشوت وغیرہ نہیں لیتے اور دوسرے ناجائز ذرائع سے پیسہ نہیں کما سکتے وہ کبھی مالدار نہیں ہو سکتے، لیکن جہاں تک قیامِ امن کے لیے ملکی انتظام اور عام خوشحالی کا تعلق ہے یہ پیشہ باقی تمام پیشوں سے کہیں اعلیٰ اور اہم ہے۔ جس مُلک کے ملازم اچھے ہوتے ہیں وہ ہمیشہ خوش حال اور طاقتور رہتا ہے، لیکن جس مُلک کے ملازم اچھے نہیں ہوتے وہ کمزور اور تباہ ہو جاتا ہے اور بسا اوقات دشمن اس پر قبضہ کر لیتے ہیں۔ اس وقت ان ملازمین کو عوام سے کہیں زیادہ ذلّت اور رسوائی اور تکالیف کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اِس لیے ملازم

پیشہ لوگوں کو ہر وقت یاد رکھنا چاہیئے کہ مُلک کی خوشحالی کا انحصار ان کے کام پر ہے اور خود ان کی خوشحالی کا انحصار مُلک کی ترقی اور آزادی پر ہے۔

کسی مُلک کا قانون کتنا ہی اچھا ہو، اگر اس مُلک کے وُزراء اور حُکّام دیانت دار، محنتی اور فرض شناس نہ ہوں گے تو مُلک کو فائدے کی بجائے ہمیشہ نقصان ہی پہنچے گا۔ قیامِ امن و انتظام کی خاص ذمہ داری اگرچہ پولیس، عدالتوں اور اُمورِ انتظامیہ کے انچارج افسروں ہی پر عائد ہوتی ہے، لیکن دوسرے محکموں کے افسر بھی اس سے مستثنٰی یا بری الذّمہ قرار نہیں دیئے جا سکتے۔ اِس لیے تمام حُکام اور افسروں کو تین باتوں کی خاص طور پر پابندی کرنی چاہیئے، اوّل یہ کہ اپنے فرائضِ منصبی کو دیانت، محنت، انصاف اور عُجلت سے انجام دیں اور دیکھیں کہ ان کے ماتحت بھی اس بارے میں ان کی پوری تقلید کرتے ہیں یا نہیں۔ دوسرے یہ کہ اہلِ معاملہ کے ساتھ ہمیشہ نرمی سے گفتگو کریں۔ اگر کوئی شخص مجرم ثابت بھی ہو جائے تب بھی افسرانِ متعلقہ کو اس کے ساتھ بدکلامی کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ تیسرے یہ کہ اپنے ماتحتوں کے ساتھ ہمیشہ خوش خلقی سے پیش آئیں اور اپنے رشتہ داروں یا خوشامدی ماتحتوں کی وجہ سے اُن کا حق کبھی نہ ماریں اور اُن کی ترقی میں روڑے نہ اٹکائیں، بلکہ ہمیشہ آگے بڑھانے کی کوشش کرتے رہیں۔ جن ماتحتوں کے ساتھ دفتروں میں اچھا سلوک نہیں ہوتا وہ دل شکستہ ہو جاتے ہیں اور دفتر کا کام اطمینان اور خوش اسلوبی سے نہیں کر سکتے۔ متمدّن اقوام کے افسر اپنے ماتحتوں کے ساتھ بڑی خوش اخلاقی سے پیش آتے ہیں۔ دفتروں میں وہ اپنا رویّہ ایسا رکھتے ہیں کہ ڈسپلن اور کارگردگی پر اثر نہ پڑنے پائے، لیکن دفتر سے باہر نکل کر وہ ماتحتوں کے ساتھ اس قدر بے تکلفی سے ملتے ہیں کہ افسری اور ماتحتی کا فرق ہی نہیں رہتا، اسی کا نام روشن خیالی اور تہذیب ہے۔ ملازموں میں یہ باتیں ضرور ہونی چاہئیں۔

۱۔ **قابلیت:** یعنی جو کام اُن کے سپُرد ہو اس میں خوب ماہر ہوں۔

۲۔ **قوّتِ برداشت:** کام زیادہ یا مشکل ہو تو گھبرا نہ جائیں، ختم کر کے ہی دم لیں۔

۳۔ **خوداعتمادی:** انہیں اپنے اوپر بھروسا ہو کہ ہم یہ کام اچھی طرح کر سکتے ہیں۔

۴۔ **احساسِ ذمّہ داری:** کام کتنا ہی معمولی ہو اس کو حقیر اور ذلیل نہ سمجھیں اور پوری ذمہ داری سے انجام دیں۔

۵۔ **جِدّت:** کام کے سلسلہ میں اگر کوئی نئی بات پیش آجائے جس کی نہ تو کوئی مثال موجود ہو، نہ کوئی ہدایت کرنے والا تو خود اپنی عقل اور تجربہ سے مناسب طریقے سوچ کر اس کو انجام دے سکیں۔

۶۔ **تعاون:** اپنے اور دوسرے دفتروں کے تمام اہل کاروں کے ساتھ مل کر کام کریں اور ہر شخص کو ہر قسم کی دفتری مدد اور معلومات بہم پہنچانے کو ہر وقت تیار رہیں تاکہ سب کے کام میں آسانیاں پیدا ہوں۔

۷۔ **ضبط و نظم:** دفتر کے مقررہ قاعدوں اور طریقوں کی ہر لحاظ سے پوری پابندی کریں۔

۸۔ **جذبۂ خدمت و امداد:** ان کے دل و دماغ پر ہمیشہ یہ جذبہ غالب رہے کہ ہم عوام کے حاکم نہیں بلکہ خادم ہیں اور اسی خدمت کی روزی کھاتے ہیں۔ اہلِ معاملہ کو ہر وقت ہر قسم کی سہولتیں اور مدد پہنچائیں۔ اُن کے ساتھ خوش اخلاقی سے پیش آئیں اور اُن کا کام جلد از جلد انجام دیں اور ہمیشہ یاد رکھیں کہ عوام جس قدر خوش رہیں گے مُلک کے امن اور طاقت میں اضافہ ہوگا۔ عوام جس قدر بددل ہوں گے مُلک میں فساد رونما ہوگا اور ملکی طاقت کمزور ہو جائے گی۔

۹۔ **دیانت داری:** دیانت داری سے صرف یہی مراد نہیں کہ وہ غبن، رشوت، سفارش، اقربا

پروری، جُنبہ داری اور پارٹی بازی سے محترز رہیں، بلکہ اور بھی کئی باتیں مراد ہیں، مثلاً ہر کام کو قاعدے قانون کے مطابق پورے شوق اور انہماک سے انجام دیں، ٹالیں اور ٹرخائیں نہیں۔ حتیٰ کہ جب کوئی افسر یا نگراں موجود نہ ہو تب بھی سارا کام اُسی خوبی اور تندہی سے کریں جیسا کہ افسر کی موجودگی میں کرتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ وہ اس بارے میں اللہ سے ڈریں۔ اپنی تنخواہ کو حلال کر کے کھائیں اور اپنے آپ کو پہلے اللہ اور پھر افسروں کے سامنے ذمہ دار اور جواب دہ سمجھیں

ہمارے دفاتر میں صرف بیس پچیس فیصدی آدمی ایسے ہوں گے جو اپنے کام کو ایک مقدّس فرض سمجھتے اور دفتر کا سارا وقت کام میں صرف کرتے ہوں۔ زیادہ تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو زیادہ وقت چائے پینے، اخبارات پڑھنے، سیاست لڑانے اور اپنے نجی ملاقاتیوں سے خوش گپّیاں اڑانے میں گزارتے ہیں۔ اسی لیے جو کام ہفتہ دو ہفتہ میں ہوسکتا ہے وہ مہینوں بلکہ برسوں میں بھی نہیں ہوتا۔ اس کی ایک وجہ تو احساسِ فرض کا فقدان ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ دفتر کے سٹاف میں کئی ایک اہل کار افسروں کے رشتہ دار خوشامدی اور دوسری ناگفتہ بہ وجوہات سے اُن کے سر چڑھے ہوتے ہیں۔ اِس لیے کام نہیں کرتے اور ان کی دیکھا دیکھی دوسرے لوگ بھی کام چور ہو جاتے ہیں۔ ہماری رائے میں اِن بدعنوانیوں کو دُور کرنے کی صرف دو تدابیر ہیں، ایک سخت ٹریننگ اور دوسری سخت سزا۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ جو آدمی جس کام کے لیے ملازم رکھا جائے اسے کام کا چارج دینے سے پہلے کچھ مدت تک دو باتوں کی تربیت دی جائے۔ ایک تو اس کام کی جو اس سے لینا ہے، دوسرے اس دفتری کردار کی جو اس میں پیدا کرنا ہے اور جس کا ذکر پیچھے ہو چکا ہے۔ تربیت کے اختتام پر ہر ایک امیدوار کا امتحان لیا جائے اور صرف اسی کو ملازم رکھا جائے جو امتحان میں کامیاب ہو۔ اب اگر دَورانِ

ملازمت میں کبھی بھی اس سے کوئی حرکت دفتری کردار کے خلاف سرزد ہو تو اسے سخت سزا دی جائے۔ یہ تربیت تمام ملازموں کو نہ دی جاسکے تو کم از کم افسروں کو تو ضرور ہی دینی چاہیے، کیوں کہ دفتری کاروبار کو خوش اسلوبی سے چلانے کے اصل ذمہ دار وہی ہوتے ہیں۔ دفاتر ہوں یا عدالتیں، یہ سب صرف اِس لیے ہیں کہ اہلِ معاملہ کی کاربرآری اور مظلوموں کی داد رسی کریں۔ اس لحاظ سے ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ہر آدمی ضرورت پڑنے پر بہ خوشی وہاں جاتا لیکن سوائے عادی مقدمہ بازوں کے اور کوئی شریف آدمی سوائے اشد مجبوری کے کسی حالت میں وہاں جانا پسند نہیں کرتا بلکہ نقصان اٹھا لینے کو ترجیح دیتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ عام طور پر ان دفاتر اور عدالتوں کے اہلکار اہلِ معاملہ کو بہت ہی تنگ کرتے ہیں اور نہایت سختی اور رعونت سے پیش آتے ہیں۔ پولیس کا حال اس سے بھی بدتر ہے۔ عوام کے جان و مال کی حفاظت اور قیام امن کی جتنی ذمہ داری پولیس پر ہے اور کسی پر بھی نہیں۔ اِس لیے پولیس والوں کا سلوک عوام کے ساتھ اس قدر ہمدردانہ اور شریفانہ ہونا چاہیے کہ پولیس والے کو دیکھتے ہی انسان کے دل میں اطمینان اور اس کی طرف سے محبت اور عزّت کا جذبہ پیدا ہو اور وہ کہے ''لو وہ آگیا میرا محافظ اب مجھے کسی کا ڈر نہیں''، لیکن افسوس کہ معاملہ بالکل ہی برعکس ہے۔ پولیس والے کی شکل نظر آئی اور خیال ہوا کہ اللہ ہی خیر کرے، خدا جانے کیا مصیبت آنے والی ہے۔ بہت سے آدمی جو آنکھوں سے کوئی جرم ہوتا ہوا دیکھتے اور مجرموں کی سراغ رسانی میں پولیس کو بیش بہا مدد دے سکتے ہیں، صرف اِس لیے پولیس کو اطلاع نہیں دیتے کہ کہیں خود مصیبت میں نہ پھنس جائیں، یہ صورتِ حال بہت ہی افسوسناک ہے۔ پاکستان کی جو حکومت دفاتر اور پولیس کی اصلاح میں کامیاب ہوگی، اس کا نام قیامت تک تاریخِ پاکستان میں سنہری حروف سے لکھا رہے گا۔ اب ہم اخلاق کے چند ضروری محاسن اور معائب بیان کرتے ہیں۔

محاسن اور معائبِ اخلاق

تمام محاسن اور معائبِ اخلاق کا مفصّل بیان تو ممکن نہیں، علاوہ ازیں بہت سی باتوں کا ذکر پہلے آ بھی چکا ہے، اِس لیے یہاں صرف وہ معدودے چند باتیں لکھی جاتی ہیں جو اجتماعی حیثیت سے قوم کی تعمیر یا تخریب کا باعث ہوتی ہیں۔ لیکن ان محاسن و معائب کا بیان کرنے سے پہلے ہم ایک دفعہ پھر یاد دلانا ضروری سمجھتے ہیں کہ مسلمانوں کے زوال کی بہت بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ اُن کا اخلاق قرآنی معیار سے بہت ہی زیادہ گرا ہوا ہے اور جب تک وہ اخلاق میں معیاری ترقی نہ کریں، دُنیا کی ترقی یافتہ قوموں کے مقابلہ میں ہرگز سربلند نہیں ہو سکتے۔ محاسنِ اخلاق پر عمل کرنا ہی عین شرافت ہے۔ شرافت کا معیار اللہ تعالیٰ نے یہ بتایا ہے کہ جو آدمی جتنا زیادہ متقی ہے یعنی جتنا زیادہ اللہ سے ڈرتا ہے اور اس کے احکام پر عمل کرتا ہے اتنا ہی وہ شریف ہے۔ لیکن آج کل مسلمانوں نے شرافت کا معیار یورپ کی تقلید میں یہ قرار دے لیا ہے کہ جو جتنا زیادہ مالدار یا بڑا افسر ہے، اتنا ہی وہ شریف ہے۔ اس تخیل سے معاشرہ میں بڑی خرابیاں اور کمزوری پیدا ہو گئی ہے، اس نظریہ کو فوراً بدلنے کی ضرورت ہے۔

اب محاسن و معائبِ اخلاق کا حال سنئے۔

احسان: یہ وہی چیز ہے جس کو آج کل کی متمدّن قومیں میوچل ہیلپ یعنی امدادِ باہمی کہتی ہیں۔ قرآن میں جا بجا احسان کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ جو کوئی تمہارے ساتھ احسان کرے تم بھی اس کے ساتھ احسان کرو، مطلب یہ ہے کہ احسان کا سلسلہ ہر وقت

جاری رہے۔

احسان جماعت کی شیرازہ بندی اور اتحاد کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ احسان کے معنی صرف نیکی کے ہیں اور نیکی یہ ہے کہ جس شخص سے بھی کی جائے اس کو کچھ فائدہ یا کم از کم راحت و خوشی حاصل ہو۔ سوچنے کی بات ہے کہ جس جماعت کے سارے افراد ایک دوسرے کو ہر وقت آرام اور فائدہ پہنچانے کی کوشش میں لگے رہیں گے، اُس جماعت کے ہر فرد کو حصّہ رسدی، کچھ نہ کچھ آرام اور فائدہ ضرور پہنچتا رہے گا۔ اس طرح لوگوں کی بہت سی مشکلات میں آسانیاں پیدا ہو جائیں گی، زندگی خوشگوار بن جائے گی، تنگیاں کشادگی سے بدل جائیں گی، جینے میں لطف آنے لگے گا اور یہ دنیا جیتے جی جنت بن جائے گی، اس سے دماغ میں سکون و یکسوئی پیدا ہوگی، عمل کی قوّت بڑھے گی، ہر کام خوش اسلوبی سے کیا جا سکے گا اور ہر قدم پر کامیابی قدم چومے گی۔ لیکن بدنصیبی تو یہ ہے کہ آج کل احسان کو گالی سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ زبان میں بہت سے محاورے بھی ایسے پیدا ہو گئے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ احسان کوئی بہت ہی بُری چیز ہے۔ مثلاً ''میری جوتی اُس کا احسان اٹھاتی ہے''، ''میں تیرے باپ کا احسان مند نہیں ہوں''، ''کسی کا احسان اٹھانے سے تو مَر جانا بہتر ہے'' حتیٰ کہ شاعر تک کہنے لگے ہیں کہ

احسان ناخدا کا اُٹھائے میری بَلا
کشتی خدا پہ چھوڑ دوں لنگر کو توڑ دوں

احسان کی بُرائی کا خیال اِس لیے پیدا ہوا کہ احسان کرنے والے احسان کر کے جتانے اور طعنے دینے لگے، حالانکہ یہ نہایت ہی کمینہ پن کی بات ہے۔ اس طرح تو محبّت و اُخوّت کی بجائے نفرت کے جذبات پیدا ہوتے ہیں اور بجائے فائدے کے نقصان پہنچتا ہے۔ اسی

طرح جن لوگوں کے ساتھ احسان کیا جاتا ہے اگر وہ اپنے محسنوں کے شکر گزار نہ ہوں اور احسان کے بدلے میں احسان نہ کریں تو وہ بھی سخت بُرائی کے مرتکب ہوتے ہیں۔ احسان کرنے اور احسان اٹھانے والے دونوں کے دل میں محبت کا جذبہ کارفرما ہونا چاہئے ورنہ قوم میں اتفاق و اتحّاد کے بجائے نااتفاقی پیدا ہوگی اور فساد پھیلے گا۔ خوب سمجھ لو کہ جس قوم کے افراد صدق و خلوص سے ایک دوسرے کی مدد نہیں کرتے وہ قوم جانوروں سے بھی بدتر ہے، کسی حالت میں بھی تباہی سے نہیں بچ سکتی۔ یہاں یہ بات اچھی طرح یاد رکھنی چاہئے کہ نیکی صرف نیکی کے لیے کی جائے کسی معاوضے یا بدلے کے لیے نہ کی جائے ورنہ وہ دکانداری بن جائے گی اور بجائے فائدے کے نقصان پہنچائے گی۔ ہم نے ایک انگلش میگزین میں ایک کتّے کا سچا واقعہ پڑھا، جس کو مالک نے سدھایا تھا۔ مالک روزانہ اس کے گلے میں ایک ٹوکری لٹکا دیتا۔ کتّا یہ ٹوکری لے کر ایک بیکری میں جاتا اور وہاں سے کچھ رول لایا کرتا تھا، رول تعداد میں ہمیشہ پورے ہوتے تھے۔ ایک دن ایک رول کم نکلا اور اس کے بعد کئی دن تک ایک رول کم آتا رہا۔ آخر مالک نے بیکری والے سے دریافت کیا، اس نے کہا میں تو ہمیشہ پورے دیتا ہوں۔ اس پر ایک دن جب کُتّا رول لے کر واپس جا رہا تھا، مالک نے چھپ کر اس کا تعاقب کیا۔ کُتّا کچھ دُور جانے کے بعد ٹھہر گیا، گلے سے ٹوکری نکال کر سڑک کے کنارے رکھی اور ایک رول نکال کر منہ میں لیا اور بھاگا یہاں تک کہ ایک دیوار کے پیچھے غائب ہو گیا۔ کچھ دیر کے بعد واپس آیا تو منہ میں رول نہ تھا۔ کُتّے نے ٹوکری پھر گلے میں ڈالی اور گھر کی طرف چل دیا۔ جب وہ دُور چلا گیا تو مالک دیوار کے پیچھے گیا۔ کیا دیکھتا ہے کہ وہاں کھنڈر میں ایک بہت ہی کمزور اور لاغر کُتّیا پڑی ہوئی ہے جس کی ایک ٹانگ ٹوٹی ہوئی ہے۔ آس پاس سات نوزائیدہ پلّے پڑے ہوئے ہیں اور کُتّیا رول کھا رہی ہے۔ دیکھا

آپ نے جانوروں میں بھی یہ احساس ہے کہ ضرورت کے وقت اپنے ہم جنسوں کی مدد کریں یا یوں کہیے کہ ترقی یافتہ قوموں کے کتّے بھی ہم جنسوں کی مدد کرتے ہیں، لیکن زوال پذیر قوموں کے آدمی بھی ایک دوسرے کی مدد نہیں کرتے۔

دیانت: دیانت کے معنی بہت وسیع ہیں۔ دیانت سے صرف یہ مراد نہیں کہ اگر کوئی شخص اپنی چیز تمہارے پاس امانت رکھے تو اس کو بجنسہٖ واپس کردو۔ دیانت یہ ہے کہ جس چیز پر تمہارا حق نہیں اس کو چھوؤ تک نہیں اور کسی طرح مل جائے تو ہرگز اپنے استعمال میں نہ لاؤ۔ دیانت یہ بھی ہے کہ اگر کوئی شخص تمہارے توسّل سے کسی کو کوئی پیغام بھیجے تو اس طرح پہنچاؤ کہ الفاظ اور لہجہ بھی بالکل ایسا ہی رہے جو پیغام دینے والے کا تھا۔ دیانت یہ بھی ہے تمام حقوق اللہ، حقوقِ نفسی اور حقوق العباد کو کماحقہٗ ادا کرو۔ دیانت یہ بھی ہے کہ اپنے فرائضِ منصبی کو پوری طرح ادا کرو۔ جتنے وقت تک کام کرنے کی تنخواہ یا اجرت ملتی ہے اس وقت میں اپنا یا کسی اور کا کوئی کام نہ کرو۔ کام بے دلی سے نہ کرو، خالی وقت نہ گزارو، بیگار نہ ٹالو بلکہ اس کام کو جس کی اُجرت ملتی ہے، پورے جوش، سرگرمی اور پوری قابلیت سے سرانجام دو۔ بعض متمدّن ممالک میں دیانت داری کا یہ حال ہے کہ علی الصبح دودھ، انڈے، مکھن، اخبار اور دیگر اشیاء بیچنے والے یہ چیزیں خریداروں کے دروازوں پر رکھ جاتے ہیں، کوئی دوسرا ان کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔ غریب لوگ کسی چھوٹی سی دکان یا کیبن میں کچھ سامانِ تجارت سجا کر ہر چیز پر اس کی قیمت لکھ دیتے ہیں اور خود دکان کو خالی چھوڑ کر دن بھر کسی کارخانے وغیرہ میں کام کرتے ہیں۔ ضرورت مند خالی دکان پر آتے ہیں اور جو چیز لینی ہو اس کی قیمت کیش بکس میں ڈال کر چیز لے جاتے ہیں۔ شام کو مالکِ دکان آکر روپیہ نکال لیتا ہے، مجال ہے کوئی شخص قیمت ڈالے بغیر کوئی چیز لے جائے۔ بعض اپاہج لوگ ایک کُتّا

گاڑی بنا لیتے ہیں اور اس میں اخبارات یا اور ضروری چیزیں مثلاً سگریٹ وغیرہ رکھ دیتے ہیں کُتّا سدھایا ہوا ہوتا ہے وہ بازاروں اور محلوں میں گاڑی کو لیے پھرتا ہے۔ لوگ ضروری چیزیں لے کر قیمت کیش بکس میں ڈال دیتے ہیں، جب سامان ختم ہو جاتا ہے تو کُتّا گاڑی لے کر گھر واپس پہنچ جاتا ہے۔ ذرا غور کیجئے کہ ہمارے مُلک میں ایسا کیا جائے تو کیا حال ہو۔ پھر یہ دیکھیئے کہ یہ دیانت داری ان لوگوں میں ہے جن کو مشرک و کافر کہہ کر آپ خوش ہو لیتے ہیں اور یہ نہیں سوچتے کہ مسلمان ہوتے ہوئے آپ کی دیانت داری کا کیا حال ہے۔

ایثار: ایثار و سخاوت تقریباً ایک ہی چیز ہے لیکن خیرات اور ایثار میں فرق ہے، خیرات یہ ہے کہ تمہارے پاس اپنی ضروریات سے جو کچھ فاضل ہو اس میں سے ضرورت مندوں کو بھی دو۔ لیکن ایثار یہ ہے کہ جو چیز تم کو محبوب ہو اور جس کی تمہیں خود ضرورت ہو وہ چیز کسی دوسرے ضرورت مند کو دے دو، یعنی اپنی ضرورت پر دوسروں کی حاجت براری کو مقدم سمجھو۔ ایثار ایک بہت ہی بلند مرتبہ صفات میں سے ہے اور ایثار کرنے والا اللہ تعالیٰ کو بہت ہی عزیز ہوتا ہے۔ قوم کی جہالت اور گراوٹ کی وجہ سے کئی صدیوں سے ایثار کے صحیح معنی بھی لوگوں کو معلوم نہیں رہے اور ایثار اگرچہ کیا بھی جاتا ہے لیکن بہت ہی غلط جگہ اور غلط طریقے سے۔ جب سے مسلمانوں میں بے عملی اور تن آسانی عام ہوئی ہے، بے شمار لوگوں نے یہ پیشہ اختیار کر لیا ہے کہ صاحبِ مقتدرت اصحاب کے گرد اکٹھے ہو کر ان کی خوشامد اور چاپلوسی کرتے رہتے ہیں اور وقتاً فوقتاً موقع دیکھ کر اپنی محتاجی اور افلاس کا حال مؤثر الفاظ میں بیان کر کے اُن کے جذبہ ایثار و سخاوت سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اس قسم کا ایثار قوم کو بجائے فائدے کے الٹا نقصان پہنچاتا ہے اور بے عمل مفت خوروں کی تعداد میں ہمیشہ اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ اِس لیے ایثار صرف مستحق آدمیوں کے ساتھ کرنا چاہیئے۔ مفت خور خوشامدیوں اور

حاشیہ نشینوں کی ہرگز ہرگز ہمت افزائی نہ کرنی چاہیئے۔سب سے بہتر طریقہ ایثار کا یہ ہے کہ ایثار صرف اس موقع پر کیا جائے جب کہ اس سے اجتماعی فائدہ پہنچتا ہو، مثلاً قوم کے دو بڑے آدمی کسی ایک چیز کے حصول کے لیے مقابلہ کر رہے ہوں اور اس سے قوم کی دو جماعتوں میں دشمنی اور تفرقہ پیدا ہونے کا اندیشہ ہو تو ان میں سے ایک اپنے دعوے سے بخوشی دست کش ہو جائے تا کہ قوم میں پھوٹ نہ پڑنے پائے۔قرنِ اوّل کے مسلمانوں میں یہ بات عام تھی، لیکن آج ہمارے زعماء اس معاملے میں اپنے حریفوں کے ساتھ جس اخلاق کا ثبوت دیتے ہیں قارئین خود اچھی طرح جانتے ہیں ہم کو تو بیان کرتے ہوئے ندامت محسوس ہوتی ہے۔مفید ایثار کی ایک مثال یہ بھی ہے کہ فرض کیجئے کسی شہر میں ایک کالج یا سکول وغیرہ کھولنا ہے لیکن اُس کے لیے مکان نہیں ملتا۔اب کسی رئیس کے پاس ایک عالی شان اور فراخ کوٹھی ہے جو اسے بے حد محبوب ہے اور وہ اسی میں رہنا پسند کرتا ہے لیکن باوجود ازیں یہ کوٹھی کالج یا سکول کے لیے دیدے تو یہ ایثار واقعی فائدہ مند ہے اور اللہ کی نظر میں مقبول۔ہم نے ایسے نواب اور رئیس بچشمِ خود دیکھے ہیں کہ اگر کوئی شخص ان کی کسی چیز کی تعریف کر دے تو پھر وہ اس چیز کو اپنے قبضہ میں رکھنا معیوب اور خلافِ شان جانتے ہیں اور تعریف کرنے والے کو بخش دیتے ہیں۔اُمراء کی اس عادت سے قوم میں بے انتہا بے عملی پیدا ہوتی ہے اور تن آسان مفت خورے ان کو بیوقوف بنا کر گلچھرے اُڑاتے ہیں۔

ایفائے عہد: قومی ترقی کے لیے ایفائے عہد بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنی اور صفاتِ حسنہ۔قرآن میں آیا ہے: یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ (المائدۃ ۱)

یعنی ''اے ایمان والو اپنے اقراروں کو پورا کرو۔''

اس سے بھی بڑھ کر بنی اسرائیل میں ارشاد ہوا ہے۔

وَاَوۡفُوۡا بِالۡعَهۡدِ اِنَّ الۡعَهۡدَ كَانَ مَسۡئُوۡلًا (بنی اسرائیل۔۳۴)

یعنی ''اپنے وعدے پورے کیا کرو قیامت میں اس کے متعلق باز پُرس کی جائے گی''
لیکن یہاں اللہ اور قیامت پر ایمان ہی کسے ہے جو اس حکم کی پروا کرے۔ ایفائے عہد بڑی بڑی باتوں ہی میں نہیں چھوٹی اور معمولی باتوں میں بھی اتنا ہی ضروری ہے۔ بعض اوقات وعدہ خلافی کے نتائج بہت ہی بُرے ہوتے ہیں اور جس شخص سے وعدہ کیا جاتا ہے اس کو نہ صرف جسمانی اور روحانی اذیّت بلکہ طرح طرح کا نقصان بھی پہنچتا ہے۔ کم از کم ایک واقعہ ہم کو ایسا معلوم ہے جس میں ایک شخص نے محض اِس لیے خودکشی کر لی تھی کہ اس کے ایک دوست نے جو روپیہ اس کو دینے کا وعدہ کیا تھا جسب وعدہ وقتِ موعود پر ادا نہیں کیا۔ جس قوم کے افراد میں وعدہ خلافی کی عادت عام ہو وہ کبھی ترقی نہیں کر سکتی۔ وعدہ خلافی کرنے سے تو ہزار درجہ بہتر ہے کہ وعدہ کیا ہی نہ جائے۔ دوسری قومیں جن کو تم کافر و مشرک کہہ کر خوش ہو لیتے ہو ان کے معمولی افراد بھی ایفائے عہد میں اس قدر پکّے ہوتے ہیں کہ ہماری قوم کے بڑے بڑے مدّعیانِ تقویٰ، اعلیٰ تعلیم یافتہ اور زُعماء بھی نہیں ہوتے۔ حقیقت یہ ہے کہ اخلاقِ حسنہ اور اعلیٰ کردارِ انسانی پیدا کرنے کے لیے سب سے پہلا سبق ہی یہ ہے کہ آدمی وعدے اور وقت کی پابندی کرے۔

اصلاح: اپنے افراد یا جماعت کی اصلاح کرنا سب سے بڑی نیکی اور ذِمّہ داری کا کام ہے۔ اس کام کے لیے بے انتہا قابلیت اور خود نیک ہونے کی ضرورت ہے، ہر شخص اس کا اہل نہیں ہو سکتا۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ

وَلۡتَكُنۡ مِّنۡكُمۡ اُمَّةٌ يَّدۡعُوۡنَ اِلَى الۡخَيۡرِ وَيَاۡمُرُوۡنَ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَيَنۡهَوۡنَ عَنِ الۡمُنۡكَرِ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ (آل عمران۔۱۰۴)

یعنی ''لازم ہے کہ تم میں ایک گروہ ایسا ہو جو لوگوں کو بھلائی کی طرف بلائے، اچھے کاموں کا حکم دے اور بُرائیوں سے روکے''۔ لیکن ہماری بدنصیبی کہ یہ کام بھی ہر شخص نے اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے، خود کچھ جانتے نہیں نیک و بد کو پہچانتے نہیں لیکن جہاں کسی میں بزُعمِ خود کوئی برائی دیکھی (خواہ وہ حقیقت میں برائی نہ ہو) لگے اس کو نصیحت کرنے۔ اس کے لیے نہ کوئی موقع و وقت دیکھتے ہیں نہ حالات و ماحول۔ راستہ چلتے بازار اور سڑکوں پر، بسوں میں، ٹریم کاروں میں، ریل گاڑیوں میں الغرض ہر جگہ ان ناصحانِ مشفق کی زبانیں آپ کو قینچی کی طرح چلتی نظر آئیں گی۔ پھر نصیحت کرنے کا طریقہ اس قدر بھونڈا اور مکروہ ہوتا ہے کہ جس کو نصیحت کی جا رہی ہے وہ نصیحت ماننے کی بجائے لڑنے جھگڑنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اللہ نے حکم دیا ہے کہ نصیحت حکمت آمیز پیرائے اور خوشترین الفاظ میں کی جائے، لیکن اس حکم کی مطلق پروا نہیں کی جاتی، اسی لیے جھگڑا اور فساد برپا ہوتا ہے۔ آج کل تو لوگوں کا یہ حال ہے کہ اگر ان سے کہا جائے کہ تم میں فلاں نقص ہے تو وہ سر توڑنے کو آمادہ ہو جاتے ہیں۔ اِس لیے جب کسی کو نصیحت کرنی ہو تو اس کو ہرگز ہرگز بُرا نہ کہو بلکہ جو عیب اس میں ہے اس عیب کو بُرا کہو، مثلاً جو آدمی جھوٹا، شرابی یا زانی ہے، مناسب موقع و محل دیکھ کر اس کے سامنے جھوٹ، شراب اور زنا کی برائی اور نقصان ایسے مؤثر الفاظ میں بیان کرو کہ وہ متاثر ہوئے بغیر نہ رہے۔ لیکن اس طریقے کا اثر بھی صرف اُسی حالت میں ہو گا جب کہ وہ تمہارے حُسنِ اخلاق کا پہلے سے گرویدہ اور تمہاری بات ماننے کو تیار ہو۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ تم میں ایک گروہ ایسا ہونا چاہئے جو نیکیوں کی دعوت دے اور بُرائیوں سے روکے، تو ظاہر ہے کہ یہ گروہ صرف علماءِ دین ہی کا ہو سکتا ہے۔ لیکن بدقسمتی سے ہمارے ہاں صحیح معنوں میں ''علمائے دین'' اس قدر کم ہیں کہ انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ ہر

شخص جو چند کتابیں حدیث وفقہ کی پڑھ کر اور کچھ بے سروپا حکایتیں اور روایتیں یاد کر کے کسبِ معاش کی خاطر وعظ ونصیحت کا پیشہ اختیار کر لیتا ہے، عالمِ دین سمجھا جاتا ہے۔ ایسے خود ساختہ اور پیشہ ور علماء بجائے فائدے کے سخت نقصان پہنچاتے اور بجائے اصلاح کے قوم میں فساد برپا کرتے ہیں۔ انہی کے لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ''جب ان سے کہا جاتا ہے کہ زمین میں فساد نہ پھیلاؤ تو کہتے ہیں کہ ہم تو اصلاح کر رہے ہیں'' قوم کے مختلف فرقوں میں عناد ومنافرت پیدا کرنے کے ذمہ دار اسی قسم کے علماء ہیں۔ رسول اکرمؐ نے فرمایا ہے کہ میری امت کا اختلاف باعثِ رحمت ہوگا، کیوں؟ محض اِس لیے کہ اگر اختلاف خلوص اور نیک نیتی پر مبنی ہو اور اس میں عناد ومنافرت کے جذبات کام نہ کر رہے ہوں تو ایسے اختلاف پر بحث وتمحیص سے اجتہاد کی راہیں کھلتی ہیں، حق آشکارا اور دین کی خوبیاں اُجاگر ہوتی ہیں کون نہیں جانتا کہ ہمارے تمام فرقوں کے اختلافات اُصولی مطلق نہیں محض فروعی ہیں۔ اللہ، رسولؐ اور قرآن کو سب ہی سچا جانتے ہیں۔ اس صورت میں اگر ایک فرقہ دوسرے پر لعن طعن نہ کرے، ان اختلافات پر صبر کرے اور ہر فرقہ کے فروعی عقائد کو ان کے نجی عقائد سمجھ کر درگزر کرے یا شرافت واخلاق کے ساتھ بحث مباحثہ بھی کر لے تو کوئی مضائقہ نہیں، لیکن یہ پیشہ ور علماء اپنی جیبیں پُر کرنے کے لیے مسلمانوں کو آپس میں لڑاتے اور ملّت کی عام تباہی کا باعث ہوتے ہیں۔ ہماری رائے میں اس مصیبت کا واحد علاج یہ ہے کہ ہر اسلامی حکومت دو کام کرے، ایک تو یہ کہ تمام مذہبی مدارس کی نگرانی اپنے ذمے لے لے اور ان مدارس کے ہر فرقہ کے علماء سے ایسے نصاب مقرّر کرائے کہ طلباء اپنے فروعی اختلافات پر قائم رہتے ہوئے بھی باہمی منافرت سے باز رہنا سیکھیں۔ دوسرے یہ کہ کسی فرقے کے کسی عالم کو پبلک یا پرائیویٹ جلسوں میں اس وقت تک تقریر کرنے یا وعظ کہنے کی اجازت نہ ہو

جب تک وہ گورنمنٹ سے اس مقصد کے لیے باقاعدہ لائسنس حاصل نہ کر لے۔ ہمیں معلوم ہے کہ اس طریقے کے نفاذ پر قیامت برپا ہو جائے گی، لیکن غل و شور مچانے والے وہی لوگ ہوں گے جو اپنا پیٹ بھرنے کے لیے ملّت میں فرقہ وارانہ تعصب اور منافرت پیدا کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ لیکن اتّحادِ ملّت کا مقصد اس قدر عظیم اور اہم ہے کہ اس بارے میں حکومتوں کو کسی کی بھی پروا نہ کرنی چاہیئے اور پوری طاقت سے ملّی تباہی اور بربادی کے ان جراثیم کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے فنا کر دینا چاہیئے۔ یہاں یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ اس اصلاح سے ہماری مراد صرف جماعتی اور اجتماعی اصلاح ہے۔ یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ کوئی شخص کسی دوسرے کو بُرائیوں سے روک ہی نہیں سکتا اور نیکی کی دعوت دے ہی نہیں سکتا۔ بے شبہ ہر مسلمان کو یہ حق ہے کہ وہ دوسرے مسلمان کو نیکی کی دعوت دے اور برائی سے روکے۔ لیکن یہ کام صرف ان آدمیوں کو کرنا چاہیئے جو اس کے اہل ہوں اور نصیحت کا طریقہ جانتے ہوں، حکمت اور خوبی سے یہ کام انجام دے سکیں، فساد برپا نہ کریں۔

انصاف: جس آدمی میں انصاف کا مادّہ نہ ہو اس میں تعصب پیدا ہو جائے گا اور جس میں تعصب ہوگا وہ حق بینی سے محروم رہ جائے گا جو سراسر گمراہی اور خسران ہے۔ اگر کسی قوم کی اکثریت ایسی ہو تو وہ کبھی تباہی سے نہ بچ سکے گی، اِس لیے اپنا اور قوم کا بھلا چاہتے ہو تو ہمیشہ انصاف کرو۔ انصاف کیا ہے؟ یہ کہ تم پر منصبی، معیشتی اور معاشرتی اعتبار سے لوگوں کے جتنے بھی حقوق عائد ہوتے ہیں سب کو اللہ اور رسولؐ کے حکم کے مطابق ادا کرو۔ چونکہ ادائیگیِ حقوق کا پورا بیان پیچھے ہو چکا ہے، یہاں تفصیل کی ضرورت نہیں۔

انتقام اور معافی: اگرچہ اللہ نے انتقام اور قصاص لینے کا حکم دیا ہے، لیکن اس کا یہ منشاء ہرگز نہیں کہ تم خود قانون کو اپنے ہاتھ میں لے لو۔ جس نے تمہارا دانت توڑا، اس کا دانت توڑ

دو، جس نے تمہاری آنکھ پھوڑی، اس کی آنکھ پھوڑ دو، جس نے تمہارے کسی رشتہ دار کو قتل کیا، اس کو قتل کردو۔ اگر ایسا ہونے لگے تو قوم و مُلک کا سارا امن و انتظام دو دن میں درہم برہم ہو کر رہ جائے اور وہ فساد پھیلے کہ خود قوم کا نام ونشان باقی نہ رہے۔ اِس لیے اللہ اور رسولؐ نے یہ کام قاضیوں یعنی ججوں اور مجسٹریٹوں کے سپُرد کیا ہے کہ وہ مظلوموں کی دادرسی کر کے مجرموں کو سزا دیں۔ اکثر مسلمان یہ سمجھتے ہیں کہ اگر اس قسم کے قصوروں کا نہیں تو کم از کم چھوٹی موٹی باتوں کا بدلہ تو ہم خود لے سکتے ہیں، مگر یہ خیال بھی غلط ہے۔ ہم پوچھتے ہیں اگر تم کو کوئی گالی دیتا یا تمہارا کچھ مال چُرا لیتا ہے تو کیا جواب میں تم بھی اس کو گالی دو گے یا اس کا مال چُرا لو گے۔ اگر تم ایسا کرو گے تو تم بھی اسی جرم اور گناہ کے مرتکب ہو گے جو اس نے کیا ہے اور اسی سزا کے مستحق ٹھہرو گے جس کا مستحق وہ ہے۔ اگر اس طرح برائی اور گناہ کو جائز قرار دیا جائے تو نیکی کا نام بھی باقی نہ رہے گا۔ مسلمانوں کی قومی تباہی کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ وہ بُرائی کے بدلے بُرائی کو جائز سمجھتے ہیں۔ اُن کو یہ تو یاد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جان کے بدلے جان، آنکھ کے بدلے آنکھ، ناک کے بدلے ناک، کان کے بدلے کان، دانت کے بدلے دانت اور زخموں کے بدلے ایسے ہی زخم لگانے کو جائز قرار دیا ہے، لیکن اسی آیت کا اگلا ٹکڑا اُن کو یاد نہیں رہتا کہ ''اگر مظلوم معاف کر دے تو یہ اُس کے گناہوں کا کفارہ ہوگا''۔ ہم پوچھتے ہیں کہ اس سے بڑی جزا اور کیا ہوسکتی ہے کہ آپ کے گناہ معاف ہو جائیں اور مرنے کے بعد اُن کی سزا نہ بھگتنی پڑے۔ پھر اس ٹکڑے کے بعد یہ بھی ہے کہ ''جو لوگ اللہ کی کتاب کے مطابق حکم نہ دیں وہ بے انصاف ہیں''۔ (دیکھیے سورہ مائدہ آیت ۴۸) آیت کے اس آخری ٹکڑے سے صاف ثابت ہو گیا کہ تم کو خود مجرم سے جرم کا بدلہ اور قصاص لینے کا حکم نہیں ہے بلکہ یہ کام قاضیوں کا ہے جو سزا کا حکم دیں گے۔

اس کے علاوہ سورۂ مومنوں میں یوں ارشاد ہوتا ہے ''اے پیغمبر بُرائی کو بھلائی سے دفع کرو۔ہم خوب جانتے ہیں کہ تمہارے مخالفین تمہاری کیا صفات بیان کرتے ہیں'' کیا اس کا یہ مطلب نہیں کہ جو لوگ تمہارے منہ پر یا پیٹھ پیچھے تمہیں بُرا کہیں تو جواب میں نیکی سے پیش آؤ۔ پھر اس سے بھی زیادہ صاف سورۂ حٰم السّجدہ میں فرماتے ہیں کہ ''بُرائی اور بھلائی برابر نہیں ہوسکتی۔ اِس لیے برائی کا جواب بھلائی سے دو تاکہ تمہارا عدو مثل تمہارے دوست اور رشتہ دار کے ہو جائے'' اس سے زیادہ بلند اخلاقی اور کیا ہوسکتی ہے۔ دن رات کا تجربہ ہے کہ اگر کوئی شخص تمہارے ساتھ ہمیشہ برائی کرتا رہے اور تم جواب میں ہمیشہ نیکی سے پیش آتے رہو تو آخر میں وہ شرمندہ ہو کر تمہارا دوست اور محبّ بن جائے گا۔ان صاف صاف احکام کے باوجود ہمارے افراد ہی نہیں بلکہ ملّت کے بعض طبقات بھی انتقاماً قانون کو ہاتھ میں لینا مذہباً جائز سمجھتے ہیں۔ مثال کے طور پر ہمارے سرحدی اور قبائلی پٹھانوں کو ہی لیجیے، ان کا یہ حال ہے کہ اگر کوئی شخص کسی کو قتل کر دے تو مقتول کے وارث موقع ملتے ہی قاتل کو قتل کر دیتے ہیں اور اگر اتفاق سے قاتل بچ جائے تو مقتول کی اولاد نسل در نسل اس کے خون کا بدلہ لینے کی فکر میں لگی رہتی ہے اور جب بھی موقع ملتا ہے قاتل کی اولاد در اولاد میں سے کسی نہ کسی کو قتل کر کے دم لیتی ہے۔ اب اس نئے قتل پر یہ ہوتا ہے کہ مقتول نمبر۲ کی اولاد اس کے خون کا بدلہ لیتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قتل و خوں ریزی کا یہ سلسلہ ہمیشہ بڑھتا ہی رہتا ہے کبھی ختم نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ پٹھان عام طور پر ہتھیار باندھے بغیر گھر سے باہر نہیں جاتے، کوئی نہیں جانتا کہ کس وقت دشمن کا سامنا ہو جائے۔ یہ صورتِ حال جس قدر غیر مہذّب، غیر اسلامی اور قومی ترقی کے لیے تباہ کن ہے، ظاہر ہے لیکن پٹھان اپنی علمی اور مذہبی جہالت کی وجہ سے اس کا ذرّہ برابر بھی احساس نہیں رکھتے۔ وہ نہیں سمجھ سکتے کہ یہ رسم ان کی مُسلَّمہ بہادری

کے دامن پر کلنک کا ٹیکہ ہے۔ اس سے ان کی بہادری ہی نہیں غیرت بھی رفتہ رفتہ ختم ہو رہی ہے۔ کیونکہ اس قسم کے انتقام کبھی بھی مقابلہ یا چیلنج کر کے نہیں لیے جاتے بلکہ جب بھی موقع ملتا ہے بدلہ لینے والے بے خبری میں پیچھے سے گولی چلا کر مخالف کو ہلاک کر ڈالتے ہیں۔ یہ کسی طرح بھی بہادری اور غیرت نہیں کہلائی جا سکتی۔ اس رسم کی وجہ سے پٹھان ہی نہیں اسلام بھی تمام دُنیا میں بدنام ہو رہا ہے اور ہو چکا ہے۔ غیر مسلم اقوام پروپیگنڈا کرتی ہیں کہ پٹھانوں میں اس قسم کی وحشت و بربریّت اسلامی تعلیم کی وجہ سے ہے۔ اِس لیے قوم و مذہب کا درد رکھنے والے پٹھانوں کا فرض ہے کہ حکومت کی مدد سے اس صورتِ حال کو جلد از جلد ختم کر دیں اور اپنی خداداد قوّتوں سے کام لے کر دوسری متمدّن اقوام کے دوش بدوش کھڑے ہو جائیں اور یاد رکھیں کہ انتقام کا یہ طریقہ انتہائی وحشیانہ اور گناہ کبیرہ ہے۔ جس شخص نے تمہارے باپ یا دادا کو قتل کیا تھا اگر وہ سزا سے بچ گیا تو تم اس کے پوتے یا بیٹے سے بدلہ نہیں لے سکتے، کیوں کہ وہ تو بے گناہ ہے۔ نہ قتل کا ذمہ دار ہے نہ خود قاتل۔

تجسّسِ اعمال اور بدگمانی: سورۂ حُجرات میں ارشاد ہوتا ہے ''اے ایمان والو بات بات پر بدگمانی نہ کیا کرو کیوں کہ اکثر بدگمانیاں گناہ ہیں اور ایک دوسرے کے افعال کی جستجو میں نہ رہا کرو'' لیکن باوجود ان صاف احکامات کے اکثر مسلمان اس قبیح عادت میں مبتلا ہیں۔ بدگمانی کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ دل ہر وقت بُرائی کی طرف مائل رہتا ہے اور رفتہ رفتہ بُرائی کا خُوگر ہو جاتا ہے، ایسے دل میں نیکی قبول کرنے کی صلاحیت نہیں رہتی۔ ایسے آدمیوں کا اخلاق بہت ہی گندہ ہوتا ہے۔ بدگمانیاں آنکھوں پر پردہ ڈال دیتی ہیں اور حق بینی سے محروم رکھتی ہیں، جس سے بعض مرتبہ نقصان عظیم پہنچتا ہے۔ ایک سچّا واقعہ ہے کہ ایک شخص

جو فوجی ملازم تھا کسی ٹریننگ کے لیے چھ ماہ کے واسطے انگلستان گیا اور بیوی کو اکیلا گھر پر چھوڑ گیا۔ جب واپس آیا تو کسی وجہ سے بیوی پر بدگمانی پیدا ہوگئی۔ اس ٹوہ میں رہنے لگا کہ اس کی کوئی حرکت بچشمِ خود دیکھے۔ مکان کے دو دروازے تھے، ایک دن پچھلے دروازے سے مکان میں داخل ہوا، بیوی دوسرے دروازے پر کھڑی کسی سے باتیں کر رہی تھی، چھپ کر سننے لگا، ایک فقرہ جو آخر میں صاف طور پر سنا یہ تھا ''کل آنا کل دوں گی'' یہ سُن کر آپے سے باہر ہوگیا۔ غصّہ کے مارے عقل جاتی رہی، پستول لگا ہوا تھا، فائر کیا، غریب عورت وہیں ڈھیر ہوگئی۔ دوسرے دن شام کو ایک فقیر آیا۔ گھر پر بھیڑ تھی۔ ایک آدمی سے کہا بی بی جی سے کہنا وہ فقیر آ گیا ہے، اس آدمی نے جواب دیا کہ بی بی جی تو مر گئی۔ سُن کر بہت رنجیدہ ہوا، کہنے لگا بڑی ہی نیک بی بی تھی، کبھی سائل کو گھر سے خالی نہ جانے دیتی تھی۔ مجھے ہمیشہ خیرات دیتی تھی، کل میں آیا تو کل بھی کچھ پیسے دیئے تھے۔ میں نے پہننے کے لیے کپڑا مانگا تو وعدہ کیا کہ ''کل آنا۔ کل دوں گی''۔ لوگ مجرم کے منہ سے یہ فقرہ پہلے ہی کئی بار سُن چکے تھے، فقیر کو ٹھہرا لیا، اس کا پتہ لکھا اور کورٹ مارشل میں بطور گواہ پیش کیا۔ مجرم کو پھانسی کی سزا ہوئی جو بعد میں نو برس کی قید با مشقت میں تبدیل ہوگئی۔ دیکھا آپ نے بدگمانی کا ثمرہ، کس طرح بنا بنایا گھر تباہ ہوگیا۔ اِس لیے جب تک بچشمِ خود نہ دیکھ لو ہرگز کسی کے متعلق بُری رائے قائم نہ کرو اور بچشمِ خود دیکھنے کے بعد بھی پردہ پوشی کرو۔ اللہ بھی تمہارے عیبوں کی پردہ پوشی کرتا ہے، ہاں عدالت میں گواہی دینی پڑے تو بالکل سچّی بات بیان کرو، وہاں کسی کے جرم کا چھپانا گناہ ہے۔ بدگمانی یہ بھی ہے کہ تم کسی کے متعلق یہ فرض کر لو کہ وہ تمہارا بدخواہ ہے یا تم کو

ذلیل سمجھتا ہے۔ ایسی بدگمانی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تم بھی اس کو ذلیل سمجھنے لگتے ہو اور اس کے بدخواہ بن جاتے ہو۔ اس طرح دلوں میں اکثر اوقات بے وجہ فرق پڑ جاتا ہے اور جماعت میں تفرقہ پیدا ہوتا ہے۔ اس برائی سے بچنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ جس کے متعلق تمہارے دل میں ایسی بدگمانی پیدا ہو خود اس سے صاف صاف بیان کرو تا کہ دل صاف ہو جائیں اور اگر تمہارا خیال صحیح ثابت ہو تو برا نہ مانو۔ اپنے اخلاق کی طاقت سے اپنے مخالف پر فتح حاصل کرو اور اس کو اپنا بنا لو۔ یاد رکھو نفرت کو نفرت سے نہیں محبت سے ہی فتح کیا جا سکتا ہے۔

غیبت اور بدگوئی: غیبت، بدگوئی اور چغلی بھی نہایت نقصان دہ اور قبیح عادت ہے۔ اجتماعی نقطۂ نظر سے جتنا نقصان اس عادت سے قوم کو ہوتا ہے اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سورۂ حُجرات میں غیبت سے اور سورۂ نساء میں بدگوئی سے منع فرمایا ہے۔ رسول اکرمؐ نے تو غیبت کو زِنا سے بھی زیادہ شدید گناہ قرار دیا ہے۔ جب صحابۂ کبارؓ نے رسول اللہ سے یہ سنا تو کہا کہ یارسول اللہ غیبت زِنا سے بڑھ جائے یہ کیسے ممکن ہے؟ آپؐ نے فرمایا کہ دیکھو اگر کوئی زِنا کرے اور توبہ کر لے تو اللہ اسے معاف کر دیتا ہے، لیکن غیبت کرنے والے کی اللہ کے ہاں معافی نہیں ہو سکتی جب تک کہ وہ شخص جس کی بدگوئی کی گئی ہے معاف نہ کر دے۔ اس حدیث کو پڑھ کر بہت سے مسلمان متعجب ہوتے ہیں، وہ اس کی نفسیاتی وجہ کو نہیں سمجھ سکتے۔ زِنا ایک ایسا فعل ہے جو بے حد احتیاط سے ہزار پردوں کے پیچھے چھپ کر کیا جاتا ہے اور زِنا کے ہزارہا واقعات میں سے ایک آدھ ہی منظرِ عام پر آتا ہے۔ برخلاف ازیں غیبت اور بدگوئی عوام کے سامنے مجلسوں میں کی جاتی ہے، تنہائی میں ہو ہی نہیں سکتی۔ اب

ظاہر ہے کہ جس بات کی جتنی زیادہ تشہیر ہوگی اتنا ہی لوگوں کو اُس کا علم زیادہ ہوگا اور وہ اتنے ہی زیادہ اس کی طرف مائل ہوں گے۔ سینما اس بات کا سب سے روشن ثبوت ہے، جب سے لوگوں نے فلموں میں دھوکے، فریب اور رہزنی وغیرہ کے نئے نئے طریقے مشاہدہ کیے ہیں، نئے فیشن کے بدمعاش اور ڈاکو زیادہ پیدا ہوگئے ہیں اور ہوتے جا رہے ہیں۔ اِس لیے عقل کا تقاضا ہے کہ امن قائم رکھنے کے لیے بُرائیوں کا ذکر بھی نہ کیا جائے، صرف نیکیاں اور خوبیاں ہی بیان کی جائیں تا کہ لوگوں کے کان برائی کے نام سے آشنا نہ ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں فرمایا ہے

لاَ یُحِبُّ اللّٰہُ الْجَہْرَ بِالسُّوْءِ مِنَ الْقَوْلِ (النساء ۱۴۸)

یعنی ''اللہ اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ برائی کا ذکر بلند آواز سے بھی کیا جائے'' لیکن باوجود اس کے حالت یہ ہے کہ سینما کے پردوں، ناولوں، اخباروں، ادبی اور فلمی ماہناموں، مجلسی اور سیاسی پلیٹ فارموں حتیٰ کہ مذہبی مناظروں اور مساجد کے منبروں تک سے بھی ہر وقت یہ گندگی فضا میں پھیلائی جاتی اور عوام کے دل و دماغ میں بسائی اور رمائی جاتی ہے۔ بُرائیوں کی تشہیر اس زمانہ میں اس قدر زور و شور سے ہو رہی ہے کہ معلوم ہوتا ہے دُنیا میں اس کے سوا اور کوئی چیز موجود ہی نہیں۔ بہت سے ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں نے تو اپنا شعار ہی بنا لیا ہے کہ ہر وقت گندگی اُچھالا کریں۔ جنسی نکات ہوں یا غریبوں اور مزدوروں کی دردبھری حکایات، جب لکھی جائیں تو ان میں دھوکا، فریب، بے حیائی، عصمت فروشی یا عصمت دری وغیرہ کا بیان ضرور ہو۔ یہ لوگ عالم اور فاضل اور ''ماڈرن'' ہونے کا دعویٰ تو کرتے ہیں لیکن اتنا نہیں جانتے کہ دوسری زبانوں خصوصاً انگریزی میں ہزاروں ناول اور لاکھوں افسانے ایسے ہیں جن میں فحاشی کا نام ونشان بھی نہیں۔ باوجود اس کے وہ اتنے

دلچسپ ہوتے ہیں کہ جب تک انسان ختم نہ کر لے ہاتھ سے چھوڑنے کو دل نہیں چاہتا۔ مگر ہمارے نوّے فیصد ناول نویس اور افسانہ نگار فحش اور عریاں مضامین کے سوا اور کسی موضوع پر لکھ ہی نہیں سکتے۔ انہی گندے، مُبتذل اور پیش پا افتادہ پلاٹوں کو ادل بدل کر نئے ناموں، نئی طرزِ نگارش سے پیش کرتے رہتے ہیں۔ اخبارات میں زِنا، اغوا، چوری، ڈکیتی اور راہزنی کے واقعات کو نمایاں سُرخیوں کے ساتھ نمایاں تر بنا کر پیش کیا جاتا ہے اور ہر روز ہر اخبار میں ایسی خبریں عام طور پر بکثرت نظر آتی ہیں۔ ان صحافیوں پر ہی کیا منحصر ہے، ہمارے اکثر علماء، واعظ اور مناظر بھی جب تک دوسرے فرقوں کی بُرائیاں بیان نہ کریں اور ان کو گالیاں نہ دیں تقریر نہیں کر سکتے۔ اگر ان لوگوں سے کہا جائے کہ اس طرح بُرائیاں بیان کرنا منع ہے تو جواب دیتے ہیں کہ واہ ہم تو یہ اِس لیے کرتے ہیں کہ لوگ ان کو پڑھ کر اور سُن کر بُرائیاں کرنا چھوڑ دیں۔ اگر یہ لوگ سچّے دل سے اسی بات کے قائل ہیں اور ان کا یہ جواب ریا کاری پر مبنی نہیں تو ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ یہ صحافی اور علماء باوجود عالم و فاضل ہونے کے نفسیاتِ انسانی کی الف ب ت سے بھی واقف نہیں۔ ان کو معلوم نہیں کہ انسان بالفطرت جذباتی واقع ہوا ہے، وہ نیکیوں کی بہ نسبت بُرائی اور بدی کو جلدی اختیار کر لیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ سے زیادہ انسانی فطرت کو نہ علماء جانتے ہیں، نہ ادیب اور اہلِ صحافت۔ جب اللہ تعالیٰ بُرائی کی تشہیر کو پسند نہیں کرتا تو ہم علماء یا صحافیوں کی بات کو کیسے مان لیں۔ بعض آدمی یہ سمجھتے ہیں کہ اگر کسی میں کوئی بُرائی یا عیب ہو اور وہ اس کی پیٹھ پیچھے بیان کر دیا جائے تو وہ غیبت نہیں ہے۔ صحابہؓ نے رسول اکرمؐ سے یہی سوال کیا تو حضورؐ نے فرمایا کہ یہی تو غیبت ہے۔ اگر تم کسی کے متعلق ایسی بُرائیاں بیان کرو جو اس میں نہیں ہیں تو اس کو بُہتان کہتے ہیں۔

چُغلی: چُغلی بھی بدگوئی کی ایک قسم ہے۔ یہ عام لوگوں کے علاوہ دفتروں، کارخانوں اور

تجارتی اداروں وغیرہ کے ملازمین میں حد سے زیادہ پائی جاتی ہے۔ نالائق، کام چور اور فسادی قسم کے ملازمین جو ناجائز طریقوں سے افسروں کو خوش کر کے ترقی حاصل کرنا چاہتے ہیں، چغل خوری اور خوشامد سے اپنا مدعا حاصل کرتے ہیں اور یہ افسر لوگ ستر پچھتر فیصدی کانوں کے اس قدر کچے اور عقل کے اس قدر اندھے ہوتے ہیں کہ بے سوچے سمجھے بلا تحقیق ان مطلب پرستوں کی بات پر یقین کر کے مستحق لوگوں سے ناراض ہو جاتے ہیں اور انہیں نقصان پہنچا دیتے ہیں۔ اس سے تمام عملے میں ہراس، بے دلی اور بدنظمی پیدا ہوتی ہے اور کام بجائے اچھا ہونے کے اور خراب ہو جاتا ہے۔ یہ چغل خور اور خوشامدی آج سے نہیں سینکڑوں برس سے مُلک اور قوم کو تباہ کر رہے ہیں۔ عوام تو ایک طرف، کتنی ہی بادشاہتیں اور سلطنتیں ان کی وجہ سے برباد ہو گئیں۔ کیا ہمارے ماڈرن تعلیم یافتہ اور نفسیاتِ انسانی کے ماہر حُکام اتنا بھی نہیں کر سکتے کہ ان دشمنِ انسانیت چغل خوروں اور حقیقی وفادار کارکنوں میں تمیز کر کے ان کی باتوں پر کان دھرنے کی بجائے انہیں سخت سزائیں دیں اور کیفرِ کردار تک پہنچا کر اس بہت بڑی بُرائی کا قرار واقعی انسداد کریں۔

حسد: یہ نہایت بُری عادت ہے۔ حاسد دوسروں کو خوش دیکھ کر خواہ مخواہ دل میں جلتا رہتا ہے۔ جس سے خود اسی کو روحانی تکلیف ہوتی ہے، محسود کا کچھ بھی نہیں بگڑتا۔ حسد جب بڑھ جاتا ہے تو حاسد اپنے محسود کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرتا ہے اور اکثر اوقات کامیاب ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جس قوم میں ایسے لوگوں کی تعداد زیادہ ہو گی وہ قوم تباہ ہو جائے گی۔ اِس لیے اگر قومی ترقی چاہتے ہو تو حسد سے باز رہو اور اللہ کا یہ حکم یاد رکھو کہ ”خدا نے تم میں سے ایک دوسرے کو جو برتری دے رکھی ہے اس کا کچھ ارمان نہ کرو، مَردوں نے جیسی کمائی کی ہو ان کا حصّہ ہے اور عورتوں نے جیسی کمائی کی ہے ان کا حصّہ ہے، ہر وقت اللہ سے

اس کے فضل کے طالب رہو وہ ہر چیز سے واقف ہے۔‘‘ (النسا:۵)

جھوٹ: جھوٹ اتنا بڑا گناہ اور اُس کے نقصانات اس قدر واضح ہیں کہ یہاں ان کا بیان کرنا تحصیلِ حاصل ہے۔ اِس لیے ہم صرف ایک بات کہتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ اگر تمام دُنیا میں بالاتفاق ایک انٹرنیشنل ہفتہ جھوٹ کا منایا جائے اور اُس ہفتہ میں کوئی شخص بھی کہیں اور کبھی سچ نہ بولے تو خود غور کر لیجئے کہ اُس ہفتہ کے اختتام پر کیا یہ دُنیا یہی رہے گی۔

لحاظ و مروّت: لحاظ و مروّت نہایت ہی نیک عادت اور شرافت کی علامت ہے۔ لیکن ہماری قوم نے جہاں اور خوبیوں کو بُرائیوں میں بدل لیا ہے، لحاظ و مروّت بھی اسی طرح کیا جاتا ہے کہ بجائے فائدے کے نقصان دیتا ہے۔ لحاظ و مروّت یہ ہے کہ اگر کسی سے کوئی غلطی ہو جائے تو چشم پوشی کرو تا کہ وہ شرمندہ نہ ہو۔ مقروضوں سے تقاضا میں سختی کرتے ہوئے شرم محسوس کرو، اُن کے پاس روپیہ نہ ہو تو نرمی سے درگزر کرو۔ کوئی سوال کرے تو ٹالتے ہوئے شرم آئے۔ اس سے بھی زیادہ یہ کہ اگر کوئی سختی سے پیش آئے تو جواب میں سختی نہ کر سکو۔ یہ سب اچھی باتیں ہیں لیکن لحاظ و مروّت کے یہ معنی نہیں ہیں کہ کوئی تمہیں نقصان پر نقصان اور تکلیف پر تکلیف پہنچاتا رہے اور تم لحاظ و مروّت کی وجہ سے مداوا بھی نہ کرو۔ ہمارے شرفاء میں جس قسم کا لحاظ و مروّت اب تک رائج تھا اس کی ایک مثال سنئے، ایک نواب صاحب کے دانت میں درد تھا، جب کسی طرح آرام نہ ہوا تو ایک مشہور انگریز ڈاکٹر کو بلایا، ڈاکٹر نے معائنہ کے بعد کہا کہ دانت اکھاڑنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں ہے۔ نواب صاحب درد سے بیتاب تھے فرمایا ’’بہت اچھا نکال لیجئے‘‘۔ ڈاکٹر نے تمام ضروری سامان مطب سے اٹھوا کر نواب صاحب کے محل میں منگایا اور ضروری تدابیر و احتیاط کے ساتھ دانت اکھاڑ کر واپس چلا گیا۔ نواب صاحب کو دانت نکلوانے میں سخت تکلیف ہوئی

اور ڈاکٹر کے جانے کے بعد بھی کوئی آرام نہ آیا۔ اس پر ایک مصاحب بولا کہ حضور سو روپیہ تو آپ نے اس کو فیس کے دیئے، اتنا خون نکلا اور اس قدر تکلیف ہوئی، کیا فائدہ ہوا اس انگریز ڈاکٹر کو بلانے سے۔ نواب صاحب نے نہایت آہستہ سے جواب دیا کہ اس میں ڈاکٹر بیچارے کا کوئی قصور نہیں خطا میری ہی ہے۔ مصاحب نے حیران ہو کر پوچھا وہ کس طرح؟ نواب صاحب بولے اس نے بجائے بیمار دانت کے اچھا دانت اکھاڑ لیا اور میں نے بتایا نہیں۔ مصاحب نے اور بھی حیران ہو کر پوچھا یہ کیوں؟ نواب صاحب نے فرمایا ''بھئی مجھے تو لحاظ آیا کہ اُس کی غلطی اسے بتاؤں گا تو بے چارہ شرمندہ ہوگا''۔ تو جناب ایسا لحاظ و مروّت تو دُنیا میں کہیں بھی جائز نہیں ہوسکتا۔

عجز و انکساری: عجز و انکساری بھی ایک اچھی عادت ہے لیکن صرف اسی وقت جب اس میں ریا کاری اور تصنّع نہ ہو۔ عجز و انکساری یہ ہے کہ جو لوگ مرتبہ، علم اور دولت اور وجاہت وغیرہ میں تم سے کمتر ہوں ان سے جب ملو اس طرح ملو کہ انہیں اپنی کمتری کا احساس نہ ہو۔ اگر وہ تمہارے پاس آئیں تو ان سے عزّت و محبت کا سلوک کرو، پاس بٹھاؤ، ساتھ کھلاؤ اور بے تکلفی سے پیش آؤ۔ اگر تم اُن کے گھر جاؤ تو ان کے بوریئے یا پھٹی ہوئی دری پر بیٹھنا اور ان کی چٹنی روٹی کھانا تم کو ذرا بھی ناگوار نہ ہو۔ یاد رکھیئے کہ یہ غریب لوگ اس کے سوا اور کچھ نہیں چاہتے کہ اُمراء اور حُکّام وغیرہ ان سے میٹھی زبان بولیں اور عزت کا برتاؤ کریں۔

اگر ہمارے اُمراء اور حُکّام صرف اتنا ہی کریں تو کمیونزم کا خطرہ بقدر پچاس فیصدی کم ہو جائے۔ عجز و انکساری یہ ہرگز نہیں ہے کہ مُسمُسا سا منہ بنا کر بولو اور مصنوعی حرکات سے اپنے کو ذلیل و حقیر ظاہر کرنے کی کوشش کرو، یا اگر تم سے تمہارے مرتبہ علم یا دولت وغیرہ کے متعلق پوچھا جائے تو حقیقت کو چھپانے اور اپنی کمتری کو ظاہر کرنے میں اتنا مبالغہ کرو کہ بات

ریاکاری اور جھوٹ تک پہنچ جائے۔

اب سے پچاس سال پہلے کا ذکر ہے کہ بورڈ آف اگزامنر کے سیکرٹری (جو کرنل تھا) کو ایک ایسے شخص کی ضرورت پیش آئی جو اُردو اور انگریزی دونوں کا ماہر ہو۔ دریافت کرنے پر ایک ایسے مولوی صاحب کا پتہ لگا جو صرف اُردو اور انگریزی ہی نہیں بلکہ فارسی اور عربی کے بھی فاضل تھے۔ چنانچہ مولوی صاحب کو لکھا گیا کہ اگر آپ چاہیں تو ہم آپ کو بورڈ آف اگزامنر میں ایک معقول اسامی دے سکتے ہیں، انٹرویو کے لیے تشریف لے آئیے۔ اس زمانہ میں بورڈ آف اگزامنر کا دفتر کلکتہ میں تھا، مولوی صاحب کلکتہ گئے اور کرنل صاحب کی کوٹھی پر پہنچ کر اپنا کارڈ بھیجا۔ کرنل خود باہر نکل آیا اور مولوی صاحب کو بہ عزّت و اکرام ساتھ لے جا کر کمرے میں بٹھایا، اِدھر اُدھر کی رسمی گفتگو کے بعد کرنل نے کہا میں نے سنا ہے کہ آپ اُردو، فارسی، عربی اور انگریزی کے فاضل اَجلّ ہیں۔ ہمیں ایک ایسے ہی آدمی کی ضرورت ہے۔ مولوی صاحب اگرچہ واقعی چاروں زبانوں کے ماہر تھے مگر اپنی لیاقت کا ذکر اپنے منہ سے کس طرح کر سکتے تھے، از راہِ انکسار فرمانے لگے نہیں حضور میں تو بہت معمولی سا علم رکھتا ہوں۔ کرنل بولا نہیں نہیں مجھ کو فلاں صاحب نے بتایا ہے اور آپ کی فضیلت کی بڑی تعریف کی ہے۔ مولوی صاحب نے جواب دیا یہ ان کا حُسنِ ظن ہے جو ایسا فرماتے ہیں ورنہ من آنم کہ من دانم، کہاں میں اور کہاں فضل و کمال۔ اس کے بعد کرنل صاحب نے اور بھی کئی معززین کا حوالہ دیا کہ فلاں فلاں نے بھی آپ کے علم و فضل کے بارے میں یہی کہا ہے، لیکن مولوی صاحب ہر مرتبہ انکار اور اپنی ہیچ مدانی کا اظہار فرماتے رہے۔ جب کافی دیر ہوگئی تو کرنل نے کہا اچھا میں سمجھا، وہ کوئی اور صاحب ہوں گے جن کی بابت مجھے اطلاع دی گئی تھی، معاف کیجئے گا سخت غلط فہمی ہوئی اور آپ کو ناحق تکلیف دی گئی آپ دفتر سے آمد و

رفت کا کرایہ لیں اور تشریف لے جائیں۔ ساتھ ہی اس نے گھنٹی بجائی اور چپراسی کو بلا کر کہا مولوی صاحب کو دفتر کا راستہ دکھاؤ۔ اس پر مولوی صاحب بہت سٹپٹائے اور کچھ کہنا چاہا مگر کرنل نے بات نہیں کی اور مولوی صاحب بے نیلِ مرام واپس آئے، تو ایسی بھی عجز و انکساری کیا۔ عجز و انکساری تو صرف یہ ہے کہ قول و فعل اور حرکات و سکنات میں رعونت، خشونت اور تکبّر و غرور نہ پایا جائے۔

کِبر و غرور: غرور بہت ہی سخت بُرائی ہے۔ افراد اور جماعتوں کے افتراق اور تباہی کے اسباب میں یہ ایک بڑا سبب ہے۔ غرور یہ نہیں کہ تم اچھا کھاؤ، اچھا پہنو، عالیشان مکانوں میں رہو، عمدہ سواریاں اور بہت سے نوکر چاکر رکھو۔ غرور یہ ہے کہ دوسروں کو اپنے سے گھٹیا اور ذلیل و حقیر جانو، ان سے ملنا اور سیدھے منہ بات کرنا اپنے لیے باعثِ عار سمجھو اور ان کو اپنے پاس بٹھانے میں شرم محسوس کرو۔ اللہ تعالیٰ تو فرماتا ہے:

اِنَّ اَکۡرَمَکُمۡ عِنۡدَاللّٰہِ اَتۡقٰکُمۡ (الحجرات ۱۳)

یعنی خدا کے نزدیک تم میں زیادہ عزت والا وہ ہے جو زیادہ پرہیز گار ہے۔

اور تم باوجود گناہ گار ہونے کے اپنے آپ کو شریف اور دوسرے غریب لیکن نیک لوگوں کو ذلیل خیال کرو۔ غرور ان چیزوں سے پیدا ہوتا ہے: جسمانی طاقت، دولت، حُسن، منصب، ذات پات، عبادت اور روحانی بزرگی۔ یاد رکھو یہ سب چیزیں فانی ہیں، باقی رہنے والی صرف نیکی اور نیک نامی ہے۔ مغرور آدمی نہ تو نیک ہوتا ہے نہ نیک نام، نہ خدا اُس کو پسند کرتا ہے نہ دنیا۔ سب سے خطرناک قسم کا غرور وہ ہے جو روحانی بزرگی یا عبادت پر ہو، اکثر سالک اِس لیے مردود ہو جاتے ہیں اور ناکام رہتے ہیں کہ وہ اپنے کشف و کرامات پر مغرور ہو کر دوسروں کو اپنے سے کمتر حقیر و ذلیل سمجھنے لگتے ہیں۔ ایسے عابد و زاہد جن کو حکمت

وسلوک سے کوئی حصّہ نہ ملا ہو اور جنہوں نے تزکیۂ اخلاق نہ کیا ہو اور دوسروں کو گنہگار اور اپنے آپ کو جنت کا ٹھیکیدار سمجھ کر غرور کرتے ہیں، ان کا سب زہد وتقوی محض غرور کی وجہ سے خاک میں مل جائے گا اور کسی کام نہ آئے گا۔ یہ لوگ اتنا نہیں سمجھتے کہ ہم جن کو ذلیل وحقیر سمجھتے ہیں ممکن ہے ان کا کوئی نیک عمل اللہ کو پسند ہو۔ کِبر تو صرف کِبریا ہی کو سزاوار ہے، بندہ سراسر عاجز اور گنہگار ہے۔ اللہ ہی جانے ہم دن میں کتنے گناہ کرتے ہیں جو ہمیں محسوس بھی نہیں ہوتے، اِس لیے کسی چیز پر کبھی غرور نہیں کرنا چاہئے اور ہمیشہ اللہ سے ڈرتے رہنا چاہئے۔ غرور کا علاج یہ ہے کہ جب تمہیں اپنی برتری کا احساس ہو تو اپنے سے بہتر لوگوں پر نظر کرو اور جب احساسِ کمتری ستائے تو اپنے سے کمتر لوگوں کو دیکھو۔

قناعت: قناعت بہت ہی اچھی صفت ہے لیکن آج کل اس کے معنی بھی صبر و توکّل وغیرہ کی طرح غلط سمجھے جاتے ہیں۔ قناعت یہ نہیں ہے کہ جو کچھ میسّر ہے اس سے زیادہ حاصل کرنے کی کوشش نہ کرو اور دل میں اللہ سے شکایت اور ناشکری کے جذبات لیے، جلتے اور کڑھتے رہو۔ قناعت یہ ہے کہ جس حال میں ہو سچ مچ خوش رہو اور آئندہ کے لیے برابر ترقی کی کوشش کرتے رہو اور امید رکھو کہ اللہ تعالیٰ تمہاری کوششوں کو ضرور بار آور کرے گا۔ جو آدمی ہر حال میں خوش رہتا ہے اس کے قوائے عمل کبھی سست اور مضمحل نہیں ہوتے۔ وہ جو کچھ کرتا ہے پورے جوش کے ساتھ کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جو کام بے دلی اور سُستی سے کیا جاتا ہے، اس میں کامیابی نہیں ہوتی لیکن جو کام جوش اور خوشی سے کیا جاتا ہے اس میں اکثر کامیابی ہوتی ہے۔

معاملات اور اخلاق کا بیان ختم ہوا۔ اب ہم اس کتاب کی خاص خاص باتوں کا خلاصہ لکھتے ہیں تاکہ جو لوگ بار بار کتاب کو نہ پڑھ سکتے ہوں وہ صرف اس خلاصہ کو جب چاہیں پڑھ کر کتاب کی روح کو سمجھ لیں اور یاد رکھیں۔

خلاصۂ کتاب

۱۔ توحید: اللہ اور اس کی وحدانیت یعنی اس بات پر یقینِ محکم پیدا کرو کہ صرف اللہ ہی ایسا ہے جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا اور جیسا ہے ویسا ہی رہے گا۔ وہ اس کائنات کا خالق اور اس کی ہر چیز پر ہر طرح قادر ہے۔ وہ جسے چاہے امارت و غربت اور عزت و ذلّت دیتا ہے۔ افراد اور اقوام کو بنانا اور بگاڑنا اسی کے ہاتھ میں ہے۔ اسی نے انسان کو جس قدر چاہا اختیار دیا ہے اور جس قدر چاہا مجبور رکھا ہے۔ اس کے سوا نہ تو کسی سے ڈرنا چاہیے نہ کسی سے توقع رکھنی چاہیے۔ ہاں یہ ضرور ہے اس نے جس جس کو جو جو مراتب اور اختیارات عطا فرمائے ہیں ان سب کو اُنہی مدارج اور مراتب کے لحاظ سے اللہ کی مقرّر کی ہوئی حدود کے اندر مانو۔

۲۔ رسالت اور قرآن: اس بات پر یقینِ محکم پیدا کرو کہ محمدؐ اللہ کے آخری اور سچے رسول اور بندے ہیں اور قرآن اللہ کی آخری اور سچی الہامی کتاب ہے اور جیسی نازل ہوئی تھی آج تک اسی طرح ایک حرف یا زیر زبر کی کمی بیشی کے بغیر موجود ہے، اور اس کتاب کے تمام احکام پر پوری طرح عمل کرنے ہی سے دُنیا اور آخرت دونوں میں کامیابی اور کامرانی کی زندگی حاصل ہوتی ہے۔

۳۔ ایمانِ کامل پیدا کرنے کی ترکیب: توحید، رسالت اور قرآن کی صداقت پر ایمانِ کامل پیدا کرنے کی سب سے اچھی ترکیب یہ ہے کہ صرف احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰؐ کے کہنے سے ان تینوں باتوں کو بغیر کسی غور و فکر کے بے دلیل اور حجت مان لیا جائے۔ یاد رکھو دُنیا کی

تمام باتیں صرف دو طرح تسلیم کی جاسکتی ہیں یا تو خود آنکھوں سے دیکھ کر یا کسی ثقہ اور معتبر شہادت کی بنا پر۔ اب ظاہر ہے کہ دُنیا کی تمام چیزوں کو ہر ایک آدمی اپنی آنکھوں سے دیکھ ہی نہیں سکتا، اِس لیے لامحالہ شہادت پر یقین کرنا پڑتا ہے۔ خصوصاً جب کہ یہ شہادت متواتر اور ثقہ آدمیوں کی ہو، مثلاً لندن، پیرس اور نیویارک وغیرہ کو کروڑوں بلکہ اربوں آدمیوں نے نہیں دیکھا ہے، لیکن ان کی موجودگی پر تمام دُنیا محض اِس لیے یقین کرتی ہے کہ کچھ لوگوں نے ان کو دیکھا ہے اور وہ بہ تواتر بیان کرتے ہیں کہ یہ شہر موجود ہیں۔ اسی طرح اللہ، فرشتوں، جنت و دوزخ وغیرہ کی موجودگی کے بارے میں بہ تواتر ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبروں نے شہادت دی ہے کہ موجود ہیں۔ اور ان میں سب سے آخری شاہد وہ عالی شان پیغمبر اور رسولؐ ہے جس کی صداقت اور تقویٰ کے خلاف اس کے بدترین دشمن بھی اس کی موجودگی یا غیبت میں کبھی ایک لفظ نہ کہہ سکے۔

ایمانِ کامل پیدا کرنے کی دوسری ترکیب یہ ہے کہ اعلیٰ درجے کا علم حاصل کر کے اشیائے کائنات کی ساخت اور نظامِ عالم پر غور و فکر کیا جائے۔ زیادہ نہیں تو صرف انسان کی ساخت کا علمِ کامل بہم پہنچایا جائے۔ اس سے یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح ہو جائے گی کہ ایک ایسی ہستی ضرور موجود ہے جو اس تمام نظام کو ایک خاص حکمت و اعتدال کے ساتھ سنبھالے ہوئے ہے۔

تیسری ترکیب یہ ہے کہ آنکھوں سے دیکھ کر معرفتِ باری تعالیٰ حاصل کی جائے، اس کے لیے تصوّف کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے لیکن جو لوگ تصوّف کے ذریعہ ذاتِ باری تعالیٰ یا لطائفِ غیبی کا علم حاصل کرنا چاہتے ہیں، ان کو خوب اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہئے کہ تصوّف کا ہر وہ طریقہ جو خالص توحید کی تعلیم نہ دیتا ہو، غلط اور گمراہ کن ہے۔ اس پر عمل کرنے

سے حصولِ معرفت کی بجائے شرک وکفر کی تاریکیوں میں پھنس کر رہ جاؤ گے اور مرنے کے بعد پچھتاؤ گے، تصوّف کے یہ طریقے قطعاً غیر اسلامی ہیں۔ جو پیر فقیر ان طریقوں کی تعلیم دیتے ہیں وہ مسلمانوں کو مشرک اور کافر بناتے ہیں اور ملّتِ اسلامیہ کو تباہ کرتے ہیں۔ اگر تم ان لوگوں سے کشف وکرامات بھی سرزد ہوتی دیکھو تب بھی ان کا یقین نہ کرو کیونکہ کشف و کرامات جیسی خوارقِ عادات تو راہبوں، جوگیوں، نجومیوں، رمّالوں، پامسٹوں، مسمرائزروں، ہپنوٹائزروں، عُلوی وسِفلی عاملوں اور جادوگروں سے بھی سرزد ہوتی ہیں۔ مسلمان اولیاء اور بزرگوں کی سب سے بڑی پہچان یہ ہے کہ اُن کی تعلیم قرآن وسنت کے مطابق ہوتی ہے اور اُن کا اخلاق، اخلاقِ محمدیؐ۔ ان بزرگوں کی سب سے بڑی کرامت یہ ہے کہ کیسا ہی گناہگار اور فاسق وفاجر مسلمان ان کے پاس بیٹھے وہ محض ان کے اثرِ صحبت سے اُن ہی جیسا نیک اور بزرگ بن جاتا ہے۔ یہ کرامت ایک ولی کے سوا اور کوئی نہیں دکھا سکتا۔

۴۔ **عبادت:** تمام عبادات پر قرآن و احادیث کے مطابق سختی سے پابند رہو، خصوصاً نماز ایسی پڑھو جس میں شروع سے آخر تک عجز وانکساری، خشوع وخضوع اور اللہ کی یاد برابر قائم رہے، مگر یہ بات صرف اُسی حالت میں حاصل ہوسکتی ہے جب کہ تم چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے ہر وقت اللہ کو یاد رکھو۔ یاد رکھو کہ جو خیالات دماغ میں ہر وقت بھرے رہتے ہیں، تنہائی اور ارتکازِ خیال کے وقت وہی بار بار اُبھرتے ہیں۔ پس جو لوگ ہر وقت اللہ کو یاد رکھیں گے، نماز میں بھی ان کو اللہ ہی یاد آئے گا اور یہی وہ نماز ہے جو اخلاق کو سدھارتی ہے اور بُرائیوں سے بچاتی ہے۔

۵۔ **بُرائیوں کی نفی:** غصّہ، نفرت، غیبت اور بدگمانی کے جذبات کو دل سے بالکل نکال دو، ان سے خود تمہارے دل ودماغ کو تکلیف ہوتی ہے، اس آدمی کا کچھ نہیں بگڑتا جس کے

خلاف تم یہ جذبات رکھتے ہو۔ لوگوں کی بُرائیوں کو دیکھ کر تمہارے دل میں نفرت کا نہیں بلکہ رحم کا جذبہ پیدا ہونا چاہیے۔ بُرائی کی وجہ سے کسی سے نفرت نہ کرو، اُن کی بُرائیوں کے متعلق قیامت میں تم سے سوال نہ کیا جائے گا، اُنہی سے پوچھا جائے گا۔ البتہ اس نفرت کی وجہ سے تمہارے دل میں جو کثافت پیدا ہوگی وہ مرنے کے بعد تمہیں سخت تکلیف پہنچائے گی۔ کسی کے ساتھ بُرائی نہ کرو، جو آدمی تمہارے ساتھ بُرائی کرے اس کا جواب ہمیشہ نیکی سے دو، یہاں تک کہ وہ تمہارا دوست بن جائے۔ بہتر یہ ہے کہ کسی کی بُرائیوں پر نظر ہی نہ کرو صرف خوبیوں کو دیکھو۔

۶۔ **محبت و صداقت**: اپنے دل میں تمام مخلوقِ خدا کے لیے محبت کا جذبہ پیدا کرو اور ہر کام حق و صداقت سے انجام دو، اس سے تمہارے قلب و روح کو بڑا اطمینان ملے گا، مگر جب فرائض منصبی کا تقاضا ہو تو اپنے محبوب ترین آدمی کو بھی سزا دینے میں تامل نہ کرو۔ یاد رکھو کہ اسلام نے دوسرے مذاہب کے لوگوں سے بھی محبت اور رواداری سے پیش آنے کا حکم دیا ہے، اس حکم کی پوری تعمیل کرو۔ لیکن جب ان غیر مسلموں سے کسی مسلمان یا تمہارے مذہب و مِلّت کو خطرہ ہو تو اس وقت محبت اور رواداری کرنا خلافِ حق ہے۔ ایسے موقعوں پر محبت اور رواداری کو قطع کر کے ان لوگوں کے مقابلہ پر ڈٹ جاؤ اور اس وقت تک مقابلہ کرتے رہو جب تک خطرے کا قطعی استیصال نہ ہو جائے۔

۷۔ **حقوق العباد**: ماں باپ، بہن بھائی، بیوی بچّوں، عزیز و اقارب، ہمسایوں، شہریوں اور اہلِ مُلک و مِلّت کے جو حقوق تمہارے ذمہ ہیں، خوش اسلوبی اور خوش اخلاقی سے کماحقّہٗ ادا کرو۔ اسی طرح وہ اتّحاد پیدا ہو سکتا ہے جو قوموں کی بقائے دوام کا باعث اور ضامن

ہے۔

۸۔ **عمل**: اپنی اوراپنے متعلقین کی بقائے حیات کے لیے خود کام کرو۔ اپنا بوجھ کسی دوسرے پر ہرگز نہ ڈالو، یہ سب سے بڑی بے حیائی ہے۔ جو کام شرعاً جائز ہو اُسے ہرگز ذلیل اور بُرا نہ سمجھو، مُلک اور قوم کی بہبود کے لیے کام کرنا عبادت ہے۔ یقین جانو کہ ہرقسم کا رنج اور فکر صرف کام کرنے ہی سے دُور ہوتا ہے اور صحت، عزت، دولت اور راحت صرف کام کرنے ہی سے ملتی ہے۔ جب شش جہت میں مایوسی کے بادل چھائے ہوئے ہوں، چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا نظر آتا ہو اور خودکشی کرنے کو دل چاہتا ہو، اس وقت کام میں مصروف ہوجاؤ اور کام کرتے رہو، کرتے رہو، یہاں تک صبحِ مسرّت کا آفتابِ عالمِ تاب اپنی نورپاشیوں سے تمہارے دامنِ مراد کو مالا مال کردے۔

۹۔ **تقدیر**: تقدیر کے عقیدے کو غلط طریقے پر ماننے سے بُزدلی اور بے عملی پیدا ہوتی ہے۔ اِس لیے تقدیر کو ہمیشہ عمل کے ساتھ مانو، بے عملی کے ساتھ ہرگز نہ مانو۔ یقین رکھو کہ موت کا جو وقت مقرّر ہے اس سے ایک سیکنڈ پہلے آسکتی ہے نہ بعد میں، اِس لیے کتنا ہی مشکل کام ہو، اس کے خطرات کی پروا نہ کرو، اللہ کے توکل پر اُسے انتہا تک پہنچانے کی کوشش میں مصروف رہو، پھر بھی ناکامی ہو تو بھی خوش رہو اور یقین رکھو کہ اس ناکامی میں بھی اللہ کی کوئی مصلحت تمہارے لیے مضمر ہے۔

۱۰۔ **حُسنِ اخلاق**: تمام علم وتربیت، فضل وکمال، زہدوتقوی، عبادت وریاضت اور ولایت ومعرفت کا نتیجہ یہ ہونا چاہئے کہ آدمی حُسنِ اخلاق کا پُتلا اور رحم وکرم کا مجسّمہ ہو۔ جب تک یہ نہ ہوگا ہم کتنی ہی نمازیں پڑھیں، روزے رکھیں، حج کریں یا زکوٰۃ دیں، ملّت اپنا کھویا ہوا مقام حاصل نہیں کرسکتی۔ اِس لیے ضروری ہے کہ عبادات کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ ہر

مسلمان حسنِ اخلاق یا اخلاقِ کامل پیدا کرنے کو اپنے اوپر لازم قرار دے لے۔ حُسنِ اخلاق صرف ان باتوں میں مضمر ہے کہ اوّل تمہارے کسی قول وفعل یا حرکت سے کسی انسان کو رنج، تکلیف یا نقصان نہ پہنچے، سوائے اس حالت کے جب تم پر ظلم ہو رہا ہو یا تم کو فرائض کی بجا آوری میں حق کی خاطر ایسا کرنا پڑے۔ دوسرے یہ کہ ہمیشہ خوش رہو اور دوسروں کو خوش رکھو، ہر ایک کو خوش رکھنا بہت مشکل ہے، تمہارا کام صرف کوشش کرنا ہے، اگر سب نہیں تو زیادہ سے زیادہ لوگ تو خوش رہ سکیں گے۔

۱۱۔ خدمتِ خلق: خدمتِ خلق ہی سب سے بڑی نیکی، عبادت اور سراسر ''تعمیرِ ملت'' ہے۔ اِس لیے اپنے مقدور اور استطاعت کے مطابق ہمیشہ خدمتِ خلق کرتے رہو۔ یاد رکھو تمام قوم میں خدمتِ خلق کا جذبہ ہوگا تو بہت سے آدمی تمہاری بھی خدمت کریں گے اور تم کو مدد دیں گے۔ عوام کے لیے خدمتِ خلق کی چھوٹی چھوٹی باتیں بھی بڑا درجہ رکھتی ہیں، مثلاً کسی کو پانی پلا دینا، راستہ بتا دینا، بوجھ اٹھا دینا، راستہ سے پتھر یا کانٹے دُور کر دینا معمولی باتیں نہیں ہیں۔ ان سے بڑے دُور رَس نتائج نکلتے ہیں۔ خواص اور صاحبِ استطاعت حضرات خدمتِ خلق کے ذریعہ مُلک وقوم کو بے حد طاقتور بنا سکتے اور ترقی کے چرخِ چہارم پر پہنچا سکتے ہیں۔ ترقی یافتہ ممالک کی طاقت کا راز اسی میں پوشیدہ ہے۔ لیکن خواص کی خدمات سے مُلک وقوم کو فائدہ صرف اسی حالت میں پہنچ سکتا ہے جب کہ یہ خدمات خلوص کے ساتھ قومی بہبود کے لیے ہوں، ذاتی اعزاز و افتخار کے لیے نہ ہوں۔ ہماری بدنصیبی کہ ہمارے اکثر زعماء اور اُمراء میں خلوص کا مادّہ بالکل نہیں ہے۔

الحمدللہ کہ کتاب ختم ہوئی، اب ہم قوم کی ان بُرائیوں کو دُور کرنے کے طریقے یعنی علاج لکھتے ہیں۔

عِلاج

اس سوال کا جواب کافی تفصیل سے دے دیا گیا کہ ہمارے زوال کی وجوہات کیا ہیں اور یہ بھی بتا دیا گیا کہ ہمیں اپنی اصلاح کے لیے کیا کرنا چاہئے۔اب سوال صرف یہ رہ جاتا ہے کہ اس اصلاح یا تعمیرِ نَو کے طریقے کیا ہو سکتے ہیں۔ بظاہر اس کے دو ہی طریقے ممکن ہیں۔ اوّل یہ کہ ہماری حکومت خود یہ کام کرے، دوسرے یہ کہ مُلک کی طاقتور اور مشہور جماعتیں اسے اپنے ہاتھ میں لیں۔لیکن حکومت ہو یا جماعتیں، ان سب کے اربابِ اختیار کی بھاری اکثریت نے قیامِ پاکستان سے اب تک مُلک و ملّت کی طرف سے جس غفلت و بے پروائی کا ثبوت دیا ہے اور اپنے ذاتی اقتدار اور منفعت کے حصول کی خاطر جس اخلاقی فرومائیگی کا مظاہرہ کیا ہے اس کے پیشِ نظر ان سے یہ امید رکھنا کہ وہ ملّت کے ''اخلاق'' کی اصلاح کے لیے کوشش کریں گے، بیکار محض ہے۔اس کے بعد لے دے کے صرف یہ طریقۂ کار باقی رہ جاتا ہے کہ ہر شخص جو اپنی قوم کی اصلاح کرنا چاہتا ہے، پہلے خود اپنی اصلاح کرے اور اس کے بعد اپنے اہل و عیال، قریبی رشتہ داروں اور اُن دوستوں کی جو اس کے زیرِ اثر ہوں۔اس طرح کچھ عرصہ میں ان اصلاح یافتہ لوگوں کی ایک معقول جماعت وجود میں آجائے گی۔ پھر وہ جماعت اجتماعی طور پر یہ کام اپنے ہاتھ میں لے کر کامیابی سے آگے چلا سکے گی۔اس کے علاوہ ایک اور بہت اچھی اور قابلِ عمل تدبیر مدّت سے ہمارے ذہن میں ہے لیکن یقین نہیں آتا کہ اس پر عمل ہو سکے تاہم بیان کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے

شاید کچھ اللہ کے بندے ایسے موجود ہوں یا پیدا ہو جائیں جو کسی وقت اس پر عمل کر سکیں۔ وہ تدبیر یہ ہے کہ مُلک میں ایک ایسی آل پاکستان جماعت بنائی جائے جس میں تمام مذہبی فرقوں کے پیشوا اور تمام مذہبی، سیاسی اور معاشرتی جماعتوں کے صدر، سیکرٹری اور منتخب نمائندے بحیثیت ممبر کے شریک ہوں۔ اس کی تشکیل یو۔این۔او کی ساخت پر کی جائے۔ اس کا مقصد اور موقف صرف اہلِ مُلک کی اخلاقی اصلاح تک محدود ہو۔ مذہبی، سیاسی، معاشرتی یا دوسرے اختلافی مسائل کا اس میں ذکر کرنا بھی منع ہو۔ اگر آپ غور کریں تو معلوم ہوگا کہ صرف اخلاق ہی ایک ایسا متفق علیہ موضوع ہے جس پر تمام فرقے اور جماعتیں شدید مذہبی، سیاسی اور معاشرتی اختلافات کے باوجود ہر لحاظ سے بالکل ہم آہنگ اور متفق ہیں۔ یعنی اخلاقی نقطۂ نظر سے جو باتیں بری ہیں وہ سبھی کی نظر میں بُری ہیں اور جو باتیں اچھی ہیں وہ سبھی کی نظر میں اچھی ہیں۔ اُس جماعت میں صرف وہ طریقے سوچے اور عمل میں لائے جائیں جن سے ہر فرقہ کے افراد کا اخلاق، اخلاقِ محمدیؐ کا نمونہ بن جائے۔

اُس جماعت میں بُنیادی اختلافات کا نام ونشان بھی نہ ہوگا۔ صرف کام کرنے کے طریقوں پر شاید کچھ اختلافات پیدا ہوں مگر وہ اتنے شدید ہرگز نہ ہوں گے کہ ایک فرقے کو دوسرے فرقے کا دشمن بنا دیں۔ علاوہ ازیں ایسے اختلافات کا حل تجویز کر لینا بھی کچھ زیادہ مشکل نہ ہوگا۔ اِس لیے ہماری آنکھیں دیکھ رہی ہیں کہ اُس جماعت کے جلسوں کا ماحول بڑا ہی پُرسکون اور محبت واخوت کے نظاروں سے معمور ہوگا اور وہاں ہمارے علماء، زعماء اور رہنما باوجود فرقہ ورانہ اختلافات کے آپس میں مل جل کر ہمدردی اور محبت و یک جہتی کے جذبات سے اختلافی معاملات کو سلجھانے کی تربیت حاصل کر سکیں گے۔ اگر کسی طرح یہ جماعت وجود میں آئے اور یہ کام ہو جائے تو اس سے ہمارے افراد کی اس حد تک

اصلاح ہوجائے گی کہ وہ قوم کے عام فائدے کے لیے ایک ہی زاویۂ نظر سے سوچنا اور کام کرنا سیکھ جائیں گے۔اس طرح باہمی مخاصمت اور عناد و فساد کا جذبہ بہت کم اور تخریبی افکار و افعال کا خاتمہ ہوجائے گا اور قوم ہر لحاظ سے ترقی کے میدان میں آگے بڑھتی چلی جائے گی۔ کاش کچھ اہلِ دل اور صاحبِ دماغ حضرات ہماری اس تجویز کے فوائد اور اسرار و غوامض کو اچھی طرح سمجھ کر آگے بڑھیں اور ملّتِ اسلامیہ کی بقا کے لیے یہ کام اپنے ہاتھ میں لے کر بسم اللہ کریں، آمین۔

فرہنگ

الفاظ	معانی

﴿ ا ﴾

آفرینش	پیدائش۔مخلوق۔دنیا
اَبجد	کسی فن یا علم کی ابتدائی باتیں
اَجیرَن	ناگوار۔وہ کام جو مشکل سے تمام ہو
اَجَلّ	جلیل القدر۔ذیشان
اِختراع	ایجاد کرنا۔نئی راہ نکالنا
اِختلاط	میل جول۔میل ملاپ
اَدوار	دَور کی جمع۔مدّتیں
اَدیان	دین کی جمع۔مذہب
اِرتباط	ربط ضبط۔میل ملاپ۔دوستی
اِرتداد	مرتد ہونا۔اسلام چھوڑ دینا
اَرواحِ مجرّدہ	تنہا روحیں
اژدھام	بِھیڑ۔مجمع
اِستثناء	علیحدہ کرنا۔الگ کرنا
اِستدلال	دلیل۔دلیل چاہنا۔دلیل لانا

الفاظ	معانی
اِستعداد	لیاقت۔قابلیت
اِستغراق	محویّت۔کسی خیال میں ڈوب جانا
اِستقرار	قائم ہونا۔ٹھہرنا
اِستنباط	(اِس۔تم۔باط) نتیجہ اخذ کرنا
اِستیصال	جڑ سے اُکھیڑنا
اَسرار	بھید۔پوشیدہ باتیں
اِشتہا	خواہش۔بھوک
افادت	نفع ہونا
افتراق	اختلاف۔جُدائی
افراط	زیادتی۔فراوانی۔حدِّ اعتدال سے بڑھ جانا
اقران	قرن کی جمع۔زمانے
اَقل	بہت تھوڑا
اِکتشاف	نامعلوم بات کا دریافت کرنا۔ایجاد (جمع اِکتشافات)
اِلتزام	کسی بات کو لازم کرلینا
اِلحاد	دینِ حق سے پھر جانا۔سیدھے رستے سے کترا جانا
الشّاذ کالمعدوم	کمیاب اور قلیل الوجود نہ ہونے جیسا ہوتا ہے
اَماکن	مکان کی جمع۔مقامات۔جگہیں
اِمتداد	طوالت۔درازی۔مدّت۔لمبائی

الفاظ	معانی
اِنحطاط	کمی ۔گھٹاؤ
اِنسداد	روک تھام
اِنصرام	بندوبست ۔انتظام
انگُشت بدنداں ہونا	دانتوں میں انگلی دینا۔حیرت
اِنہماک	محویّت ۔مصروفیت
اوطان	وطن کی جمع ۔دیس
اِیضاح	وضاحت کرنا۔ظاہر کرنا

ب

الفاظ	معانی
بادیٔ النّظر	سرسری نظر سے ۔ابتدائی نظر میں
بار آور	نتیجہ خیز۔پھل لانے والا
بچشمِ خود	اپنی آنکھوں سے
بَداُسلوب	بےڈھنگا
بدرجۂ اُتم	کامل درجے کا
بدرَقہ	وہ دوا جو سابق دوا کا اثر تیز کرنے کیلئے دی جائے۔
بَرانگیختہ	بھڑکایا ہوا۔مشتعل
بَربَریّت	وحشی پن ۔خونخواری
بزُعمِ خود	اپنے گمان سے
بسائط	بسیط کی جمع

الفاظ	معانی
بَسط	کشادگی۔تفصیل۔تشریح
بسیط	وسیع۔پھیلا ہوا
بُطلان	تردید۔ضائع ہونا
بگوشِ خود	اپنے کانوں سے
بِلا تعوق	بِلا تاخیر
بنوکِ شمشیر	تلوار کے زور پر۔زبردستی
بہائم	جانور۔چوپائے
بہیمیت	حیوانیت
بے برگ وگیاہ	گھاس اور پتّوں کے بغیر
بے بہرہ	محروم۔بے نصیب
بے کم وکاست	بالکل درست۔ٹھیک ٹھیک
بینُ المِلّی	ملت کے درمیان
بے نیلِ مرام	ناکام ونامراد۔مقصد حاصل کیے بغیر پہنچنا
بے ہنگام	بے وقت۔بے موقع
بے ہنگم	بھونڈا۔غیر موزوں

پ

پاسنگ	جُزوی۔تھوڑا سا
پرتَو فگن	سایہ ڈالنے والا

الفاظ	معانی
پردۂ سیمیں	نقرئی پردہ۔سینما کی سکرین
پرِ کاہ	بہت ہلکا
پہنائی	چوڑائی۔فراخی
پیش پا اُفتادہ	نہایت معمولی۔سامنے کی بات
پیشِ نظر	نگاہ کے سامنے

ت

الفاظ	معانی
تارِ عنکبوت	مکڑی کا جالا
تتبّع	تقلید۔پیروی۔نقل
تحصیلِ حاصل	موجود چیز کی تلاش۔بے فائدہ تگ و دو
تخلیہ	تنہائی۔خالی کرنا
تُرکتاز	لٹیرا۔قزاق
ترمیم	اصلاح۔تبدیلی
تزئین	زیب و زینت۔سجاوٹ۔بناؤ سنگھار
تعدُّد	تعداد میں ایک سے زیادہ ہونا۔
تعویق	دیر۔ٹال مٹول
تَعیُّنات	تعین کی جمع۔تقرر۔فرض۔مخصوص کرنا
تقرّب	نزدیک ہونا
تملُّق	نرمی۔ملائمت۔خوشامد

الفاظ	معانی
تُند خُو	بد مزاج۔ جلد ناراض ہونے والا
تَندہی	محنت۔ جانفشانی
تنزّل	زوال۔ کمی۔ اُتار
تَنسیخ	منسوخ کرنا
تہدید	تنبیہ۔ ڈرانا۔ گھُرکی

ٹ

ٹکلیاں	دھات کا چھوٹا سا گول ٹکڑا

ج

جاگُزیں	گھر کئے ہوئے۔ بسا ہوا
جبر و اکراہ	سختی۔ مجبوری اور ناخوشی
جبلّی	فطری۔ پیدائشی
جُز وِلاینفک	وہ حصّہ جو علیحدہ نہ ہو سکے
جَنبہ داری (جَم۔ بہ)	طرفداری۔ حمایت

چ

چِٹھی رساں	ڈاکیا
چشم زدن	پلک جھپکتے۔ فوراً

ح

حاشیہ نشین	پاس بیٹھنے والا۔ مصاحب

الفاظ	معانی
حَیف	افسوس
خ	
خائن	خیانت کرنے والا۔ بددیانت
خداداد	منجانب اللہ۔ فطری قدرتی
خِرمن	انبار۔ غلے کا وہ ڈھیر جس سے بھوسہ الگ نہ کیا گیا ہو
خزف ریزہ	ٹھیکری کا ٹکڑا
خُسران	گھاٹا۔ نقصان
خشوع وخضوع	عاجزی۔ گڑگڑانا
خُشُونت	سختی۔ درشتی۔ تلخی
خَصُومَت	دشمنی۔ جھگڑا
خوارقِ عادت	خلافِ عادت باتیں۔ کرامتیں
خِیرہ	حیران وپریشان
د	
داد رسی	فریاد سننا ۔انصاف کرنا۔ انصاف۔ فریاد رسی
دُختر کُشی	بیٹیوں کا قتل
دُرِ یکتا	بے مثال موتی
دریوزہ گری	بھیک مانگنا۔ گداگری کا پیشہ
دَست بگریباں	لڑنا۔ ہاتھا پائی

الفاظ	معانی
دَستبُرد	لوٹ مار۔ خیانت
دَستبردار	چھوڑنے والا۔ باز رہنے والا
دَستگاہ	قدرت۔ مہارت
دَستِ نِگر	محتاج۔ حاجت مند
دستورالعمل	قاعدہ۔ قانون۔ اُصول
دقیقہ	کوئی بہت چھوٹی چیز۔ معمولی بات
دِگرگوں	اُلٹ پلٹ۔ تہ و بالا
دُوراُفتادہ	جو فاصلے پر واقع ہو۔ بہت دور کے
دُور رَس	دُور تک اثر انداز ہونے والا

ذ

ذاتِ بَحت	ذاتِ خداوندی۔ ذاتِ باری تعالیٰ

ر

رَطب اللِّسان	مدّاح۔ بہت تعریف کرنے والا
رُعُونت	غرور۔ شیخی
رُوگردانی	منہ پھیرنا۔ حکم عدولی کرنا۔ نافرمانی کرنا
رویَت	صورت کا نظر آنا۔ دیدار۔ نظّارہ
ریاکاری	مکّاری۔ فریب۔ نِفاق

الفاظ	معانی
﴿ ز ﴾	
زبُوں حالی	بُری حالت
زُعَما	زعیم کی جمع۔قائدین۔سرداران
زمانۂ حجریہ	پتھر کا زمانہ۔قدیم زمانہ
زمانۂ کہولت	بڑھاپا شروع ہونے کا وقت
﴿ س ﴾	
ساقِط	مُسترد۔نامنظورشدہ۔گِراہوا
سُبکی	رُسوائی۔ذِلّت
سدِّ باب	قطعی ممانعت۔قطعاً روک دینا
سربگریباں	سوچ بچار کی حالت۔شرمندہ
سریع الاثر	جلد اثر کرنے والا
سریع السّیر	تیز چلنے والا
سنگدل	بے رحم۔ظالم
سہلُ العمل	عمل میں آسان
سِیادت	سرداری۔بزرگی۔امامت
﴿ ش ﴾	
شاگرد پیشہ	نوکر چاکر۔خدمتگار
شَش جہت	چھ اطراف (مشرق،مغرب،شمال،جنوب،اوپر،نیچے)

الفاظ	معانی
شمّہ	قلیل مقدار۔ تھوڑی سی چیز
شیرازہ بندی	انتظام۔ جلد بندی
شیرِ بیشۂ وفا	وفا کے جنگل کا شیر
شہوات	شہوت کی جمع۔ خواہشیں۔ لذتیں

ص

الفاظ	معانی
صاحب الغرض مجنونٌ	غرض مند۔ دیوانہ ہوتا ہے
صَعُود	بلندی پر چڑھنا
صنّاعی	ہنرمندی
صُور و اشکال	صورتیں۔ شکلیں

ط

الفاظ	معانی
طَبائع	طبعیت کی جمع
طُرّۂ امتیاز	وہ خوبی جو پہچان یا فرق کا باعث ہو
طوائف الملوکی	بدنظمی۔ لاقانونیّت
طُومار	جھوٹ۔ لمبی کہانی۔ ڈھیر

ظ

الفاظ	معانی
ظُلمات	ظُلمت کی جمع۔ تاریکیاں۔ اندھیرے

ع

الفاظ	معانی
عَدیم النّظیر	بے نظیر۔ جس کے برابر کوئی نہ ہو

الفاظ	معانی
عَلَی الرَّغم	برخلاف۔ برعکس۔ باوجود اس کے
عیب جوئی	عیب ڈھونڈنا

غ

غایت	غرض۔ مطلب۔ انجام
غِلّ و غِش	کدورت۔ کینہ۔ کھوٹ
غور و خوض	سوچ وچار

ف

فاسد	خراب۔ ناقص
فائزالمرام، فائزالمراد	مُراد پانے والا۔ کامیاب
فِتنہ	جھگڑا۔ فساد۔ بغاوت
فرطِ گریہ	آہ وزاری کی زیادتی
فروتنی	عاجزی۔ مسکینی
فُروعی	غیر اہم۔ ضمنی
فروگذاشت	بھول چوک۔ چشم پوشی۔ کوتاہی۔ کمی۔ بُھول۔ غفلت
فِرومائیگی	کمینگی۔ کم ظرفی۔ گھٹیا پن
فِسق و فُجور	بدکاری۔ گنہگاری
فقید المثال	جس کی مثال نہ ہو۔ لاجواب

الفاظ	معانی
ق	
قحط الرّجال	قابل لوگوں کا نہ ملنا
قانع	قناعت کرنے والا۔ جو مل جائے اس پر راضی رہنے والا
قبیح	نامناسب۔ شرمناک۔ نازیبا
قِرطاس	کاغذ
قرونِ اُخریٰ	آخری زمانہ
قرنِ اوّل	حضورؐ اور خلفائے راشدین کا زمانہ
قرونِ اُولیٰ	اسلام کا ابتدائی دَور
قسیُّ القلب	سنگدل
قوائے عمل	عمل کی قوّت
قوی العمل	عمل میں مضبوط
ک	
کابُوس	ایک بیماری۔ جس میں آدمی نیند میں خوفزدہ ہوجاتا ہے
کاربرآری	کام نکالنا۔ مطلب نکالنا
کارزار	لڑائی۔ جنگ
کافور ہونا	اُڑ جانا۔ غائب ہوجانا
کتابِ مرقوم	لکھا ہوا دفتر۔ سربمہر کتاب
کجرَوی	ٹیڑھی چال چلنا۔ اُلٹے راستے پر چلنا

الفاظ	معانی
کَجی	ٹیڑھا پن
کَسبی	اپنی کوشش سے حاصل کیا گیا
کشا کش	کھینچا تانی۔ چھینا جھپٹی
کماحقّہٗ	جیسا اس کا حق ہے
کمیّات	کمیّت کی جمع۔ ناپی تولی گئی چیز کی مقدار
کوائف	کیفیت کی غلط جمع (صحیح کیفیات)
کوتاہ	کم۔ تھوڑا
کیفرِ کردار	کیے کی سزا

گ

الفاظ	معانی
گراں باری	بوجھل پن
گرویدہ	شیدا۔ دلدادہ۔ فریفتہ
گُنگ	گونگا۔ زبان سے نہ بول سکنے والا
گوہرِ یکدانہ	بیش قیمت موتی

ل

الفاظ	معانی
لذائذ	لذت کی جمع۔ ذائقے
لرزہ براندام	بدن کپکپانا
لسّان	خوش گفتار۔ چرب زبان
لغزِش	بھول چُوک۔ پھسلن

الفاظ	معانی
لنگ	لنگڑا۔لُولا
لیت و لعل	ٹال مٹول
لیل و نہار	رات اور دن

م

الفاظ	معانی
ماحصل۔ماحاصل	حاصل شُدہ۔نتیجہ۔پھل
مامَن	پناہ گاہ۔جائے امن
ماہیت	حقیقت۔کیفیت۔اصل
مبادیات	مبادی کی جمع۔بنیادی باتیں۔بنیاد
مُبتذَل	ذلیل۔حقیر۔رذیل
مَبداء	شروع ہونے کی جگہ۔سرچشمہ
مُتابعت	پیروی۔اطاعت۔فرمانبرداری
مُتدَیّن	دین دار۔دیانت دار
مُترَتَّب	ترتیب دیا گیا
مُترَتِّب	ترتیب دینے والا
متقدّمین	متقدم کی جمع۔اگلے زمانے کے
متمتّع	فائدہ اٹھانے والا
مُتمیّز	الگ ہونے والا۔جُدا
مُتنوّع	قسم قسم کا

الفاظ	معانی
مثنّٰی ۔ مثنّٰے	ثانی ۔ دوسرا ۔ نقل بمطابق اصل
مُجتَنَب	پرہیز کیا گیا
مُجتَنِب	پرہیز برتنے والا ۔ دُور رہنے والا
مُجمَل	مختصر
مَحاسِن	اچھائیاں ۔ خوبیاں
مُحتَرِز	احتراز کرنے والا ۔ پرہیز کرنے والا
مَحسُود	حسد کیا گیا
مُحصنات	محصنہ کی جمع ۔ نیک بیویاں ۔ پارسا عورتیں
مُحَقَّق	تحقیق کیا گیا ۔ جس کی تحقیق ہو سکے
محکم و مستحکم	پکا ۔ پائیدار ۔ مضبوط
محنتِ شاقہ	سخت محنت
مُحیّر العقول	عقلوں کو حیران کرنے والا
مُخاصمت	دُشمنی ۔ مخالفت
مُخدّرات	مُخدّر کی جمع ۔ پردے والیاں
مخزن	خزانہ ۔ گودام
مدارج	درجے ۔ رتبے
مُدافعانہ	دفاع کیلئے
مُدبَّر	تدبیر کیا گیا ۔ وہ دوا جس کی اصلاح اور دُرستی کی گئی ہو

الفاظ	معانی
مُدرَک	سمجھ میں آنے والی
مُدوّن	ترتیب دیا ہوا۔ جمع کیا ہوا
مذلّت	ذلت۔ رسوائی
مُرتَسم	نشان کیا گیا۔ مُہر لگایا گیا
مرقوم	رکھا گیا۔ لکھا ہوا
مَرُکَب	سواری۔ وہ شے جس پر سوار ہوں
مُزکّٰی	پاک کیا گیا
مَساعی	کوششیں
مَساکِن	مسکن کی جمع۔ مکانات
مُسخّر	تابع کیا گیا
مُستَقَر	ٹھہرنے کی جگہ۔ ٹھکانہ
مَستور	پوشیدہ۔ مخفی
مُستغرق	غرق شدہ۔ ڈوبا ہوا
مَسحُور	جس پر جادو کیا گیا ہو۔
مَسَخ شدہ	اچھی صورت سے بری صورت ہو جانا
مُسلَّمہ	مانی ہوئی باتیں۔ تسلیم شدہ امور
مَسلوب الحواس	جس کے حواس ٹھکانے نہ ہوں
مُشتے نمونہ از خروارے	ڈھیر میں سے مٹھی بھر۔ تھوڑے

الفاظ	معانی
مصدِّقین	تصدیق کرنے والے
مُضِرّت	ضرر۔نقصان
مُضمحل	ناتواں۔نڈھال۔رنجیدہ
مُضمَر	پوشیدہ
مُطلق العنان	بےلگام۔خود سر۔جس کی لگام چھوڑ دی گئی ہو
مطمحِ نظر	مرکزِ نگاہ۔مقصدِ اعلیٰ
مطیع	اطاعت کرنے والا
مَعاد	لوٹ کر جانے کی جگہ۔واپس جانے کا مقام
مُعاندانہ	دشمنوں کی طرح
مَعائب	عیوب۔برائیاں
مُعتد بہ	بہت سا معقول
مَعدوم	مٹایا گیا۔فنا کیا گیا۔ناپید
مَعدومِ محض	بالکل ناپید۔مطلق غائب
مغلوب العقل	جس کی عقل مغلوب ہو جائے
مغلوب الغضب	تیز مزاج۔جلد غصّے میں آنے والا
مَفقُود	غائب۔ناپید
مقتضیات	تقاضے۔خواہشیں۔ضروریات
مقدور	قوت۔طاقت۔حوصلہ

الفاظ	معانی
مُکتَفی	کافی۔پُورا
مَکشوف	کھولا گیا۔واضح۔ظاہر
مِن حیث الکُل	مکمل طور پر
مُنَغَّض	گدلا۔رنجیدہ۔مُکرّر
منقاد	فرماں بردار
مَنْقَبَتْ	تعریف۔توصیف۔ثناء
مُنہدِم	خراب۔برباد۔ویران
مُوالفت	پیار۔محبت
مُوانسَت	اُنس۔محبت
موہوم	وہمی۔قیاسی۔فرضی
مؤیّدِین	تائید کرنے والے
مُہتم بالشّان	شاندار۔عظیم الشان
مُہیّج	اٹھانے والا۔ہیجان خیز

﴿ن﴾

الفاظ	معانی
نابلد	انجان۔ناواقفیت۔ناآشنا
ناگزیر	ضروری۔لازم
ناگفتہ بہ	جس کا نہ کہنا بہتر ہو
نحیف الجُثّہ	جسمانی طور پر کمزور

الفاظ	معانی
نشست و برخاست	اٹھنا بیٹھنا
نصب العین	اصلی مقصد۔ دلی منشاء
نِصف النّہار	دوپہر کا وقت۔ دن کا نصف
نعائم	نعمتیں۔ آسائشیں
نقطۂ ماسکہ	وہ نقطہ جس پر شعاعیں انعکاس کے بعد آ کر جمع ہوں
نہج	طور طریقہ۔ ڈھنگ۔ قاعدہ
نیست و نابُود کرنا	بنیاد سے کھودنا۔ فنا کر دینا

و

الفاظ	معانی
وثوق	اعتماد۔ مضبوطی
وجہ تسمیہ	نام رکھنے کی وجہ
وُرود	وارد ہونا۔ پہنچنا
وساوس	وسوسہ کی جمع۔ اندیشے
وَقِس علیٰ ہٰذا	اور اسی پر قیاس کر لو
وقیع	وُقعت رکھنے والا، معزّز
وَہبی	قدرت کی طرف سے دیا گیا، بخشا ہوا

ہ

الفاظ	معانی
ہفوات	بیہودہ باتیں
ہیچ مَدانی	بے علمی۔ نادانی۔ بے ہنری

اشعار

اشعار	مفہوم
بہ بِبیں تفاوتِ راہ از کُجا ست تا بکُجا	راستے کا فرق دیکھئے کہاں سے کہاں تک ہے
بعد از خُدا بزرگ توئی قِصّہ مُختصر	المختصر خدا کے بعد آپ ہی معزّز ہیں
شاہ است حُسین، بادشاہ است حُسین دین است حُسین، دین پناہ است حُسین سر داد، نداد دست در دستِ یزید حقّا کہ بنائے لا اِلٰہ است حُسین	شاہ بھی حُسین ہیں، بادشاہ بھی حُسین ہیں دین بھی حُسین، دین کے رکھوالے بھی حُسین ہیں سر دے دیا مگر اپنا ہاتھ یزید کے ہاتھ میں نہیں دیا سچ تو یہ ہے کہ حُسین لا الٰہ کی بنیاد ہیں
بے سجادہ رنگین کن گرت پیرِ مغاں گوید کہ سالک بے خبر نبود زِ راہ و رسم منزلہا	اگر پیر تجھے کہہ دے تو، تُو اپنا مصلّٰی شراب سے تر کر لے کیونکہ وہ منزل کے راستے اور طریقے سے بے خبر نہیں ہوتا
اہلِ دنیا کافرانِ مطلق اند روز و شب در چق چق و در بق بق اند چِیست دنیا از خُدا غافل بُدن نے قمَاش و نقرہ و فرزند و زَن	دنیا کے طلبگار سراسر کافر ہیں دن رات خرافات میں الجھے ہوئے ہیں دنیا کیا ہے؟ خدا سے غافل ہونا نہ کہ کاروبار، چاندی، اولاد اور عورت

اشعار	مفہوم
این سعادت بزورِ بازو نیست تا نہ بخشد خُدائے بخشندہ	یہ سعادت اپنی محنت سے نہیں ملتی جب تک کہ خداوند تعالیٰ عطا نہ کرے
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے	یہ دنیا، خیال کے جال کا پھندہ ہے
خود کوزہ و خود کوزہ گر د خود ِگل کوزہ خود بر سرِ آں کوزہ خریدار بر آمد	وہ کوزہ بھی خود، کوزہ گر بھی خود اور کوزہ کی مٹی بھی خود اور اس کوزے کا خریدار بھی وہ خود ہی ہے
من آنم کہ من دانم	میں جو کچھ ہوں مجھے معلوم ہے
وائے گر در پسِ امروزِ بَود فردائے	افسوس ہے اگر آج کے بعد کل دیکھنا پڑے
عمر ہا در کعبہ و بُت خانہ می نالد حیات تازِ بزمِ عشق یک دانائے راز آید بروں	زندگی صدیوں کعبے اور بُتکدے میں فریاد کرتی ہے۔ تب جا کے بزمِ عشق سے کسی دانائے راز کا ظہور ہوتا ہے۔
دی شیخ با چراغ ہمی گشت گردِ شہر کہ زِ دِیو و دَد ملولم و انسانم آرزو ست گفتند یافت می نشود جستہ ایم ما گفت آنکہ یافت می نشود آنم آرزوست	ایک بزرگ چراغ لیے شہر میں گھوم رہا تھا۔ کہ میں شیطانوں اور درندوں سے تنگ آ چکا ہوں اور مجھے انسان کی آرزو ہے۔ کہا کہ ہم ڈھونڈ چکے ہیں پر نہیں ملتا۔ کہنے لگا کہ جو نہیں مل سکتا مجھے اُسی کی آرزو ہے۔

مُصنّفِ کی دیگر تصانیف

(1)

چراغِ راہ

(2)

حقیقتِ وَحدَتُ الوُجُود

چراغِ راہ

یہ کتاب خواجہ عبدالحکیم انصاریؒ کے سالانہ اجتماعات پر مُریدین کی تربیت اور راہنمائی کے لیے ارشاد فرمائے گئے خطبات کا مجموعہ ہے۔اس میں نئے سلسلہ کے قیام کے اغراض و مقاصد کے علاوہ راہِ سلوک کے پیچ وخم،نشیب وفراز،اس میں پیش آنے والی رکاوٹیں اور پیدا ہوجانے والی غلط فہمیاں بیان کی گئی ہیں۔صدیوں سے حل طلب روحانی گتھیوں کو سلجھانے کے لیے ایسے نادر نکات بیان کیے گئے ہیں کہ یہ گیارہ خطبات ملّتِ اسلامیہ کے لیے درسِ حیات اور سالکین کے لیے منارہ ہائے نور کی حیثیت رکھتے ہیں۔خصوصی مسائل جن پر روشنی ڈالی گئی ہے،مندرجہ ذیل ہیں:

☆ سلوک وتصوّف میں اپنے ذاتی تجربوں اور تحقیق کا بیان
☆ مُرشد کی تلاش کے دس سالہ دَور میں کیسے کیسے فقیر ملے اور مُرشد سے ملاقات کا حال
☆ ہمارے زوال میں اُمراء،علماء اور صوفیاء کا کردار
☆ علماءِ ظاہر اور صوفیاء کے اصلاح کے طریقوں میں فرق
☆ قوم میں تصوّفِ خفتہ اور تصوّفِ بیدار کے اثرات
☆ تصوّف کی اہمیت اور انسان کی زندگی پر اس کے اثرات
☆ یوگا، ہپناٹائزم اور مسمریزم کی حقیقت اور ان کے مقابلہ میں اسلامی روحانیت کی برتری اور فضیلت
☆ کرامات کی طاقت کس طرح حاصل ہوتی ہے اور کشف کیونکر ہوتا ہے؟
☆ سلسلۂ عالیہ توحیدیہ کے قیام سے فقیری کی راہ کیونکر آسان ہوئی؟

حقیقتِ وَحدَتُ الوُجُود

یہ کتاب وَحدَتُ الوُجُود کے موضوع پر ایک مختصر مگر نہایت مدلّل اور اہم دستاویز ہے۔ خواجہ عبدالحکیم انصاریؒ کو دَورانِ سلوک جو مشاہدات ہوئے، اُن کو عام فہم دلائل کی روشنی میں نہایت ہی آسان زبان میں بیان کر دیا ہے تاکہ متلاشیانِ حق غلط راہوں میں پڑ کر گمراہ نہ ہو جائیں۔ اس کتاب میں زیرِ بحث آنے والے خاص خاص مضوعات مندرجہ ذیل ہیں:

☆ انسان کی بقا اور ترقی کے لیے مذہب کیوں ناگزیر ہے۔
☆ روحانی عوالم اور روح کے سفر کا حال، ھو کی خصوصی تشریح۔
☆ سلوک کے دَوران کون سے مقام پر وحدت الوجود کی کیفیت محسوس و مدرک ہوتی ہے۔
☆ وہ بُنیادی سوال جس نے نظریہ وحدت الوجود کو جنم دیا اور اس ضمن میں ہندو مفکرین، مادہ پرست دانشوروں اور فلاسفروں کی رائے۔
☆ حضرت ابنِ عربیؒ کے نظریہ وحدت الوجود اور حضرت مجدّد الفِ ثانیؒ کے نظریہ وحدت الشہود میں فرق۔
☆ روحانی سلوک کے دَوران بزرگانِ عظام کو ہو جانے والی غلط فہمیاں۔
☆ حضرت حسین ابن منصور حلاجؒ کے دعویٰ انا الحق کی توجیہہ۔
☆ وحدت الوجود کی قائل جماعت کے نظریات اور قرآنی احکامات کی روشنی میں ان کا ردّ۔

ان تمام امور پر محققانہ بحث وتنقید کے بعد حقیقت طشت از بام کر دی گئی ہے۔ اس موضوع سے دلچسپی رکھنے والوں اور الجھنوں میں گرفتار طالبانِ حقیقت کے لیے یہ کتاب ایک نعمت سے کم نہیں۔

خواجہ صاحب سے میری ملاقات ایک عجیب انداز میں ہوئی! ہم ریلوے کلب کے ''سوئمنگ پول'' میں نہا رہے تھے کہ ایک سرخ و سفید گول مٹول سے نوجوان تیرتے ہوئے میری طرف آئے اور مجھ سے انگریزی میں کہا ''کیا آپ ایسے فرد سے ملنا چاہیں گے جو خدا کو بہت قریب سے جانتا ہے اور جس کے پاس روح کی غذا کا ایسا فریش سٹاک ہے جو اس سے پہلے نہ کسی نے دیکھا، نہ چکھا نہ اپنے وجود کو اس سے تقویت عطا کی''۔۔۔ میں نے کہا ''مجھے ان کا پتہ دیجیے'' کہنے لگے ''میں ساتھ لے چلوں گا'' میں نے کہا ''آپ تو نہا کے، کپڑے بدل کے، چائے پی کے چلیں گے۔ میں ابھی جاتا ہوں''۔

تالاب سے نکل کر میں سیدھا ماڈل ٹاؤن پہنچا اور خواجہ عبدالحکیم انصاری صاحب کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ وہاں کچھ لوگ ان کے گرد گھیرا ڈالے پرانی وضع کی کرسیوں، دو مونڈھوں اور ایک چارپائی پر بیٹھے تھے۔ میں بھی سلام کر کے بیٹھ گیا۔ خواجہ صاحب نے چونک کر پوچھا ''کون؟''۔ میں نے انہیں اپنا نام بتایا اور اُنہوں نے ریڈیو کے مشاہیر کی باتیں شروع کر دیں۔ میرے باس ذوالفقار بخاری سے لے کر بندو خان سارنگی نواز اور جوش، جگر، سیماب، نظام کے بے شمار قصے بیان کئے۔ میرا خوف دور ہو گیا اور میں ہفتے میں دو تین بار ان کی خدمت میں حاضر ہونے لگا، اور پھر یہ سلسلہ ان کی وفات تک اسی طرح سے چلتا رہا۔

دورِ جدید کے صوفیوں میں خواجہ صاحب کا مقام اس اعتبار سے بہت بلند ہے کہ اُنہوں نے تصوف کے ڈسپلن کو عملی صورت میں پیش کر کے ان آرزومندوں کیلئے بڑی آسانیاں پیدا کر دی ہیں جو باطن کے سفر کے راہرو بننے کے خواہشمند ہیں۔ ان کے تصوف کے کورس کا سلیبس بہت سادہ، مختصر، قابلِ عمل اور آسان ہے۔ اسے آج کے مصروف دور میں سہولت کے ساتھ اختیار کیا جا سکتا ہے اور ان کے عمل کا فوری رنگ نظر کے سامنے دیکھا جا سکتا ہے۔ اس میں محنت کی اس قدر ضرورت نہیں پھر جب ذاتِ بحت سے ان کا گہرا ربط ہوا تو وہ نظم و ضبط، تادیب و ترتیب اور خود احتسابی پر اور بھی زور دینے لگے۔ وہ تصوف کے میدان میں صرف عمل کے قائل ہیں کہ ان کے خیال میں راستے کی باتیں کرتے رہنے سے راستہ طے نہیں ہوتا۔

نہ پوچھ ان خرقہ پوشوں کی ، ارادت ہو تو دیکھ ان کو
ید بیضا لئے بیٹھے ہیں اپنی آستینوں میں

اشفاق احمد
۱۲۱۔سی، ماڈل ٹاؤن لاہور

سلسلۂ عالیہ توحیدیہ
مرکز تعمیر ملت جی ٹی روڈ گوجرانوالہ